تحقیقی مقالہ برائے (پی۔ ایچ۔ ڈی اُردو)

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نو آبادیاتی اثرات کا مطالعہ: ماحولیاتی ادبی تنقید کی روشنی میں

(Colonial effects in the poetry of Ismail Mirthi: A study in the light of Ecocriticism)

مقالہ نگار
نوشین قمر
پی۔ ایچ۔ ڈی اُردو
61-FLL/PHDURDU/S-18

نگران
ڈاکٹر شیراز فضل داد
اسسٹنٹ پروفیسر

CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

شعبہ اردو
کلیہ زبان وادب
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

Asir

PhD
891.916
۱۹۱۰

Accession No TH25582

اردو شاعری نوآبادیاتی عہد کے شعرا کا
ماحولیاتی تنقید

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **NAUSHEEN QAMAR**

Title of the Thesis: اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نوآبادیاتی اثرات کا مطالعہ: ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں

Registration No: **61-FLL/PHDURD/S18**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Doctor of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu, IIU
Islamabad

External Examiner 1:

Dr. Fehmida Tabassum
Associate Professor
HOD, Federal Urdu University
Islamabad

External Examiner 2:

Dr. Fozia Aslam
Associate Professor
Department of Urdu, NUML
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Arshad Mehmood
(Arshad Meraj)
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

Supervisor:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department of Urdu, I

Rupees 6 ۶ روپیہ

بیان حلفی

فدویہ نوشین قمر، رجسٹریشن نمبر **61-FLL/PHDURDU/S-18** نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نوآبادیاتی اثرات کا مطالعہ: ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں" نگران ڈاکٹر شیراز فضل داد کے زیرِ سرپرستی مکمل کیا ہے۔ جس میں کسی قسم کے چربہ سازی اور نقل نہیں کی گئی ہے۔ یہ تحقیقی کام خالصتاً فدوی کی ذاتی کاوش، محنت اور تحقیق پر مبنی ہے۔ جس میں کسی قسم کے ٹیسٹ کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہے۔

آپ کے تابع فرمان

نوشین قمر

رجسٹریشن نمبر **61-FLL/PHDURDU/S-18**

ATTESTED
TARIQ IQBAL MARE
Advocate High Court
نوٹری پبلک
Notary
Public

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نوشین قمر رجسٹریشن نمبر: 61-FLL/PHDURDU/S-18 نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان " اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں نوآبادیاتی اثرات کا مطالعہ : ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں "برائے پی۔ایچ۔ڈی اردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا ہے اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اردو)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

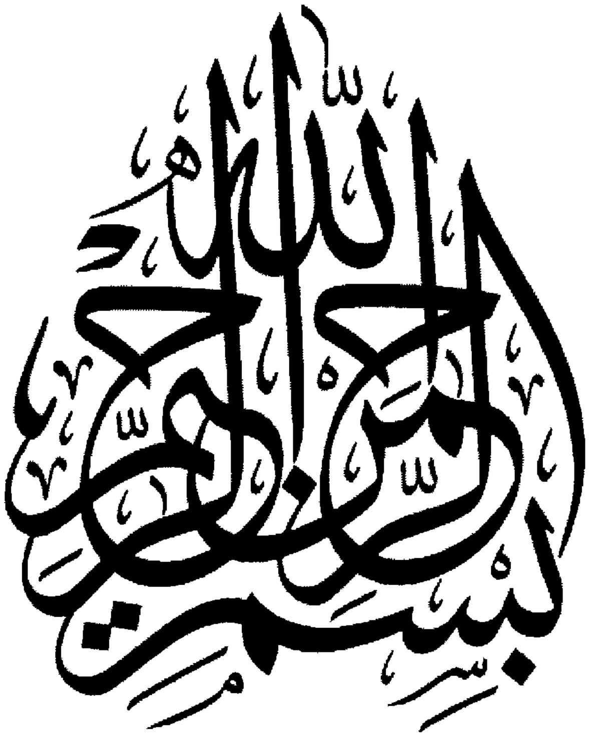
بسم الله الرحمن الرحيم

ابواب بندی

ابواب **صفحہ نمبر**

پیش لفظ

باب اول

ماحولیاتی ادبی تنقید: روایت اور عصری تناظر ۱۴-۵۶

☆ فطرت نگاری/ منظر نگاری/ نیچرل ازم

☆ ماحولیاتی ادبی تنقید: تعریف و وضاحت

☆ مغربی ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید آغاز و ارتقا: ایک جائزہ

☆ اردو ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید: ایک جائزہ

☆ اسماعیل میرٹھی کے کلام پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ

☆ طریقہ تحقیق/فریم ورک

باب دوم

اسماعیل میرٹھی کے فکر و فن پر نو آبادیاتی اثرات: ایک جائزہ ۵۸-۹۱

☆ نو آبادیات: مختصر تعارف و پس منظر

☆ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور برطانویوں کی آمد: مختصر جائزہ

☆ انجمن پنجاب کا قیام: مقاصد اور مشاعرے

☆ اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نو آبادیاتی اثرات کا جائزہ

باب سوم

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کا دیگر حیوانی مخلوقات سے تعلق کا مطالعہ ۹۳-۱۲۳

کیڑا۔۔۔ایک جگنو اور بچہ کی باتیں۔۔۔مور اور کلنگ۔۔۔چڑیا کے بچے

کوا۔۔۔اسلم کی بلی۔۔۔ہمارا کتا ٹیپو۔۔۔اونٹ۔۔۔شیر۔۔۔ہماری گائے

چھوٹی چیونٹی---دو مکھیاں--- عجیب چڑیا---ایک گھوڑا اور اس کا سایہ
ایک کتا اور اس کی پرچھائیں---ایک گدھا شیر بنا--- کچھوا اور خرگوش

باب چہارم

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور ثقافت کے درمیان تعلق کا تصور ۱۲۵-۱۵۷
بچہ اور ماں---ماں اور بچہ---ماں کی مامتا--- سچ کہو---ایک لڑکا اور بیر
بچپن میں خدا کی یاد--- میرا خدا میرے ساتھ ہے--- غصہ کا ضبط---
ادب--- چغلخوری---عالم شہود--- مراسم بیہودہ--- شکر نعمت---
طواف بیت اللہ--- مقام محرم--- سلام---اختلاف رائے---ایک
گنوار اور قوس قزح--- پن چکی---دال کی فریاد---دال چپاتی---
کاشتکاری---انسان---انسان کی خام خیالی

باب پنجم

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور عالم فطرت کے درمیان تعلق کا تجزیہ ۱۵۹-۱۹۸
خدا کی صنعت--- مثنوی آبِ زُلال---بارش کا پہلا قطرہ--- برسات
ساون کی جھڑی--- مثنوی بادِ مراد---ہوا چلی--- مناقشہ ہوا و آفتاب
شفق---رات---تاروں بھری رات--- صبح کی آمد---اب آرام کرو
گرمی کا موسم---جاڑا اور گرمی---خشک سالی--- حمد---کوہ ہمالہ
ابر بادل ہے اور سحاب گھٹا---نیچر انسان کی محکوم ہے

ماحصل ۲۰۰-۲۱۴
ماخذات ۲۱۶-۲۲۴

پیش لفظ

بیسویں صدی میں جہاں فکری سطح پر انقلاب برپا ہوا وہیں دنیائے ادب میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عالمی دنیا میں بہت سی تحریکوں نے جنم لیا، جنھوں نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا۔ مغرب سے اٹھنے والی ان تحریکوں نے اردو ادب پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ جدیدیت، ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، مابعد جدیدیت، نوآبادیات، مابعد نوآبادیات، تانیثیت، تاریخیت و نوتاریخیت وغیرہ جیسی کئی تحریکیں سامنے آئیں۔ انھی میں سے ایک ماحولیاتی ادبی تنقید بھی ہے۔ جسے انگریزی میں Ecocriticism کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نئے تنقیدی نظریے نے ادب میں ایک نیا در وا کیا ہے۔ ماحولیاتی تنقید تحفظ ماحول کی خواہاں ہے اور فطرت و ماحول کے انسان کے ساتھ گہرے تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔ دیگر نظریات کی طرح اس کا بیان بھی مغربی ادب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

عہد حاضر میں جب کہ دنیا نت نئی تبدیلیوں سے گزر رہی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں نئے تجربات ہو رہے ہیں، جدید مغربی ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید مزید کئی شاخوں میں تقسیم ہو چکی ہے، ادب کے نئے نئے مطالعات سامنے آ رہے ہیں۔ اردو ادب میں اس تحریک کے حوالے سے دیکھا جائے تو پچھلے کچھ سالوں میں ایک دو کتب اور گنتی کے چند مقالات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اردو ادب کا یہ گوشہ ابھی اس حوالے سے تشنہ ہے۔ ادبی تخلیقات میں بھی اس حوالے سے کوئی باقاعدہ تحقیق نہ ملنے کے برابر ہے۔ ادب کے فطری مطالعات پر تو کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جس میں فطرت کے مناظر کی ادب میں نشاندہی کی گئی ہے لیکن اس بارے میں بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ فطرت نگاری کا پہلو کن محرکات کا نتیجہ ہے۔ اس نئے تنقیدی نظریے کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کام ابھی اردو میں نیا ہے جس میں مغربی تھیوری کے ماحولیاتی ادبی تنقید کے فریم ورک کا کسی تحریر پر اطلاق کیا گیا ہو۔ زیرِ نظر تحقیق میں اسماعیل میرٹھی جنھیں اردو ادب میں جدید نظم کے بانیوں اور بحیثیت ایک فطرت نگار کے جانا جاتا ہے کی شاعری میں نوآبادیاتی اثرات کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ ان کے کلام سے اردو شاعری کا انتخاب کیا گیا ہے کیوں کہ ان کی شاعری میں فارسی کا بھی ایک حصہ موجود ہے جسے شامل تحقیق نہیں کیا گیا۔ مجوزہ تحقیق کے لیے ان کی کلیات کے ۱۹۳۹ء میں شائع ہونے والے اسلم سیفی کے نسخے کو بنیادی متن کے طور پر مد نظر رکھا گیا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کا شمار جدید اردو ادب کے شعرا میں ہوتا ہے۔ جنھیں بیک وقت کئی حیثیتوں سے جانا جاتا ہے۔ انھیں ایک ہمہ جہت شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جہاں اردو شاعری میں انجمن پنجاب، جدید نظم یا اردو کے جدید شعرا کا

نام لیا جاتا ہے وہیں اسماعیل میرٹھی کا نام بھی شامل ہے۔ ۱۹۱۰ء سے اب تک اسماعیل میرٹھی کی کلیات، ان کے حالات زندگی اور شاعری پر مختلف حوالوں سے تحقیقی و تنقیدی تجزیے و تبصرے ہو چکے ہیں۔ (ان کی تفصیل باب اول میں " اسماعیل میرٹھی کے کلام پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ" کے عنوان سے موجود ہے۔)

اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے مطالعے کے لیے ان مثالوں کو پیش کیا گیا ہے جو نو آبادیاتی عہد، انسانی اور ماحولیاتی دنیا کے تعلق کو بیان کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے اور اسے نقصان پہنچانے میں کس طرح سامراجی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں ان کی بھی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تعلق کو ابتدائی طور پر بیان کرنے اور سمجھنے کے لیے ماحولیاتی ادبی تنقید کے فریم ورک کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس حوالے سے بھی اسماعیل میرٹھی کی اردو شاعری بنیادی اہمیت کی حامل ہے جس پر اس حوالے سے کوئی باقاعدہ تحقیق سامنے نہیں آسکی ہے جس میں ان کی شاعری کا کسی تھیوری کے تحت مطالعہ کیا گیا ہو۔ راقمہ نے اس حوالے سے ناصر عباس نیر کے ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق نظریات کا انتخاب کیا ہے نیز اس مطالعے میں آرنی نائس کے تنقیدی نظریات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی وضاحت کے لیے راقمہ نے پہلے اپنے خیالات کو بیان کرنا مناسب کیا ہے تاکہ ان کی تفہیم میں دیگر ناقدین / مصنفین کی بیان کردہ تشریحات گڈمڈ ہو کر خیالات کو منتشر کرنے یا ایک جیسا پیش کرنے میں مناسبت اختیار نہ کر جائیں ان کی تشریح و تفہیم کے بعد دیگر آرا کو پڑھنا اور اس میں سے متعلقہ کا حوالہ دینا مناسب خیال کیا ہے۔ اسلم سیفی کی کتاب " حیات اسماعیل ۱۹۳۹ء" اور سیفی پریمی کی کتاب " اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات ۱۹۷۶ء" کو ہی بعد میں اسماعیل میرٹھی پر لکھی جانے والی کتب، تحقیق، یا مقالہ جات میں بطور حوالے کے استعمال کیا گیا ہے۔ نہایت کم ہی ایسی مثالیں دیکھنے کو ملی ہیں جس میں تشریحات میں بھی کوئی ایک آدھ اضافہ مصنف کی جانب سے کیا گیا ہو۔ راقمہ کی جانب سے شاعری کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے متعلق ان آرا کو شامل کیا گیا ہے جس میں کوئی نئی چیز یا خیال پیش کیا گیا ہے۔ نیز جس میں اسماعیل میرٹھی کی ادب میں حیثیت کو بچوں کے شاعر سے بڑھ کر مانا گیا ہے۔ ذیل میں مقالے کے ابواب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب "ماحولیاتی ادبی تنقید: روایت اور عصری تناظر" کے عنوان سے ہے۔ جس میں ذیلی موضوعات کو لیتے ہوئے ان کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ "فطرت نگاری / منظر نگاری / نیچرل ازم" کی ذیل میں ان کی تعریف اور مختصر وضاحت پیش کی گئی ہے تاکہ ان میں اور ماحولیاتی ادبی تنقید میں فرق کو واضح کیا جا سکے۔ راقمہ کے نزدیک بہت سے ناقدین نے اس متعلق لکھے جانے والے مقالات میں ماحولیاتی ادبی تنقید کو

فطرت نگاری کی ہی ایک نئی توسیع کے طور پر پیش کیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس نظریے کی تفہیم ان دیگر نظریات سے کہیں مختلف ہے۔ "ماحولیاتی ادبی تنقید: تعریف و وضاحت" کی ذیل میں اس تنقیدی نظریے کی تعریف، اس اصطلاح کے استعمال کی ابتدا اور ادب میں اس کی آمد و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "مغربی ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید آغاز و ارتقا: ایک جائزہ" کی ذیل میں مغربی ادب میں اس نظریے کی ابتدا سے لے کر اس کی بنیاد رکھنے والوں، اسے ادب کا حصہ بنانے والوں، اس کے حق میں بنائی جانے والی تنظیموں اور اس کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے ایک مختصر جائزہ سامنے آتا ہے کہ جس سے ماحولیاتی ادبی تنقید کو اس کی ابتدا سے لے کر ادب میں اس کے اطلاق تک سمجھا جا سکتا ہے۔ راقمہ کے نزدیک اس ضمن میں ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کا مقالہ " ماحولیاتی تنقید : پس منظر، آغاز اور امتیازات " بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

" اردو ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید: ایک جائزہ" میں اردو ادب میں اس تنقیدی نظریے کی ابتدا اور اس موضوع سے متعلق لکھے جانے والے چند مقالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ایک مختصر تصویر سامنے آتی ہے کہ آخر اردو ادب میں اس نظریے کو کس طرح لیا گیا ہے اور اس حوالے سے کیسے مطالعات سامنے آئے ہیں۔ اس نظریے پر لکھنے والوں نے اگرچہ اس نئے تنقیدی نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن جس طرح ادب میں اس موجودگی کو تلاشنا ہے اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر اورنگزیب نیازی، ڈاکٹر مولا بخش، شیخ عقیل احمد اور ڈاکٹر قاسم یعقوب کے لکھے گئے مقالات میں کچھ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں، جنھیں ابتدائی نمونے کہا جا سکتا ہے۔ "اسماعیل میرٹھی کے کلام پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ" اس عنوان کی ذیل میں اس تحقیقی خلا کی نشان دہی اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر سابقہ تحقیقات کے جائزے سے کی گئی ہے کہ ان کے کلام پر کیا کیا کام ہو چکا ہے اور زیر نظر تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ "طریقہ تحقیق و فریم ورک" یہ عنوان اس تحقیق کی بنیاد یعنی اس تنقیدی فریم ورک کا تعارف اور سوالات پیش کرتا ہے کہ جس کے ذریعے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کو پرکھا گیا ہے اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اس عنوان کی ذیل میں راقم نے جہاں ناصر عباس نیر اور آرنی نائس کے ماحولیاتی تنقید سے متعلق نظریات کو بیان کیا ہے وہیں ڈاکٹر نجیبہ عارف کے ایک مضمون سے چند نکات بھی پیش کیے ہیں۔ راقمہ کے نزدیک یہ نکات اردو میں ماحولیاتی ادبی مطالعات میں متن کے تجزیے کے طور پر بطور فریم ورک کے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ مجموعی حوالے سے باب اول ایک تعارفی باب ہے جس میں ماحولیاتی ادبی تنقید کو عصری تناظر میں دیکھنے کی ابتدائی کوشش کی گئی ہے نیز اسماعیل میرٹھی پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ اور طریقہ تحقیق بھی شامل ہیں۔

دوسرا باب "اسماعیل میرٹھی کے فکر و فن پر نوآبادیاتی اثرات: ایک جائزہ" کے عنوان سے ہے اس کے ذیلی عنوانات میں" نوآبادیات: مختصر تعارف و پس منظر، ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور برطانویوں کی آمد: مختصر جائزہ، انجمن پنجاب کا قیام: مقاصد اور مشاعرے اور اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کا جائز" شامل ہیں۔ ابتدا میں اسماعیل میرٹھی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے جس میں ان واقعات کو بیان کرنا ضروری سمجھا گیا ہے جو ان کی شاعری کے مطالعے میں معاون ہوں اور مزید تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے۔ راقمہ کے نزدیک اس حوالے سے جتنی کتب لکھی گئی ہیں ان میں اسلم سیفی اور سیفی پریمی کی کتب کے حوالے ہی موجود ہیں لہذا طویل تعارف اور تفاصیل سے گریز کرتے ہوئے مجوزہ تحقیق کی ضرورت کے مطابق ہی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نوآبادیات کا تعارف و تعریف بھی ضرورت کے مطابق کی گئی ہے اور بے جا تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر کی حال ہی میں آنے والی کتاب جدیدت اور نو آبادیات بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں نئی تفہیم کے ساتھ نوآبادیاتی عہد اور اس کی تحت ہونے والی تبدیلیوں کو مثالوں اور دلیلوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انجمن پنجاب کا جائزہ پیش کرنے کے لیے پہلے اس پس منظر کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے جس کے تحت یہ ادبی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور جن کی معاونت سے یہ ادارے وجود میں آرہے تھے۔ اس کے لیے برطانیوں کی آمد اور پھر ایسٹ انڈیا کی کمپنی کے قیام کے حوالے سے ان سب پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے اور آخر میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے ان مثالوں کو پیش کیا گیا ہے جو نوآبادیاتی اثرات لیے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اس دور کے اس طبقے کی سوچ کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ایک بدیسی قوم کی حکمرانی میں سانسیں لے رہا تھا۔

تیسرا باب "اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کا حیوانی مخلوقات سے تعلق کا مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ابتدائی صفحات میں انسان کی تہذیب کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے قدیم انسان کا حیوانی دنیا اور عالم فطرت سے تعلق اور ان پر انحصار کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ اس تعلق کا ایک پس منظر سامنے آسکے۔ علاوہ ازیں شعری مثالوں کے ذریعے اس تعلق کو بیان کیا گیا ہے جس کے لیے ماحولیاتی ادبی تنقید کے سوالوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم" اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور ثقافت کے درمیان تعلق کا تصور" پر مشتمل ہے۔ اس باب کی شعری مثالیں زیادہ تعداد میں نہیں ملتی ہیں لیکن جو مثالیں موجود ہیں ان میں انسان کے ثقافتی تصور کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ماحولیاتی ثقافت کی بھی مختصر وضاحت اس ذیل میں پیش کی گئی ہے جسے حال ہی میں چند مضامین کی صورت میں راقمہ نے دیکھا ہے۔ علاوہ ازیں ماحولیاتی تنقید جس ثقافتی و سماجی تصور کے ساتھ ایک اندرونی رشتے کی بات کرتی ہے اسے مجموعی حوالے سے چند مثالوں کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ باب پنجم "اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور عالم

فطرت کے درمیان تعلق کا مطالعہ" کے عنوان سے ہے اس میں بھی ابتدائی صفحات میں انسان کا ماحول سے تعلق کا مختصر پس منظر اور ماحولیاتی تنقید کے نظریات کے حوالے سے مختصر وضاحت دی گئی ہے۔ جس کے بعد شعری مثالوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں ماحولیاتی نظریے کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ان عناصر کی انسانی زندگی میں اہمیت اور کردار کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ باب انسان اور اس کے ماحولیاتی نظام کے اندرونی تعلق کو مثالوں کی صورت میں واضح کرتا ہے جس کے بغیر انسان کا وجود بالکل بے معنی ہے۔

آخر میں" ماحصل" کے عنوان سے مقالے کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان سوالات کو جو تحقیقی سوالات اور تنقیدی فریم ورک کی صورت میں اٹھائے گئے تھے ان کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں راقمہ نے ان تنقیدی آرا کو بھی پیش کیا ہے جس میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کو بچوں کی شاعری سے ہٹ کر دیکھا گیا ہے اور ان کی شاعری کی نئی جہات کو مانا اور ادبی سطح پر قبول کیا گیا ہے۔ جن میں سے کچھ پر اتفاق اور چند سے انکار بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی راقمہ نے اپنی رائے کو بھی شامل کیا ہے جو دوران تحقیق پڑھی جانے والی کتب اور اس ماحولیاتی و نوآبادیاتی تجزیے کے بعد سامنے آئی ہے۔

زیر نظر مقالے میں راقمہ نے بے جا طوالت اور غیر ضروری وضاحتوں سے گریز کیا ہے۔ جہاں جس باب میں عنوان کے تحت جس قدر وضاحت کی ضرورت تھی اسی کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دو ابواب کے بعد تیسرے اور چوتھے باب میں بنیادی متن کے حوالوں علاوہ چند مختصر حوالے ہی ملتے ہیں۔ آخری باب میں بھی جن حوالوں کو پیش کیا گیا ہے ان کا مقصد اپنے نظریات کی وضاحت پیش کرنا مقصود تھا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ ابواب میں بنیادی متن کے طور پر انھی شعری مثالوں کو بطور حوالے کے پیش کیا جائے جن کا تعلق مجوزہ تحقیق کے ساتھ ہے۔ باب دوم میں پیش کی گئی شعری مثالوں کو جوں کا توں ہی پیش کیا گیا ہے جب کہ باب سوم سے باب پنجم تک کی شعری مثالوں میں جہاں طویل نظموں کو درج کیا گیا ہے وہیں "/" کی علامت لگا کر ایک ہی سطر میں دو مصرعوں کو لکھا گیا ہے تا کہ مذکورہ نظم مکمل پیش کی جا سکے۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے نوآبادیاتی و ماحولیاتی مطالعے سے ان کے کلام کی ایک الگ ہی وضاحت دیکھنے کو ملی ہے چوں کہ ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریات کی اردو میں ابھی مزید وضاحتیں، ادبی تحریروں پر اس کا اطلاق اس طرح سامنے نہیں آیا ہے کہ راقمہ کو کوئی نمونہ مل سکتا تو یقیناً کوئی نہ کوئی کمی کوتاہی رہ گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ ابتدائی تحقیقی کاوش دیگر ماحولیاتی مطالعات میں معاون ثابت ہو گی۔

اس مقالے کی تکمیل میں ابتدائی سطح پر مواد کی فراہمی میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اردو ادب میں اس نئے تنقیدی نظریے کے متعلق گنتی کی ہی چند چیزیں موجود تھیں۔ ساتھ ہی کچھ صحت کے مسائل نے بھی کتابی دنیا سے دور رکھا۔ ۲۰۲۰ء میں وہ دن بھی آگیا کہ شادی ہو گئی اور ایک لمبا وقفہ آگیا۔ یہ شاید زندگی کا سب سے مشکل وقت تھا جس میں کچھ اونچ نیچ کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی کے اس موڑ پر اگر گھر والوں، شعبہ اردو کے اساتذہ اور دوستوں کا ساتھ نہ ہوتا تو میں ایک قدم بھی نہ اٹھا پاتی۔ ام البنین میری بھتیجی جو ابھی چودہ ماہ کی ہے لیکن جانتی ہے کہ لیپ ٹاپ کے کس بٹن سے پھپھو کے مقالے کے صفحات کو بڑھایا اور گھٹایا جا سکتا ہے۔ سو کئی بار دھچکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب تک انسان خود کچھ کرنے کی نہ ٹھان لے پھر چاہے زمانہ اسے کتنا ہی سبق نہ دے لے وہ کچھ نہیں کر پاتا۔ سو مجھے ہی خود کو ہمت کی تھپکی دے کر پھر سے کھڑا کرنا تھا سو ٹھان لیا کہ اب بس کر گزرو سو کر ڈالا۔

یہ مقالہ آپ کے سامنے موجود ہے جس کی تکمیل میں میرے گھر والوں، اساتذہ اور دوستوں کا بھرپور ساتھ شامل ہے۔ میری نگران ڈاکٹر شیراز فضل داد کا شکریہ جن کی تھپکیاں مجھے مقالہ لکھنے پر اکساتی رہیں۔ ہر اس رکاوٹ کا شکریہ کہ جن کے ہونے سے میں دو قدم آگے بڑھتی رہی۔

نوشین قمر
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد
۲۰جون۲۰۲۱ء

(باب اول)

ماحولیاتی ادبی تنقید روایت اور عصری تناظر

ماحولیاتی ادبی تنقید: روایت اور عصری تناظر

ادب میں تھیوریز کے بڑھتے ہوئے رجحان نے جہاں متن کی قرات اور اس کے معنی و مفہوم کو بدلا ہے، وہیں صدیوں پرانے متون بھی ان نئے نظریات کی روشنی میں دوبارہ زندہ ہو رہے ہیں۔ متن کو ایک نئے انداز سے دیکھنے اور انھیں مختلف نظریات کی روشنی میں پرکھنے سے ادب کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اردو ادب میں تھیوری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا استعمال بیسویں صدی میں ساٹھ کی دہائی کے بعد ہوا۔ جب مغربی ادب سے ان نئی تھیوریز کو مستعار لیتے ہوئے اردو ناقدین نے انھیں سمجھا اور پھر ادب کا حصہ بنانا شروع کیا جس سے روایتی تنقید کے ساتھ ساتھ تھیوریز کے مباحث نے بھی جنم لیا۔ تھیوری ادب کو سمجھنے کا ایک نظریہ ہے۔ یہ نظریات متن کو سمجھنے میں ایک طریقہ کار فراہم کرتے ہیں۔ ان کے طریقہ کار میں ہر نظریے کی ذیل میں کچھ فریم ورکس بھی بنائے گئے ہیں۔ جن کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ متن کو اس مخصوص فریم ورک کے تحت پرکھنے سے اسی متعلقہ نکتے تک باآسانی پہنچا جا سکتا ہے جس کی ہمیں تلاش ہو۔ جیسے ان نظریات میں جدیدیت، مابعد جدیدیت، رد تشکیلیت، ساختیات، پس ساختیات، تانیثیت، نشانیات، نوآبادیات، مابعد نوآبادیات، قاری اساس تھیوری وغیرہ۔ یہ نظریات نئے تنقیدی زاویے ہیں جن سے ادب کو نئے اطراف سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

انھی نظریات میں سے ایک ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) بھی ہے۔ یوں تو ادبی تھیوریز نے اردو ادب میں ساٹھ کی دہائی کے بعد قدم رکھا اور کچھ ہی عرصے میں تراجم کے ذریعے اردو میں اپنا مقام بنا لیا اور ان نظریات کا اطلاق بھی کیا جانے لگا۔ اس حوالے سے اس نئے تنقیدی نظریے سے متعلق دیکھا جائے تو ہمیں مغربی ادب میں اس کا باقاعدہ آغاز اسی کی دہائی کے بعد دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تحریک کو جسے ماحولیاتی ادبی تنقید کا نام دیا گیا مغربی ادب میں جگہ بنانے اور خود کو منوانے میں کافی وقت لگا۔ اس کے نظریات کا پرچار کرنے والے نوے کی دہائی کے بعد ہی باقاعدہ طور پر اس کو سمجھانے اور ادب میں برتنے کے قابل ہو سکے۔ یہ نیا نظریہ ادب ایک نئے مطالعے کو سامنے لے کر آیا اور ادبی تحریروں میں اسے ایک انوکھے انداز میں برتا گیا۔ اردو ادب کے بعض ناقدین کے نزدیک اسے فطرت نگاری کی ہی طرح کی ایک تحریک سمجھا جاتا ہے جس میں محض مناظر فطرت اور ماحول کا بیان شامل ہے۔ اس ادبی نظریے پر بات کرنے سے پہلے ان تمام مفاہیم پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جو اس ادبی نظریے سے پہلے رائج تھے اور جنھیں کہیں فطرت نگاری، منظر نگاری، تو کہیں

نیچرل ازم کے نام سے استعمال کیا جاتا رہا اور ان کی مختلف تعریفیں سامنے آئیں۔ ذیل میں چند کا ذکر کیا جانا ضروری ہے تاکہ ان میں اور ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریے میں فرق کو سمجھا جا سکے۔

فطرت نگاری/ منظر نگاری/نیچرل ازم:

فطرت نگاری اور منظر نگاری کے حوالے سے دو مقالے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جن میں تفصیل سے ان اصطلاحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن میں ایک مقالہ جو کتابی صورت میں اردو شاعری میں منظر نگاری کے نام سے سلام سندیلوی صاحب کا ہے اور دوسرا مقالہ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری کے نام سے محترمہ ناہید قاسمی صاحبہ کا ہے۔ راقمہ نے لغوی و اصطلاحی معنی کی بجائے ان کے مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرانے متون کے حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدا میں فطرت کو قدرت کے معنوں میں لیا جاتا تھا اس کا بیان ہمیں سرسید کے ہاں بھی ملتا ہے۔ خدا، زمین و آسماں کو بھی فطرت میں شمار کیا جاتا تھا تو کہیں اسے انسانی فطرت یعنی جبلت سے بھی منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ خارجی و داخلی حوالوں سے بھی فطرت کی تعریف کی گئی ایک وہ جو سامنے مظاہر قدرت کی شکل میں نظر آتی اور دوسری سے مراد انسانی فطرت یعنی انسانی طبیعت اور خاصیت ہے۔ جہاں ہم منظر نگاری کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو اسے نظری مناظر سے جوڑا جاتا ہے اور اسے نیچر کی شاعری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ فطرت کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں ہونا بھی منظر نگاری میں شمار کیا جاتا ہے۔ (۱) ناہید قاسمی نے ان کے درمیان فرق کو اس طرح واضح کیا ہے:

> منظر نگاری کا مطلب ہے سامنے نظر آنے والے کسی بھی طرح کے مناظر و مظاہر و اشیا کی عکاسی کرنا،
> جب کہ فطرت نگاری سے مراد ہے نظر آنے والے اصلی اور قدرتی مظاہر و اشیائے فطرت کے ساتھ
> ساتھ مخفی و اصلی کیفیات مظاہر و اشیائے قدرت کو بھی بیان کرنا شامل ہے۔ (۲)

انگریزی ادب میں ان دونوں اصطلاحات کے لیے نیچرل ازم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اردو ادب میں اس کا استعمال انیسویں صدی میں دیکھنے کو ملتا ہے جب انجمن پنجاب کی تحریک سامنے آئی اور اس کے تحت موضوعاتی مشاعرے منعقد کروائے گئے۔ اس حوالے سے جو تعریفیں سامنے آئیں ان میں سے سرسید نیچر کو حقائق موجودات یا اصول نظام کائنات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی نیچر سے مراد ایک تو خارجی کائنات اور اس کے قوانین ہیں اور دوسرے انسانی زندگی اور اس کے ضابطے ہیں۔ (۳) اسی طرح حالی نیچرل شاعری سے مراد اس نظم کو لیتے تھے جو بقول ان کے عادت یا فطرت کے

موافق ہو۔(۴) مزید برآں انھوں نے شعر کہنے کے لیے مطالعہ کائنات پر بھی بہت زور دیا اور ایسی شاعری کو موافق جانا جو فطرت انسانی کے مطالعے کو بھی ساتھ لے کر چلے اور اس کے مشاہدے میں شامل ہو۔(۵)

اس اصطلاح کے رائج ہونے کے بعد پس منظری مطالعے میں اردو میں لکھی جانے والی ابتدائی شاعری میں ایسے مناظر کو پیش کرنے والے اشعار کو فطرت نگاری کی ذیل میں بیان کیا گیا۔ مندرجہ بالا بیان کردہ مختصر وضاحتوں کا نچوڑ نکالا جائے تو یہی چیز سامنے آتی ہے کہ ادب/ شاعری میں کسی شے کا فطری بیان اسے نیچر سے قریب تر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر شاعری میں قدرتی مناظر کی منظر کشی کی گئی اور ایسی ہی مثالیں سامنے لائی گئیں جن میں مناظر فطرت کا تو بیان شامل تھا لیکن فطرت کو درپیش مسائل یا اس کی سنگینی کو توجہ طلب نہیں سمجھا گیا تھا۔ جس کا ذکر ہم ماحولیاتی ادبی تنقید میں دیکھتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نگاری یا منظر نگاری میں فطرت کا بیان اس کے پس منظر کے طور پر کیا جاتا تھا یا پھر سامنے نظر آنے والے کسی مظہر کے طور پر۔ اس کا اپنا ایک الگ مقام کیا ہے یا اس کی ایک منفرد پہچان کیا ہے اس جانب توجہ نہیں دی گئی تھی یا اس رخ کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ماحولیاتی ادبی تنقید اس کے ایک الگ وجود اور اس کی شناخت کو نہ صرف مانتی ہے بل کہ اس کے بیان پر بھی زور دیتی ہے۔ ان تمام مختصر وضاحتوں کے بعد ماحولیاتی ادبی تنقید پر روشنی ڈالیں گے کہ ماحولیاتی ادبی تنقید ہے کیا؟ اسے ادب میں کیسے جگہ ملی اور اس نے ادب میں کس طرح کے مطالعات میں اضافہ کیا ذیل میں اس تحریک کا ایک مکمل جائزہ لیا جائے گا۔

ماحولیاتی ادبی تنقید: تعریف و وضاحت

انیسویں صدی کے وسط میں ایکالوجی کی اصطلاح سامنے آئی۔ اس کے استعمال کے متعلق اور اس کی تعریفوں سے متعلق اس موضوع پر لکھی جانے والی بیشتر کتب میں ایک ہی تعریف اور ایک ہی بائیولسٹ کا نام لیا جاتا ہے:

> The word Ecology was first use by a German called
> Ernst Haeckel in 1869.(٦)

ارنسٹ ہیکل نے اس اصطلاح کا استعمال کیا اور پھر بعد کے آنے والے بائیولسٹس نے انھیں اپنے اپنے طور سے سمجھا جانا اور اسے بیان کیا۔ جیسے فریڈرک (Frederick) نے ۱۹۱۶ء میں اسے ایک علاقے کی سائنس قرار دیا۔ چارلس ایلٹن (Charles Elton) نے اسے ۱۹۲۷ء میں اسے سائنس فطرت کی تاریخ قرار دیا۔ اسی طرح ایلی (Allee) نے

ایکالوجی کو ۱۹۴۹ء میں واضح اور وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ اس کے نزدیک یہ وہ سائنس ہے جو جانداروں کا ماحول سے اندرونی تعلق بیان کرتی ہے۔ (۷) قومی انگریزی اردو لغت میں ایکالوجی کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> حیاتیات کی ایک شاخ جس میں اجسام نامی اور ان کے ذی روح اور غیر ذی روح مجموعی ماحول کے مابین روابط کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عمرانیات کی شاخ جس کا تعلق انسانی آبادیوں، ان کے ماحول، مکانی تقسیم اور ان سے جنم لینے والے ثقافتی نمونوں سے ہے۔ (۸)

ڈکشنری آف سائنس کے مطابق ایکالوجی علم فعلیات کی وہ شاخ ہے جس میں پودوں پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک پودے یا جانور کی روزمرہ زندگی کے کیا کام ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد کے قدرتی حالات یا ماحول سے کیا اثر قبول کرتا ہے اور اس سے کیا تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ (۹)

(N.S subrahmanyam) این۔ ایس سبراہ منیم لکھتے ہیں کہ ایکالوجی بائیو کی ایک شاخ ہے جس میں زندہ جانداروں کا ماحول کے ساتھ تعلق اور اس سے سامنا کرنے سے متعلق مطالعہ کیا جاتا ہے۔ (۱۰) ایکالوجی کی بیان کردہ چند ایک تعریفیں ہیں جنھیں سائنسی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے جو مجموعی طور پر ماحول کے مطالعے کے مباحث سے متعلق کام کرتی ہیں۔ یہی اصطلاح جب ادب میں اپنی جگہ بناتی ہے اور اسے تنقیدی حوالوں سے جانچا جانے لگتا ہے تو یہ ایکو کرٹی سزم (Ecocriticism) کہلاتی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ ماحولیاتی ادبی تنقید کے نام سے کیا گیا ہے۔ ایکو کرٹی سزم کی اصطلاح دو لاطینی الفاظ oikos اور kritis سے مل کر وجود میں آئی۔ (۱۱) ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے مغربی ادب میں لکھی جانے والی تعریفوں اور اس متعلق پہلی بار آواز اٹھانے والوں نے اسے انسان اور فطرت کے باہمی تعلق سے جوڑتے ہوئے ادب میں تلاش کیا۔ انسان نے ماحول کو کس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسے اپنی تحریروں میں کس حد تک جگہ دی ہے، اس کی اہمیت کو کس حوالے سے جانا اور مانا ہے اور اسے تحریروں میں بیان کرنے میں کس حد تک انصاف کیا ہے۔ یہ تمام مباحث اسی تحریک کی ذیل میں جنم لیتے ہیں۔ ماحولیاتی ادبی تنقید یعنی ایکو کرٹی سزم کی اصطلاح باقاعدہ طور پر ۱۹۷۸ء میں ولیم رکریٹ (William Rueckert) نے اپنے مقالے "ادب اور ماحولیات: ماحولیاتی تنقید ایک تجربہ" میں استعمال کی۔ اس کا فروغ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکہ میں ہوا۔ خاص طور پر جب ۱۹۹۲ء میں ادب اور ماحول کے مطالعے کے لیے باقاعدہ ایک ایسوسی ایشن بنائی گئی جو ASLE کے نام سے اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ اس ایسوسی ایشن میں یورپ اور ایشیا کے ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے۔ (۱۲)

ابتدائی طور پر اس نظریے کا پرچار کرنے والوں میں شیرل گلاٹ فیلٹی (Cheryll Glotfelty) کا نام آتا ہے جنھیں پہلی امریکی ماحولیاتی نقاد بھی مانا جاتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس نظریے کے بنیادی نکات کو واضح کیا بل کہ انھیں مثالوں کے ساتھ اپنے مضمون میں بھی پیش کیا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق شیرل گلاٹ فیلٹی نے جو تعریف بیان کی ہے اسے حوالے کے طور پر بعد میں آنے والوں نے لازمی اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے، یوں کہا جا سکتا ہے کہ ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق یہ تعریف مستند اور جامع حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ شیرل گلاٹ فیلٹی نے ماحولیاتی ادبی تنقید کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

> What then is Ecocriticism? Simply put, ecocriticism is the study of the relationship between literature and the physical environment. Just as feminist criticism examines language and literature from a gender-conscious perspective, and Marxist criticism brings an awareness of modes of production and economic class to its reading of texts. Ecocritcism takes an earthcentered approach to literary studies.(۱۳)

یعنی ماحولیاتی ادبی تنقید ماحول اور ادب کے رشتے کے مطالعے کا نام ہے۔ جس طرح تانیثی مطالعات نے ادب کا مطالعہ صنفی افتراقات کی بنیاد پر کیا اور مارکسی تنقید نے اقتصادی حوالوں سے ادب کو جانچا اسی طرح ماحولیاتی ادبی تنقید ادب میں ارض مرکزی مطالعات پر بات کرتی ہے اور زمین کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس حوالے سے ادب، ثقافت اور ماحول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے ڈریک گلیڈوِن (Derek Gladwin) اپنے مقالے "ایکو کرٹی سزم" میں اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> Ecocriticism is a broad way for literary and cultural scholars to investigate the global ecological crisis through the intersection of literature, culture and the physical environment.(۱۴)

کیرن رابر (Karen Raber) ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے ادب، ثقافت اور ماحول کو ایک ساتھ لے کر چلنے کے حق میں ہیں اس حوالے سے انھوں نے جو تعریف بیان کی ہے اس کے مطابق "ماحولیاتی ادبی تنقید ادب، ثقافت اور قدرتی ماحول کے درمیان تعلق کے مطالعے کا نام ہے۔"(۱۵) اس نظریے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناصر عباس نیر بیان کرتے ہیں کہ:

> ماحولیاتی تنقید ادب اور طبعی ماحول کے ان رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے، جن کا اظہار قدیم، کلاسیکی، جدید اور مابعد جدید ادب میں ہوا ہے اور ان امکانات کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ ادب کس طور طبیعی ماحول کی بقا و حفاظت میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔(۱۶)

ماحولیاتی ادبی تنقید اپنی معاصر تحریکات سے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔ ان میں اس کے موضوعات، اس کے مسائل اور ترجیحات و دلائل سر فہرست ہیں۔ اس کا سب سے بڑا محرک فطرت کو لاحق خطرات ہیں۔ اسی متعلق قاسم یعقوب لکھتے ہیں کہ اس نظریے کی ذیل میں صرف ادب اور ماحول کا تعلق ہی نہیں بیان کیا جاتا ہے بل کہ ان چیزوں کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے جو انسان نے فطرت کے ساتھ منسلک کر رکھی ہیں۔ اس مطالعے کے تحت ادب میں جن دو سوالوں کو بطورِ خاص مد نظر رکھا جاتا ہے ان میں پہلا سوال یہ ہے کہ انسان نے کس طرح ماحول کو نقصان پہنچایا ہے اور دوسرا یہ کہ ماحول کن وجوہات کی بنا پر انسان کے لیے ساز گار نہیں رہا ہے۔(۱۷) انسان اور ماحول جنھیں ماہرین ماحولیات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت دیتے ہیں کیوں اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر دکھائی دے رہے ہیں۔ انسان نے اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی غرض سے اسے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر اورنگزیب نیازی ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریے کی ادب میں موجودگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ماحولیاتی تنقید ماحولیاتی تصورات کا اطلاق ادب پر کرتی ہے۔ یہ انسانی ثقافت اور فطرت کے مابین رشتوں کے اس نظام کا مطالعہ کرتی ہے جو کسی ایک کی برتری یا اجارہ داری کے بجائے برابری اور باہمی احترام کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔(۱۸)

یہی چیز اس نظریے کا پرچار کرنے والے ادب میں تلاشنا چاہتے ہیں جس میں کسی کی اجارہ داری کا بیان شامل نہ ہو۔ جہاں اس پورے قدرتی نظام اور اس سے جڑی ہر شے کو برابری کی سطح پر نہ صرف دیکھا جائے بل کہ اس کی اہمیت کو بھی مانا جائے، کیوں کہ یہ پورا نظام ایک زنجیر سے جڑا ہوا ہے اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے یا اس کے کردار کے متعلق بات کی جائے تو مجموعی طور پر مختلف ناقدین اس بات پر متفق

نظر آتے ہیں کہ ماحولیاتی ادبی تنقید ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ادب میں فطرت کو شامل کرنے، اس کا اظہار کرنے اور اس سے متعلق مسائل کو بیان کرنے سے متعلق بحث کرتی ہے یعنی کسی تحریر میں موجود فضا، ماحول، مناظر فطرت، ثقافت، رہن سہن کے طور طریقوں، مقامیت اور دیہی ماحول کی عکاسی کو بیان کرنے کے طریقے پر غور کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ماحولیاتی ادبی تنقید کی اہم ترجیح دیسی اور مقامی خصوصیات کو ادب میں تلاش کرنا، ان کو درپیش خطرات کی نشان دہی کرنا اور ان کے حل کی تجاویز پیش کرنا شامل ہے۔

ابتدائی سطور میں ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) کی تعریف اور اس کی ادب میں موجودگی کو انگریزی اور اردو کی چند تعریفوں سے واضح کیا گیا ہے۔ جس سے اس نظریے کو ابتدائی طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ دراصل یہ نظریہ کن حوالوں سے ادب میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ مغربی ادب میں اس تحریک سے متعلق کئی کام سامنے آ چکے ہیں۔ جن میں مضامین، تحقیقی مقالے اور کتب شامل ہیں۔ ذیل میں مغربی ادب میں اس تحریک سے متعلق ایک جائزہ پیش کیا جائے گا۔ جس میں اس نظریے کی ابتدا اس کے مقاصد اور پھر اس کی مغربی ادب میں باقاعدہ تحریک کی بات کی جائے گی۔ یہ جائزہ مغربی ادب میں لکھے جانے والے انگریزی کے مختلف مضامین اور کتب کے تراجم پر مشتمل ہے جنھیں اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ مغربی ادب میں اس کے آغاز و ارتقا پر اورنگزیب نیازی صاحب کا ایک جامع مقالہ موجود ہے جس میں اس نظریے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے راقمہ نے اس مضمون سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس نظریے کو بلترتیب سمجھا جا سکتا ہے۔

مغربی ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید آغاز وارتقا: ایک جائزہ

ماحولیاتی ادبی تنقید کے آغاز سے متعلق حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔ مغربی ادب میں اس کی ابتدا سے متعلق مختلف مضامین اور کتب لکھی جاچکی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کے آغاز کا سہرا مغربی ادب کے سر ہی جاتا ہے۔ اس حوالے سے ایک مفصل تنقیدی مضمون ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے "ماحولیاتی تنقید : پس منظر، آغاز اور امتیازات " کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق ایک مفصل تعارف موجود ہے جو انگریزی میں لکھے جانے والے مختلف مضامین اور ماحولیاتی ناقدین کے ماحولیاتی تنقید سے متعلق لکھے جانے والے نظریات کا اردو میں ایک بہترین نچوڑ ہے۔ راقمہ نے اس مضمون سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے مغربی ادب میں ماحولیاتی تنقید کو جس طور سمجھا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

مغربی ادب میں اس نظریے نے اس وقت سر اٹھانا شروع کیا جب بشر مرکزیت کی اصطلاح کو للکارا گیا کہ صرف انسان ہی اس دنیا کا مرکز نہیں ہے۔ جس نے خود کو برتری کے زعم میں مبتلا کرتے ہوئے فطرت کو اپنے زیر کر رکھا ہے۔ اس پر مزید بات کرنے سے پہلے اس اصطلاح کی وضاحت کرنا ضروری ہے جس نے اس نظریے کو جنم دینے میں بنیاد فراہم کی۔ اردو میں اس متعلق ڈاکٹر اورنگزیب نیازی نے اپنی ترجمہ شدہ کتاب میں اسے بڑے وضاحتی انداز میں اسے بیان کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ بشر مرکزیت یعنی (Anthropocentrism) کی اصطلاح ۱۸۶۰ء میں مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے آئی جب ڈارون کے نظریہ ارتقا پر مباحث نے جنم لیا۔ اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اس کائنات کا مرکز ہے اور اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ فطرت کا غلام نہیں ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جسے ماحولیات کے ماہرین نے چیلنج کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی وہ تصور ہے جس نے ماحولیاتی مسائل کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نظریے کی ضد میں انھوں نے ایک اور اصطلاح متعارف کروائی جسے کچھ ناقدین حیات مرکزیت کہتے ہیں اور کچھ کے نزدیک یہ ماحول مرکز یا ارض مرکز کہلاتی ہے۔ انگریزی میں اسے (Eco-centric/ Biocentrism) کہا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق کائنات کی تمام مخلوقات برابر ہیں۔ انسان بھی دیگر انواع کی طرح ایک نوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تصور انسان اور فطرت کے تعلق پر زور دیتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں جدا نہیں کیا سکتا ہے۔ (۱۹)

اس جانب متوجہ ہونے والے مفکرین نے پہلے پہل بشر مرکزیت کے مقابلے میں جس اصطلاح کو متعارف کروایا وہ لینڈ ایتھکس (Land ethics) یعنی زمینی اخلاقیات سے متعلق تھی۔ ایلڈولیو پولڈ (Aldo Leopold ۱۸۸۷ء-۱۹۴۸ء) نے اپنی کتاب *A sand county Almanac* میں اپنے نظریات کو

بیان کیا۔ جو لارڈ مین (Lord man) کے بشر مرکزیت سے متعلق نظریات کو چیلنج کرتی ہے۔ اس میں جو بنیادی نظریہ پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی شے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی دوسری شے کا استحصال کرے۔ لیوپولڈ کے یہ نظریات فلسفہ ماحولیات کی بنیاد ثابت ہوئے۔ ماحولیات کے فلسفے کی پہلی اصطلاح کے بارے میں گریک گیرارڈ (Greg Garrard) نے اپنی کتاب *Ecocriticism: The new Critical Idiom* میں ناروے کے فلاسفر آرنی نائس(Arne Naess۱۹۱۲ء- ۲۰۰۹ء) کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس اصطلاح کو استعمال کیا۔ آرنی نائس نے اپنے ہم خیال امریکی فلسفی جارج سیشنز(George session۱۹۳۸ء۔۲۰۱۶ء) کے ساتھ مل کر اس ماحولیاتی فلسفے کو ایک تحریک کی صورت میں پیش کرنے کے لیے آٹھ اصول مرتب کیے۔ جن کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ انسان نے ماحول کو صرف اپنے فائدے کے استعمال کے لیے اسے بگاڑ کی آخری سطح تک پہنچا دیا ہے۔ ماحولیاتی انواع کے لیے انسان کی یہ مداخلت انتہائی نقصان دہ ہے۔ انھیں صرف اپنی ضرورت کے تحت اشیا کا استعمال کرنا چاہیے۔ یہ وہ اصول تھے جنھوں نے ماحول پسندی کے فلسفہ (Environmentalism) کو بھی چوٹ کی ہے جو صرف ماحولیات کے بچاؤ پر توجہ مرکوز کراتی ہے جب کہ ماحولیاتی فلسفہ نہ صرف ماحولیاتی تحفظ پر اپنی توجہ دلاتا ہے بل کہ بشر مرکزیت کے جبر کو بھی توڑتا ہے جس سے انسان نے اس پر تسلط حاصل کر رکھا ہے۔ یہاں اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ فطرت سے انسان کا تعلق کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا درست ہونا ہی اس کی بقا کا ضامن ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تعلق اور اہمیت کو بیسویں صدی کے امریکی ماہر ماحولیات بیری کامنر(Barry commoner۱۹۱۷ء۔۲۰۱۲ء) نے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ہر شے دوسری شے سے مربوط ہے۔ فطرت کی دنیا میں کوئی شے دوسری سے الگ نہیں ہے۔ تمام مظاہر اور اشیا کی زندگی کا دار و مدار باہمی تعامل اور باہمی انحصار پر ہے۔ جہاں انسان کی تخلیقی سرگرمیاں تاریخ اور ثقافت سے جڑی ہیں وہیں ادب کی تخلیق، تخلیقی عمل اور تخلیقی ذرائع فطرت اور ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ اور مرطوط ہیں۔

بیری کے ان نظریات کو آگے بڑھاتے ہوئے جوزف میکر(Joseph meeker۱۹۳۲ء۔پ) نے اس تناظر میں ایک اور اہم بات کی جانب توجہ مرکوز کروائی جس میں ماحول کا یا فطرت کا ادب میں کس طرح بیان کیا گیا ہے سے متعلق چند بنیادی باتیں موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ انسان ہی زمین کی وہ واحد مخلوق ہے جو ادب تخلیق کرتی ہے لہذا اس طرف بھی

تحقیق کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ انسانیت کی فلاح اور بقا کے لیے ادب کا کیا کردار ہے؟ انسانی رویوں اور قدرتی ماحول پر اس کے اثرات کی بھی تحقیق ہونی چاہیے۔ کیا ہمارا ادب فطرت کے انتخاب اور ارتقا کے تناظر میں ہمیں فطرت سے قریب کر رہا ہے یا اس کے مخالف کھڑا کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے؟ یعنی مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جوزف نے ادب اور ماحول کی ہم رشتگی کا سوال اٹھایا۔ جس نے ماحولیاتی ادبی تنقیدی نظریے کی بنیاد فراہم کی اور اسے تنقیدی نظریات کے میدان میں ماحولیاتی ادبی تنقید یا سبز ثقافتی مطالعات(Green Studies)کا نام دیا گیا۔

ماحولیاتی ادبی تنقید کی اصطلاح کو سب سے پہلے اس میدان میں ولیم روکریٹ (۱۹۲۶ء۔۲۰۰۶ء William rueckert)نے اپنے مضمون " لٹریچر اینڈ ایکالوجی: این ایکسپیری منٹ ان ایکو کرٹی سزم" میں بیان کیا۔ دوسری طرف اس اصطلاح کے استعمال میں ایک امریکی نقاد کارل کروبر(Karl Kroeber۱۹۲۶ء۔۲۰۰۹ء) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ جن کا مضمون ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ولیم کا نظریہ یہ ہے کہ ادب اور زبان تخلیقی توانائی کو محفوظ کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔ ادب کے ذریعے پیغام رسانی اور معنی کی ترسیل ہر زمانے میں ہے اور نئے آنے والے زمانوں تک ان کی منتقلی جاری رہے گی۔ ان کے خیالات ماحولیات کے سائنسی تصورات اور ادبی تخلیقی تجربے کے مابین مطابقت پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے تاہم یہ صرف ادب اور ماحولیات کے رشتوں کی وضاحت کرتی ہے اس لیے محدود محسوس ہوتی ہے۔ وین ڈیل ہیرس(Wendell Harrison۱۹۵۷ء۔پ) نے اپنے مضمون میں ادب اور طبعی دنیا کے تمام ممکنہ رشتوں کو اس تعریف میں شامل کر کے ماحولیاتی تنقید کے کردار کو مزید وسعت دی ہے۔ ماحولیاتی تنقید کے ساتھ چلنے والے دیگر تنقیدی نظریات کو دیکھا جائے تو اس میں بشر مرکزی فکر زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں انسان کے حسی، نفسی اور لسانی تجربوں کو شامل مطالعہ رکھا جاتا ہے۔ جو انسان کی فطری دنیا اور ثقافت سے علیحدگی کو بھی واضح کرتا ہے۔

ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے ایک مضمون شیرل گلاٹ فیلٹی(Cheryll Glotfelty۱۹۵۸ء۔پ)نے لکھا جس میں ماحولیاتی تنقید کا بنیادی مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی دنیا طبعی دنیا سے منسلک ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ یہ تنقید فطرت اور ثقافت کے مابین باہمی روابط کو ادب کے ذریعے موضوع بناتی ہے۔ ادب میں فطرت کی پیشکش اس پر ماحول کے اثرات اور ثقافت و فطرت کے مابین تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس چیز کو بھی مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ماحولیاتی تنقید دیگر تنقیدی نظریات سے خاصی مختلف ہے۔ جیسے ساختیات، مارکسیت، تانیثیت، نوآبادیاتی تنقید و نفسیاتی تنقید وغیرہ زبان، ثقافت، جنس یا تاریخی و سماجی عوامل و محرکات کو مد نظر رکھتے ہیں، اس کے برعکس ماحولیاتی تنقید زمین مرکز یعنی ماحول کو موضوع بناتی ہے۔ گلاٹ فیلٹی اس بات پر زیادہ زور دیتی ہیں کہ ماحولیاتی تنقید ادب میں

فطرت کی پیش کش کا مطالعہ کرتی ہے اور اس چیز کو اجاگر کرنے پر زور دیتی ہے کہ کیا فطرت کو اس کے اصل کے طور پر پیش کیا گیا ہے یا نہیں۔ جہاں شیرل نے اپنے نظریات بیان کیے وہیں اس نے ایلن شو والٹر (Elaine showalter ۱۹۴۱ء۔پ) کے ایک تانیثی ماڈل کا بھی حوالہ دیا ہے جس کی ماحولیاتی ادبی تنقید میں ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ ماڈل عورت کی نسائی حیثیت اور ادب میں اسے رد کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ ادب میں تانیثی روایت کی از سر نو دریافت پر زور دیتا ہے کہ جس طرح ماحولیاتی تنقید فطرت کی بحالی پر زور دیتی ہے اور جس طرح تانیثی تنقید خواتین کی ذاتی زندگی سے متعلق سوال اٹھاتی ہے یوں ہی ماحولیاتی تنقید مصنف کی زندگی میں ان محرکات کی کھوج لگاتی ہے جو اس کے تخلیقی تجربے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یعنی شو والٹر کے ماڈل کے مطابق ماحولیاتی تنقید انسان/فطرت کی ثنویت اور فطرت پر انسان کے غلبے اور فطرت کے استحصال پر توجہ مرکوز کرواتی ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید میں شو والٹر کے اس ماڈل کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔ اس ماڈل کو ایکو فیمنزم (Ecofeminism) کا نام دیا جاتا ہے۔ اردو میں اس حوالے سے ابتدائی طور پر کام کرنے والوں میں نسترن احسن فتیحی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جنھوں نے اپنی کتاب میں اس تانیثی نظریے کی وضاحت کی ہے جو ماحولیاتی ادبی تنقید کی ہی ایک ذیلی شاخ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو ادب میں ایکو فیمنزم ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہے۔ اس ضمن میں اردو ادب میں ابھی کوئی کتاب دستیاب نہ ہو سکی ہے البتہ ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق چند ایک مثالیں ضرور موجود ہیں۔ ان کے اس بیان کے بعد ان کی اس کتاب ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ کو ایکو فیمنزم کے حوالے سے پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ (۲۰)

ماحولیاتی ادبی تنقید کے ادوار/لہریں:

ماحولیاتی ادبی تنقید کی پہلی لہر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں رچل کیرسن (Rachel carson ۱۹۶۴ء۔۱۹۰۷ء) کی کتاب *Silent Spring* ۱۹۶۲ء سے شروع ہوئی جس میں پہلی بار امریکی معاشرے کو درپیش ماحولیاتی مسائل اور ان کی وجوہات کو بیان کیا گیا۔ اس کتاب کو سرمایہ دارانہ قوتوں کے چیلنج کرنے پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہی کتاب ماحولیاتی انصاف اور اس تحریک کو اجاگر کرنے کا موجب بنی۔ ساتھ ہی لائن وائٹ مین (Lyne white man ۱۹۲۷ء۔پ)، کیرولن مرچنت (Carolyn Merchant ۱۹۳۶ء۔پ) اور دیگر ماحولیاتی مفکرین نے ادب اور اس وقت کے موجودہ ماحولیاتی مسائل کے متعلق سوال اٹھانا شروع کر دیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان ماہرین نے فطرت نگاری کی قدیم روایت کی از سر نو دریافت یعنی اسے ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی راہ فراہم کی۔ ابتدائی لہر میں مختلف مصنفین نے قدیم متون کے مطالعات پر زور دیا۔ کچھ تحریریں ماحولیاتی آگاہی مہم سے متعلق لکھی گئیں۔ اس حوالے سے جو

بنیادی نظریات سامنے آئے یا جن پر قلم اٹھایا گیا اس میں زیادہ کردار ناقدین کا نہیں تھا اس ذیل میں ان مصنفین کو مد نظر رکھا گیا جو فطرت سے لگاؤ رکھتے تھے اور جن کی تحریروں میں اس کا بیان دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس حوالے سے زیادہ تر غیر افسانوی نثر کو زیر مطالعہ رکھا گیا تھا۔

اس تحریک کی دوسری لہر کا آغاز ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہوا۔ اس دور میں طبعی ماحول کے ساتھ انسانی شرکت کو زیر مطالعہ رکھا گیا۔ اور ان نظریات کو بنیاد بنا کر نئے سوالات قائم کیے گئے جو رچل کیرسن کی کتاب سائلنٹ سپرنگ میں اٹھائے گئے تھے۔ چوں کہ پہلی لہر سے وابستہ مصنفین ادبی نقاد نہیں تھے اس لیے تنقید سے زیادہ ان کی توجہ فطرت نگاری اور ماحولیاتی سائنس کی طرف تھی۔ جب کہ دوسری لہر میں اس حوالے سے ایسے ناقدین سامنے آئے جنھوں نے اس تنقیدی نظریے کو ایک باقاعدہ دبستان کی شکل دی۔ ان میں لارنس بیول (Lawrence Buell ۱۹۳۹ء۔پ) اور جوناتھن بیٹ (Jonathan Bate ۱۹۵۸ء۔پ) کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے اس تنقیدی نظریے کے تحت ورڈز ورتھ (William wordsworth ۱۷۷۰ء۔۱۸۵۰ء) جیسے فطرت نگاروں کا وسیع مطالعہ کیا اور ان تحریروں کو بطور خاص زیر مطالعہ رکھا جو فطرت نگاری کی تحریک کے زیر اثر لکھی گئی تھیں یا جن سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ فطرت نگاری کی تحریک نے اس دور کے ناقدین کو ایک نئی راہ فراہم کی تو بے جا نہ ہوگا۔

ہرولڈ فروم (Harold Fromm ۱۹۳۳ء۔) شیرل گلاٹ فیلٹی جیسے ناقدین کی کوششوں سے سالانہ کانفرنسوں کا انعقاد کیا جانے لگا اور یوں ماحولیاتی ادب کو باقاعدہ ایک موضوع کی حیثیت ملی۔ اسی تناظر میں ۱۹۹۲ء میں ایک ماحولیاتی ادبی تنظیم (ASLE) قائم کی گئی۔ جسے Association for the studies of Literature Environment۔and کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد ماحولیاتی ادب پر تحقیق کرنا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں پیٹرک مرفی (Patric Marphy ۱۹۷۴ء۔پ) نے ایک رسالے کا آغاز کیا جس میں ماحولیاتی فکر کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف تنقیدی مضامین لکھے جانے لگے۔ اس رسالے کا نام Interdisciplinary Studies in Environment Literature anf یعنی (ISLE) رکھا گیا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ماحولیاتی تنقید کو ایک مستحکم دبستان کے طور پر مان لیا گیا لیکن اسے اپنی اہمیت منوانے میں تیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ جب کہ اس کے ساتھ سر اٹھانے والے دیگر تنقیدی نظریات قبول عام کا درجہ اختیار کر چکے تھے۔ ماحولیاتی تنقید کو درپیش مسائل میں سے ایک بڑا مسلہ ہم عصر ناقدین کے تنقیدی نظریات بھی تھے۔ جس میں بنیادی نظریہ لسانی ادبی تھیوری کا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک راہ فراہم کی لیکن ماحولیاتی تنقید میں دنیا کو کس نظر سے

دیکھا جا رہا اور کس طرح دیکھا جانا چاہیے یہ سمجھنے اور اس کا دوبارہ مطالعہ کرنے کی طرف توجہ دی گئی جو اس نظریے کو سمجھنے اور اس کے ہم عصر تنقیدی نظریات کے مابین مخالفانہ رویے کی وجہ بنی رہی۔ ماحولیاتی تنقید انسان کے تخلیقی تجربے کو فطری اور متن کو فطری تشکیل قرار دینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ادب اور فطری دنیا کے مابین رشتوں کے مطالعے سے ان کے معانی تک رسائی کی کوشش کرتی ہے جس کا منبع فطرت ہے۔ جیسے معاصر تنقیدی نظریات میں تاریخی، سماجی، نفسیاتی، ثقافتی اور لسانی مطالعات شامل ہیں ایسے ہی ماحولیاتی تنقید میں فطرت، زمین اور ماحول کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید کا بنیادی مرکز خارجی مظاہر ہیں۔ یہ خاص طور پر فطرت نگاری، منظر نگاری، بن نگاری اور گلہ بانی جیسی اصناف کو مرکز بناتی ہے۔

ماحولیاتی تنقید نے انگریزی ادب میں خاص طور پر امریکہ کے قدیم ادب موجود راعیانہ ادبی روایت پر خصوصی توجہ دی۔ جس میں دریاؤں، چراگاہوں اور دیہی زندگی کی تصویر کو اجاگر کیا گیا۔ اسے وسیع تر معنوں میں دیکھنے کی ضرورت ہے جس میں تاریخی اور ثقافتی مطالعات میں خاص طور پر مابعد نوآبادیاتی تناظر کو بھی مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ امریکا میں جنم لینے والی اس تحریک نے برطانوی ناقدین کو بھی اپنی جانب متوجہ کروایا اور آج اس کا دائرہ دیگر زبانوں میں بھی وسیع ہو رہا ہے اور اس کے زیر اثر کئی مطالعات کیے جا رہے ہیں (۲۱)۔ اوپر بیان کردہ تمام تر حوالے اور وضاحتیں جنھیں ایک ترتیب کی صورت بیان کیا گیا ہے ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے ایک مقالے " ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات" اور انھی کی ایک ترجمہ شدہ کتاب ماحولیاتی تنقید: نظریہ و عمل (منتخب مضامین) سے لیے گئے ہیں۔ ماسوائے اس مثال کے جو ماحولیاتی ادبی تنقید کی ذیلی شاخ ایکو فیمنزم (Ecofeminism) کی وضاحت کے طور پر پیش کی گئی ہے اس کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ راقمہ کی نظر سے قاسم یعقوب کا ایک مقالہ گزرا ہے جس میں انھوں نے ایک نئی اصطلاح ماحولیاتی ساختیات (Eco-Structuralism) کو متعارف کروایا ہے جو اس سے پہلے لکھے جانے والے مقالات میں نہیں دیکھی گئی ہے اس کا بیان کیے جانا ضروری ہے کیوں کہ یہ ماحولیاتی ادبی تنقید کے ہی حق میں کچھ نظریات دیتی ہے۔ اس میں مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ ماحول کو بطور ایک ساخت کے نہیں دیکھا گیا ہے اس لیے ماحولیاتی ساخیات میں اسے ساخت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جس میں ماحول کے تمام عناصر کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مقالہ نگار نے ماحولیاتی ساختیات کے کچھ نکات بیان کیے جنھیں راقمہ مختصراً بیان کرتی ہے جس سے اس کے بنیادی مقصد کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ ماحولیاتی ساختیات کے مطابق:

تمام تر مادی عناصر کے درمیان جسمانی رشتوں کے علاوہ تخلیقی رشتہ بھی موجود ہے۔ انسان کرہ ارض کا مرکز نہیں ہے۔ انسان کے لیے قابل استعمال اشیا کا فطرت سے ظہور میں آنا اہم ہے اور اس نے صرف انھی اشیا کو اہمیت دے رکھی

ہے۔ انسان فطرت کا ہی ایک عنصر ہے اور وہ ثقافت کی ڈھال استعمال کرنے کے باوجود اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ انسان نے فطرت کو تباہ کرنے کے لیے فطرت کا ہی سہارا لیا ہے۔ ساختیات بشر مرکزیت کو رد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ماحول لامرکزیت کا حامل ساختیہ ہے جس میں کسی کو مرکزیت حاصل نہیں ہے۔(۲۲) اس نئی اصطلاح کو مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو انھی باتوں کی طرف متوجہ کرواتی ہے جن کا ذکر ماحولیاتی ادبی تنقید کے ماننے والے کرتے ہیں۔ راقمہ نے اسے سمجھتے ہوئے مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں مغربی ادب میں اس نظریے کے آغاز اور ارتقا سے متعلق جائزہ پیش کیا گیا ہے وہیں اردو ادب میں بھی یہ نظریہ توجہ کا متقاضی ہے۔ جس طرح دیگر مغربی نظریات نے اردو میں اپنی جگہ بنائی اور قبول عام کا درجہ اختیار کر گئے اسی طرح یہ نظریہ بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ ذیل میں اردو ادب میں اس کے آغاز اور اس کی روایت کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ ایک منظر سامنے آسکے کہ اردو میں اس حوالے سے کب اور کیسے کام ہوا، ابتدائی سطح کے مطالعات کیسے تھے، وقت بدلنے کے اور اس نظریے کے فروغ کے ساتھ کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

اردو ادب میں ماحولیاتی تنقید ایک جائزہ:

اردو ادب میں ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) کا نظریہ اکیسویں صدی میں متعارف ہوا۔ دیگر تنقیدی نظریات سے متعلق دیکھا جائے تو ساٹھ کی دہائی کے بعد مختلف تراجم کے ذریعے اردو میں ان کا تعارف اور تحریروں میں ان کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ مغربی ادب میں وہ نظریات اپنے کئی ادوار پورے کر چکے تھے اور اردو میں ان کا تعارف ہوئے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا، چوں کہ ان نظریات کو سمجھنے اور ادب میں انھیں جگہ دینے والوں نے انھیں وقت کے مطابق سمجھا، جانا اور انھیں ادب کا حصہ بنایا لہذا مختصر عرصے میں ہی وہ اردو ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ اس پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ماحولیاتی ادبی تنقید کے اس نئے نظریے کی بات کی جائے تو یہ نظریہ مغربی ادب میں ہی اسی کی دہائی کے بعد سر اٹھانا شروع ہوا۔ اس نظریے کو سمجھنے اور اسے ادب میں برتنے میں بھی کافی وقت لگا اور نوے کی دہائی کے بعد اس متعلق مختلف مضامین باقاعدہ طور پر سامنے آنے لگے۔ اکیسویں صدی میں جا کر ماحولیاتی ادبی تنقید نے مغربی ادب میں مکمل سر اٹھایا اور اس کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے والوں نے اس متعلق کئی کام کیے۔ کئی ادارے بنائے گئے، مختلف رسائل مختص کیے گئے اور تراجم کے ذریعے بھی اس نظریے کا اطلاق کیا گیا۔ خاص طور پر اسی نظریے کی ذیل میں باقاعدہ ادب بھی لکھا گیا۔ اس حوالے سے اردو ادب میں یہ نظریہ بالکل نیا ہے۔ اگرچہ اس متعلق مضامین لکھنے کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے اور اسی متعلق نسترن احسن فتیحی نے اپنی کتاب ایکو فیمینزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ اور ڈاکٹر اورنگزیب نیازی صاحب نے انگریزی کے مضامین کا ترجمہ ماحولیاتی تنقید :نظریہ و عمل لکھ کر اردو میں ایک نئے سرمائے کا اضافہ بھی کیا ہے جو شاید اردو ادب میں اس کی سب سے پہلی کڑی ہے۔

مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو ابھی تک اس نئے تنقیدی نظریے سے متعلق بڑے پیمانے پر کوئی منظم و مربوط کام دیکھنے میں نہیں آیا جس کی ایک بڑی وجہ اس طرف دی جانے والی عدم دل چسپی ہے۔ فطرت نگاری کی تحریک کے حوالے سے اردو میں بہت کام ہوا۔ جس میں شاعری اور نثر دونوں کا جائزہ لیا گیا اور کئی تحقیقی کام بھی کیے گئے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کو ابھی ادب میں سمجھنے اور اس طور سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے جس سے ادب میں ایک نئی جہت کو سامنے لایا جا سکے۔ اردو میں اس حوالے سے چند مقالات محض اس نظریے کا ابتدائی تعارف پیش کرتے ہیں، چند میں اس کے اطلاق کی شعری مثالیں بھی موجود ہیں اور کچھ اس نظریے کی ابتدا و ارتقا پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ان کے موضوعات کو لیتے ہوئے ایک مختصر جائزہ لیا جائے گا کہ اردو میں ماحولیاتی ادبی تنقید نے کس طرح اپنا کردار ادا کیا اور اسے کن پہلوؤں سے جانچا گیا ہے۔ کن تحریروں کو دیکھا گیا ہے اور کون سے تراجم سامنے آئے ہیں۔ اردو میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے کوئی حتمی

بیان نہیں دیا جاسکتا ہے کہ اس پر پہلے کس نے لکھا، کن حوالوں سے لکھا، کون سے پہلوؤں پر بات کی گئی اور کن تحریروں کو اس کی روشنی میں پرکھا گیا۔ راقمہ نے اس حوالے سے جن مقالات کا مطالعہ کیا ہے انھیں سنہ وار مختصر مفہوم/تبصرے کے طور پر بیان کرنے کو ترجیح دی ہے تاکہ ترتیب وار ایک جائزہ سامنے آسکے اور دیکھا جاسکے کہ اس نظریے کو مد نظر رکھتے ہوئے کن کن حوالوں سے کیسے کیسے کام کیے گئے ہیں۔

اس ضمن میں پروفیسر رباب رضوی کا ایک مضمون" انسان اور ماحول: ایک جغرافیائی تجزیہ" کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں سامنے آیا۔ اس مضمون میں مصنفہ نے انسان اور ماحول کے باہمی تعلق اور ان کے ایک دوسرے کے لیے ضروری ہونے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ جغرافیائی حوالوں سے اس بات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے کہ انسان نے کب کب ماحول کو قابل تسخیر بنایا اور کب اسے ایسی کوشش میں نقصان اٹھانا پڑے۔ اس نظام کو سمجھنے کے لیے ابتدا میں جس اصطلاح کا استعمال کیا گیا اسے ماحولیاتی نظام یاEcosystem کہا گیا۔ اس اصطلاح کو انسان اور ماحول کے درمیانی تعلق کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس حوالے سے ایک مکمل پس منظر بیان کیا ہے جس میں انسان کو ماحول کے تابع رہنے اور پھر اسے اپنے تابع کرنے تک کے ادوار پر مختصر روشنی ڈالی ہے اور اس ذیل میں ہونے والے مطالعات کو بھی بیان کیا ہے لیکن ادب میں کسی تحریر کا کوئی حوالہ سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں اس نظریے کو ابتدائی طور پر سمجھنے کی اور انسان سے اس کا تعلق بیان کرنے کی یہ ایک ابتدائی کاوش ہے (۲۳)۔

۲۰۱۱ء میں پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مقالے بعنوان" پروین شیر کی شاعری: ایک ماحولیاتی مطالعہ" میں پروین شیر کی شاعری کا جو مطالعہ پیش کیا ہے اس میں ایکوفیمنزم کی جھلک زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ جس میں مرد کو عورت اور فطرت کو تسخیر کرنے سے متعلق بات کی گئی ہے۔ جس میں مصنف کا کہنا ہے کہ دیگر ماحولیاتی تانیثیت پسندوں کی طرح پروین شیر کا بھی یہی خیال ہے کہ فطرت کی آزادی کے بغیر عورت کی آزادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر عتیق اللہ نے اس مقالے میں اس چیز کو بھی مختصراً واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب مغربی دنیا میں سائنسی اور صنعتی ارتقا کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں پر زور دیا جارہا تھا اور ماحولیاتی عناصر کو انسان اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے میں مصروف عمل تھا تو رومانیوں نے ان کے رد عمل میں فطرت کے جلال و جمال پر خوبصورت تصور پیش کیے تھے۔ جس میں اس کی اہمیت اور انسان کے لیے اس کی افادیت پر زور دیا گیا تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ماحول کو بچانے اور انسان کی بقا کے لیے اس کی موجودگی کو بھی لازم قرار دیا جارہا تھا۔ اس چیز پر بھی زور دیا گیا کہ جب بھی انسان نے اپنی حد سے تجاوز کر کے ماحول

TH25582

کے ساتھ برا سلوک کیا ہے تو وہ قہرناک بھی ثابت ہوئی ہے۔ رومانیوں کی اس کوشش کو اس تحریک کی بنیادوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں شاعرہ کے ماحول دوست ہونے کو شعری مثالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ (پروفیسر عتیق اللہ کا یہ مقالہ ۲۰۰۵ء میں کاروانِ ادب میں بھی شائع ہو چکا ہے۔)(۲۴) ڈاکٹر مولا بخش کے مقالات بھی اس نئے نظریے کی ذیل میں بنیادی اہمیت کے حامل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ان کے دونوں مقالات ۲۰۱۳ء میں لکھے گئے جن میں " ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ " اور " مراثیِ انیس اور ماحولیاتی تنقید " شامل ہیں۔ پہلے مقالے " ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ " میں اردو ادب میں مغربی ادب سے شامل ہونے والے تمام تنقیدی نظریات کو بیان کرتے ہوئے ادب میں ان کے قبولِ عام ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ماحولیاتی ادبی تنقید کے نئے نظریے کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اور اردو ادب میں اس کی طرف کم توجہ دیے جانے پر بھی سوال اٹھایا گیا ہے۔ ماحولیاتی تنقید کو جہاں فطرت اور ثقافت سے جوڑا گیا ہے وہیں اس کا تعلق سائنسی علوم سے بھی وابستہ کیا گیا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید ادب میں دیہی زندگی کے پیکروں اور ماحول، فطرت اور قدرتی مناظر کے پیش کش کی نوعیت پر زور دیتی ہے۔ اس چیز کی کمی کو بھی محسوس کیا گیا ہے کہ ادب میں ایسی تنقید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس میں ان مسائل پر غور و فکر کیا جائے اور انھیں سامنے لایا جائے۔ اس حوالے سے انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ایک مضمون " بلونت سنگھ کا فن، سائیکی، ثقافت اور شکستِ رومان " کی ذیل میں انھیں اس نظریے پر لکھنے والا پہلا نقاد مانا ہے۔ ان کے نزدیک اگرچہ اس اصطلاح کا نام استعمال نہیں کیا گیا ہے لیکن اس مضمون میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے ایجنڈے کے بنیادی نظریات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ علاوہ ازیں مقالہ نگار نے ماحولیاتی نقاد کے چند اصول بھی ترتیب وار بیان کیے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر ایسے مطالعات کو بہتر طور پر سامنے لایا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ فطرت یا قدرتی مناظر جیسے ہیں انھیں ان کی اصل کے ساتھ قبول کر کے ادب کا حصہ بنایا جائے۔ مقالہ نگار نے اس نظریے کے حوالے سے ابتدائی مغربی تعریفوں کو مختصر وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے شعری مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان شعری مثالوں کو ماحولیاتی تنقید کا ابتدائی تجزیہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں دھرتی کا دکھ، فطرت سے انسان کا مضبوط تعلق، قدرتی ماحول کو مسخر کرنے کی دوڑ میں اس کے ساتھ کیے جانے والے نقصان کو شعری حوالوں سے بیان کرنا شامل ہے۔(۲۵)

ڈاکٹر مولا بخش کے دوسرے مقالے " مراثیِ انیس اور ماحولیاتی تنقید " کا جائزہ لیا جائے تو یہ مقالہ نہ صرف انیس کے کلام کا ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں ایک تجزیہ ہے بل کہ اس مطالعے میں اس دور کی تہذیب و ثقافت کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ اردو ادب میں اس حوالے سے کیا جانے والا یہ ان کا پہلا کام ہے جس میں انیس

کے کلام کا ماحولیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ (چوں کہ مقالہ نگار کے بقول ان کے سامنے کوئی شعری حوالہ موجود نہیں تھا اور یہ ان کی پہلی کاوش تھی تو شاید تنقیدی میدان میں اس سے صرف نظر کیا جائے۔ راقمہ کے نزدیک شعری مثالوں کے تجزیے کو فطرت نگاری کی تحریک کے کسی حصے میں بطور مثال کے تو مانا جا سکتا ہے لیکن ماحولیاتی ادبی تنقید جس طرح ادب میں اس کے بیان پر زور دیتی ہے یہ تجزیہ اس پر پورا نہیں اترتا۔) (۲۶)

۲۰۱۵ء میں ڈاکٹر ضیاء الحسن کا مقالہ بعنوان " اردو ادیبوں کا فطرت سے بدلتا ہوا تعلق: چار صدیوں کے تناظر میں " سامنے آیا۔ اس مقالے کا موضوع اگرچہ ماحولیاتی تنقید نہیں ہے لیکن اس میں جس چیز کی نشان دہی کی گئی ہے وہ ماحولیاتی تنقید کے بنیادی نکات میں شامل ہے۔ عنوان کے اعتبار سے یہ مقالہ وسیع مطالعے پر مشتمل معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ مقالہ چار صدیوں کی کہانی نہایت ہی مختصر ترین صورت میں بیان کرتا ہے۔ اسے چار صدیوں کا طائرانہ جائزہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مصنف نے شعری مثالوں کے ذریعے سے ہر دور کے فطرت سے متعلق بدلتے رویوں کی عکاسی کی ہے۔ وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو کس طرح ایک ادیب نے محسوس کیا اور اسے ادب کا حصہ بنایا کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی ادوار میں جہاں فطرت سے ہمدردی کا رویہ مختلف تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے وہیں اس رویے کے بدلتے رخ بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چند مثالوں کی صورت میں جن میں افسانہ اور شاعری دونوں شامل ہیں کے ذریعے ماحول کے ساتھ انسان کے تعلق اور پھر اس تعلق کی موت پر بھی ایک اچھا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں بیان کردہ افسانوں کو ماحولیاتی ادبی تنقید کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے۔ (۲۷) ۲۰۱۶ء میں دیدبان کا ایک خصوصی شمارہ (۳) ماحولیاتی تنقید پر نکالا گیا۔ جس میں سبین علی کا ایک تعارفی اداریہ اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہے اور اس نظریے کی ادب میں اہمیت کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس رسالے میں شاعری اور مختلف مضامین کے ذریعے ماحولیات سے متعلق اہم مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ (۲۸)

شیخ عقیل احمد نے ۲۰۱۷ء میں اپنے مقالے بعنوان " قدیم ہندوستانی فلسفہ اور کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے " میں قدرت کی بنیادی اور اہم اکائیوں جیسے ہوا، پانی، بادل، سورج وغیرہ کی اہمیت کو نہ صرف قرآنی حوالوں بل کہ مختلف ویدوں، اپنشدوں اور اشلوکوں کی مثالیں دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔ گیتا میں سے بھی چند ایک مثالیں فطرت کی حمایت اور اس کی انسانوں کے لیے اہمیت کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ کالی داس کی بنیادی تخلیقات (شکنتلم، میگھ دوتم، رتو سنہار) میں سے کئی ایک مثالوں کو اس طرح واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان سے ماحولیاتی فلسفے کو سمجھنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سنسکرت ادب سے فطرت اور ماحولیات کی اہمیت کو سامنے لایا جا سکے جسے انھوں نے کالی داس کی تخلیقات سے لی گئی مثالوں کے ساتھ بخوبی بیان کیا ہے۔ (۲۹)

"حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید" ۲۰۱۷ء میں لکھا گیا ڈاکٹر صوفیہ یوسف کا مقالہ ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے ابتدا میں ماحولیاتی ادبی تنقید کی چند تعریفیں بیان کر کے اس نظریے کو مختصراً واضح کیا ہے۔ ان کا بنیادی موضوع دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں ہونے والے ماحولیاتی نقصان پر ہے جسے انھوں نے حجاب امتیاز کے ناول" پاگل خانہ" کی مثال دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔ جس کی ہیروئن انسان اور دھرتی ماں دونوں سے محبت کرتی ہے۔ ایٹمی دھماکوں سے ہونے والے ماحولیاتی نقصان سے آگاہی دلاتی ہے تاکہ مستقبل میں ایسے نقصانات سے بچا جا سکے۔ مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ ایسی تحریریں معاشرے میں ماحولیاتی شعور کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ انھیں نہ صرف ادب میں تلاش کیا جانا چاہیے بل کہ اس نظریے کی ذیل میں ایسا ادب لکھنے پر بھی زور دینا چاہیے۔ (۳۰)

۲۰۱۷ء میں سرور غزالی صاحب کا ایک مضمون "اردو ادب میں فطری ماحول کے اثرات" کے عنوان سے سامنے آیا۔ اس مضمون میں شاعری کے علاوہ اردو کی دیگر اصناف کو مد نظر رکھا گیا ہے جس میں فطرت کو لاحق خطرات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اردو ادب نے ابتدا سے ہی مشکل ادوار کا سامنا کیا جس میں پہلے ادوار میں فطرت سے محبت اور اس سے رکھ رکھاؤ کا رویہ دیکھنے کو ملتا ہے اور پھر جوں ہی ماحولیات اور انسان کے تعلق کو عصری مادی ترقی نے گھیرا وہیں فطرت سے جڑتا رکھ رکھاؤ توڑ پھوڑ کا شکار نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں منشی پریم چند، غلام عباس، ابواللیث جاوید، کرشن چندر، خدیجہ مستور، گلزار اور فیصل نواز کے ایک ایک افسانے کا مختصر تجزیہ پیش کیا گیا ہے جن میں ماحولیاتی مسائل کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ (۳۱)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے۔ ان کا مقالہ بعنوان" ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں" اس موضوع پر ایک تفصیلی جائزہ ہے۔ جس کا پہلا حصہ ماحولیاتی ادبی تنقید کی ابتدا، ادب میں اس نظریے کا شامل ہونا سے لے کر اس کے بنیادی نکات اور اس کے مقاصد پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ ماحولیاتی تنقید کے نظریے کو اردو میں واضح طور پر بیان کرنے کی بہترین کاوش ہے۔ علاوہ ازیں اس میں شامل ایک اصطلاح جو بشر مرکزیت کے نام سے جانی جاتی ہے کو کس طرح متن میں شامل کرتے ہیں اور اس سے کیا معنی اخذ کرتے ہیں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالے کے دوسرے حصے میں انتظار حسین کی تحریروں کی ماحولیاتی شعریات کو ان کے افسانوں کی مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ان افسانوں کو مد نظر رکھا ہے جس میں بشر مرکزیت کا فلسفہ زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نکتے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس میں فطرت کو استعمار کاری یعنی

(Colonisation) کے ذریعے فتح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی مثالیں ادب میں موجود ہیں۔ ان کو سامنے لانے اور اس نظریے کی ذیل میں ان کی تفہیم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے اصل مقصد کو سامنے لایا جاسکے۔(۳۲)

ڈاکٹر طارق ہاشمی کا ایک مقالہ " عصری نظم اور ماحولیاتی مسائل" ۲۰۱۸ء میں لکھا گیا ہے۔ اس مقالے میں اگرچہ ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریے پر خصوصی طور پر بات نہیں کی گئی ہے لیکن جن نظموں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں انھی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ماحولیاتی تنقید کا موضوع ہیں۔ معاصر نظم گو شعرا کے نزدیک ماحولیاتی مسلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔(۳۳) احمد سہیل صاحب کا ایک مختصر تبصرہ "ماحولیاتی ادبی تنقید کا نظریہ" کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے اس نئے تنقیدی نظریے کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اردو ادب میں اس حوالے سے کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اردو ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اس حوالے سے ابھی محروم ہے کہ اسے اس نظریے کے تحت پر کھا جائے۔ ان کی تحقیق کے مطابق کاشف الحقائق کے مصنف امداد اثر کو پہلا ماحولیاتی نقاد مان لینا چاہیے کیوں کہ ان کی اس تنقیدی و تحقیقی کتاب میں ماحولیاتی علامتوں کو شاعری میں دریافت کرتے ہوئے اردو تنقید میں ایک نظریے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔(۳۴)

الیاس بابر اعوان نے بھی اپنے مضمون " تناظر: ایک ماحولیاتی تنقیدی تجزیہ " میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریے پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے شاہد ماکلی کے شعری مجموعے " تناظر " کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں شاعر نے فطری عناصر کو استعارات کے بجائے ان کی اصل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ انسان ابتدا سے ہی فطرت سے جڑا ہوا ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ انسان، فطرت اور اس کے ماحول کی جڑت ہی کائنات کے نظام کی بقا ہے۔ یہ مضمون ۲۰۱۸ء میں لکھا گیا۔ مضمون نگار نے شعری مثالوں کی تفہیم کو جس طرح ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریات کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے وہ ایک نئے تجزیے کو سامنے لاتی ہیں۔(۳۵) ڈاکٹر آرزو چفت سورین جو کہ ترکی کی استنبول یونی ورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں نے ۲۰۱۸ء میں ترکی ادب کے ایک مصنف یشار کمال جو کہ فطرت سے لگاؤ رکھتے ہیں اور انھیں ترکی ادب میں پہلا فطری مصنف مانا جاتا ہے کے کام پر ایک مقالہ " یشار کمال کے ناول ناراض سمندر میں ماحولیات کے مسائل " تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے انسان کا فطری عوامل سے تعلق ایک ماہی گیر اور ڈولفن مچھلی کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ جس میں انسان خود یہ سوال بلند کرتا ہے کہ اولاد آدم نے ہی اپنی بقا کے لیے ان چیزوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے جو خود اس کے بقا کی ضامن ہیں۔ مقالہ نگار نے اس ناول کے پس منظر میں بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے بیچ اٹھنے والی ماحولیاتی تحریک کو مد نظر رکھا ہے۔(۳۶)

۲۰۱۹ء میں ڈاکٹر ذکیہ رانی کا ایک مقالہ " مولانا الطاف حسین حالی کے تین نکات کا ماحولیاتی تناظر اور انجمن پنجاب کے مناظمے (تجزیاتی مطالعہ) " لکھا گیا۔ جس میں حالی کے تین نکات کو انتخاب بلحاظ تخیل، تفحصِ الفاظ اور مطالعہ کائنات پر پرکھا گیا ہے۔ ایسا مطالعہ راقمہ کی نظر سے پہلی بار گزرا ہے اس کا حوالہ یہاں اس لیے دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے مستقبل میں ماحولیاتی ادبی تنقید کی ذیل میں بھی ایسے مطالعات کو شامل کیا جائے جو متن کی ایک نئ قرات کو سامنے لاتا ہے۔ (۳۷) ڈاکٹر شگفتہ حسین نے اپنے مقالے " طاہرہ اقبال بحیثیت ایکو فیمنسٹ " میں ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) کی ایک ذیلی شاخ ایکو فیمنزم (Ecofeminism) کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۱۹ء میں سامنے آیا اور اس میں مقالہ نگار کا یہ جملہ کہ ماحولیاتی ادبی تنقید کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے صرف ماحولیاتی آلودگی کے سبب اس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے کئ ایک سوالات کو جنم دیتا ہے، لیکن اس کی وجوہات کو بیان نہیں کیا گیا ہے سوائے اس بات کے کہ یہ نظریہ ماحولیاتی آلودگی کے بڑھنے کے سبب اہمیت پکڑ چکا ہے۔ مقالہ نگار نے ایکو فیمنزم کے نظریے کو واضح کرتے ہوئے طاہرہ اقبال کو ایک ایکو فیمنسٹ مصنفہ ثابت کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہی معاشرے کی جس عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ صرف اور صرف استحصالی رنگ اوڑھے ہوئے ہے۔ (۳۸)

ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق ایک مفصل تعارف ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے جامع مقالے " ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات " کی صورت میں ۲۰۱۹ء میں سامنے آیا۔ اردو میں راقمہ کی ابتدائی تحقیق کے مطابق اس موضوع پر یہ پہلا تفصیلی اور جامع مقالہ ہے جس میں ماحولیاتی ادبی تنقید کے مغربی ادب میں آغاز سے لے کر اس نظریے کے ادب میں جگہ بنانے تک کو مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ اس نظریے کو اپنا آپ منوانے میں تیس سال تک کا عرصہ لگ گیا۔ اس مقالے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ انگریزی کتب، رسائل اور مضامین کا ایک مکمل نچوڑ ہے جسے اردو میں بیان کیا گیا ہے۔ (۳۹) ۲۰۱۹ء کے آخر میں قاسم یعقوب صاحب کا ایک مقالہ بعنوان " ادب اور فطرت: ماحولیاتی تناظرات " سامنے آیا۔ اس مقالے میں ماحول اور فطرت کا فرق واضح کرتے ہوئے اسے انسان کے تعلق کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ ماحول مرکز اور بشر مرکزیت کو ماننے والوں کے خیالات کو واضح کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خان کے تصورِ فطرت پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ماحولیاتی ادبی تنقید سے جڑی ایک اور نئ اصطلاح کو بھی اس کے بنیادی نکات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح ماحولیاتی ادبی تنقید کے کچھ نظریات کو چیلنج کرتی ہے اس کا بنیادی نکتہ یہ کہ ماحول میں کسی کو مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ اسے ماحولیاتی ساختیات یعنی (Eco-Structuralism) کا نام دیا گیا ہے۔ (اس سے ملتے جلتے نظریات کو رسوئیلن کیمپ بیل کے مضمون " خواہش کی زبان اور وطن (فلسفہ ماحولیات اور پس ساختیات کا نقطہ

اتصال)" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کی کتاب **ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل** میں موجود ہے۔)۔ مقالے کے آخر میں ماحولیاتی تنقید کے بدلتے نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (۴۰)

۱۶جولائی ۲۰۲۰ء میں سرائیکی ادب کے ایک لکھاری یوسف نون کا ایک مضمون "عبدالباسط بھٹی دے افسانیاں دا ماحولیاتی، سماجی، ثقافتی تے تہذیبی تناظر" سامنے آیا۔ اس مضمون میں انھوں نے عبدالباسط کے افسانوں کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید کی ذیل میں کیا ہے۔ جس میں افسانوں کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ (۴۱) " ماحولیاتی انصاف اور مجید امجد کی شاعری (ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ) " سید کاشف علی شاہ اور ڈاکٹر رخشندہ مراد کا لکھا مقالہ ہے۔ جو الماس میں ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں مصنف نے مختصر لیکن جامع انداز میں ماحولیاتی ادبی تنقید کا تعارف پیش کیا ہے جس میں اس کا فطرت نگاری سے الگ تنقیدی نظریے کی حیثیت رکھنا بھی شامل ہے۔ اس نظریے کی بنیادی اصطلاح یعنی حیات مرکز کی توضیح بھی پیش کی ہے کہ وہ کس طرح بشر مرکزیت سے مختلف ہے اور اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مقالہ نگار نے ماحولیاتی ادبی تنقید کی مختلف لہروں کو بھی بالترتیب بیان کیا ہے اور اس دوران اس میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مقالے کے آخری حصے میں ماحولیاتی انصاف کے نظریے کو لیتے ہوئے مجید امجد کی دو نظموں " کنواں اور ہڑپہ کا کتبہ " کو بطور نمونے کے پیش کرتے ہوئے اس کا اس نظریے کی ذیل میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ادبی تحریروں میں ایسے نظریات کی نشان دہی کرنا اور انھیں سامنے لانا ضروری ہے۔ جس کی ہمارے ادب میں سخت کمی ہے۔ مجموعی حوالے سے یہ مقالہ ماحولیاتی ادبی تنقید کو سمجھنے کی اور اسے اشعار میں تلاش کرنے کی ایک اچھی کاوش ہے۔ (۴۲) راقمہ کی نظر سے **بازیافت** کے ۳۲ شمارے ۲۰۱۸ء میں ایک انگریزی کا مقالہ بھی گزرا ہے جس میں Twilight in Dehli ناول کا اسی نظریے کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ خورشید عالم اور حماد نذیر زکی نے لکھا ہے۔ (۴۳)

" ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ " کے عنوان سے ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کا ایک اور مقالہ اسی موضوع پر حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ مقالے کے دو حصوں کا مختصر تعارف ملخص میں بیان کیا گیا ہے۔ بیری کامنر کے ماحولیاتی نظریے سے متعلق ان کی بنیادی باتیں اور نکات انتہائی آسان الفاظ میں وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان نکات میں تیسرا قانون راقم کے لیے نیا تھا جس میں کہا گیا کہ " فطرت اشیا کو بہتر جانتی ہے " کہ کون سی شے کو کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نکتے کی بھی وضاحت پیش کی گئی ہے کہ ادب اور آرٹ ہمیں جانوروں سے اگر الگ بناتے ہیں تو کیوں بناتے ہیں۔ ادب میں فطرت کی اظہار کی دو صورتوں کی وضاحت بھی پیش کی گئی ہے۔ یہ وہ تعارفی وضاحت ہے جس کی ہمارے آج کے اس

موضوع پر لکھنے والوں کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اس فرق کو جان سکیں جو اس نئے نظریے نے فطرت نگاری اور اس کے بیچ پیدا کیا ہے۔ اس کی وضاحت کے ساتھ ہی افسانے کی مثال بھی شامل مقالہ۔ یہاں جو ایک نئی سوچ پیدا کی گئی ہے اور اس طرف توجہ دلائی گئی ہے یہ لائق تحسین ہے کہ ماحولیاتی مطالعات میں اس مطالعے کو بھی مختلف حوالوں سے دیکھنا چاہیے اور یہ کیسی کیسی نئی جہتیں سامنے لائے گا۔ اگلی مثالوں میں ماہرین لسانیات کی طے کردہ بنیادی تعریف پر ساختیات نے چوٹ کی ہے کہ لسانی فلسفہ زبان سے مراد محض انسانی زبان نہیں بل کہ ان سب نشانات کو زبان تصور کرتی ہے جو ابلاغ کرتے ہیں اور اس میں جانوروں کی زبان بھی شامل ہے۔ یہ سوال ایک نئی بحث اور نئی تحقیق کو جنم دیتا ہے اور ماحولیاتی مطالعات کے میدان میں ایک نئے در کو کھولتا ہے۔ اور جو کہتے پھرتے ہیں کہ " حیوان عقل و شعور سے عاری بیکار مشینیں ہیں" ان کو اس پر از سر نو فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ماحولیاتی ادب فطرت کی خاموشیوں اور غیر انسانی آوازوں کو سمجھنے اور سماجی و ثقافتی تناظرات میں ان کے معنی و مفہوم کے تعین کی کوشش کر رہا ہے۔ اس پر ادبی حوالے لے کر مثالیں پیش کی جائیں تو نئی جہتیں سامنے آئیں گی۔ جس کی بہترین مثالیں افسانوں کی شکل میں اس سفر کے دوران بھی موجود ہیں۔ "گوری ہو گوری، کلوا، آئینہ حیرت، درخت باتیں ہی نہیں کرتے، آخ تھو، سورج۔ ہیومنزم، گائے، کتا گاڑی، چوہے، فتو بھوکا ہے، درخت آدمی، دو بیل وغیرہ" جیسے مزید کئی افسانے اس تنقیدی نظریے کی اردو افسانے کے میدان میں نئی تفہیم کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اختتامی صفحات میں ماحولیاتی شعریات کے تیسرے نمایاں سائنسی زاویے کی ذیل میں افسانوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن میں " ستلج پھر بپھرا ہے، ہیروشیما، پاگل خانہ، مور نامہ، پولی تھین، زمین کا نوحہ وغیرہ " شامل ہیں۔ پولی تھین اور زمین کا نوحہ ایسے افسانے ہیں جو آج کے انسان کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ اس کو توجہ سے بیٹھ کر اس پر سوچنے کی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ قدرت کو ہاتھ میں لے کر جہاں خلا و کائنات کو مسخر کرے گا تو کیسے اپنا وجود برقرار رکھ پائے گا۔ مجموعی حوالے سے اس نئے نظریے کی اردو ادب کے متن میں تفہیم کی ایک عمدہ کوشش ہے (۴۴)

" مجید امجد کی نظمیں: ایک ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ " یہ بھی ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کا ہی لکھا ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے مجید امجد کی نظموں کو ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ فطرت، مقامیت اور ماحولیات کی بہترین عکاسی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ " مجید امجد کے تصور فطرت میں تمام ماحولیاتی عناصر سماج میں انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ مجید امجد ان کے ساتھ ہمدردی اور احساس کے رشتے میں منسلک ہیں۔ وہ ان کے دکھ کو انسانی سطح پر محسوس کرتے ہیں۔ 'گوشت کی چادر'، 'بارکش'، 'بن کی چڑیا'، ' اے مری چڑیا'، 'بہار کی چڑیا' پکار' اور ' توسیع شہر' کے تہ نشین حزنیہ لہر جانوروں، پرندوں اور درختوں کے دکھ میں براہ راست شرکت سے پیدا ہوئی ہے۔"

شعری مثالوں میں اس نظریے کی اس طرح کی تفہیم کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں مثالوں کے ساتھ صرف ان کی تشریح شامل نہ ہو بل کہ ماحولیاتی تنقید کے نظریات اور اس کے نکات کو بھی بیان کیا جائے۔ یہ مضمون اس کی ایک بہترین مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ (۴۵) جولائی ۲۰۲۱ء میں (راجوری) جموں کشمیر سے شائع ہونے والے سہ ماہی تفہیم میں "ماحولیاتی تنقید: صورت حال اور امکانات" (اورنگزیب نیازی سے ایک مکالمہ) کے عنوان سے عمر فرحت نے ایک مکالمہ شائع کیا ہے جو ماحولیاتی ادبی تنقید کی اردو ادب میں اہمیت اور اس کے اطلاق سے متعلق ہونے والے کاموں پر تفصیلی گفتگو پر مشتمل ہے۔

مندرجہ بالا بیان کردہ مقالات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں اس موضوع پر ۲۰۱۰ء کے بعد ہی باقاعدہ قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس حوالے سے دو کتابیں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سے ایک نسترن احسن فتیحی کی کتاب ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ کے نام سے ۲۰۱۶ء میں سامنے آئی۔ دوسری کتاب ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کی ترجمہ شدہ ہے جو ماحولیاتی تنقید:نظریہ و عمل (منتخب مضامین) کے عنوان سے ۲۰۱۹ء میں اردو ادب کا حصہ بنی۔ اس کتاب میں انگریزی کے ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق بنیادی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

نسترن احسن فتیحی کی کتاب کا جائزہ لیا جائے تو اس کتاب میں انھوں نے ماحولیاتی ادبی تنقید کی ایک ذیلی شاخ ایکو فیمنزم کو موضوع بنایا ہے اور اس نظریے کے تحت عصری افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب " ایکو فیمنزم (ماحولیاتی تانیثیت)" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں انھوں نے اس نظریے کی تعریف آغاز و ارتقا کو تفصیلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ اس نظریے کی تعریف میں لکھتی ہیں کہ یہ نظریہ حقوقِ نسواں کے مختلف شعبوں مثلاً خواتین کی صحت، ماحولیاتی تحریکات اور جانوروں کی آزادی جیسی تحریکوں سے نمو پذیر ہوا ہے۔ اس باب میں انھوں نے مختلف ممالک میں ہونے والے انقلابات میں عورت کے کردار پر بات کی ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے اس کا ایکو فیمنزم سے تعلق جوڑا ہے اور اس کے بنیادی نکات بھی بیان کیے ہیں۔ تانیثیت کی مختلف لہروں کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ماحولیات کے مختلف مسائل کو بھی موضوع بناتے ہوئے عورت پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب "عصری تانیثی اردو افسانہ اور ایکو فیمنزم کا تصور" کے عنوان سے ہے اس باب میں انھوں نے ایکو فیمنزم کے تصور کو واضح کیا ہے اور ساتھ ہی خواتین کے لکھے ہوئے افسانوں کو اس باب کا حصہ بنایا ہے جس میں مکمل افسانے موجود ہیں۔ اور آخری باب " ماحولیات، تانیثیت اور عصری تانیثی افسانے کا ایک تجزیاتی مطالعہ "میں انھوں نے تمام بیان کردہ

افسانوں کا ایکو فیمنزم کی ذیل میں جائزہ لیا ہے جنھیں مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ مجموعی حوالے سے اس کتاب پر بات کی جائے تو یہ کتاب عورت کو اس کے اصل قلم کے ساتھ بیان کرنے کی ایک کڑی ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ جہاں ابتدا میں فطرت کا بیان اس کے مناظر کے حسن کے بیان کے ساتھ مشروط تھا تو آج کا عہد جب ماحولیات کے سنگین مسائل سے دوچار ہے تو ادب کس طرح پھر ان کی تباہ کاریوں کو بیان کرنے اور فطرت پر ان کے منفی اثرات کو بیان کرنے سے پیچھے رہ سکتا تھا۔ خواتین کے لکھے یہ افسانے انھی تباہ کاریوں کی روداد اپنی زبانی سناتے ہیں۔ (۴۶)

دوسری کتاب جو ۲۰۱۹ء میں سامنے آئی وہ اس موضوع پر پہلی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں ماحولیاتی ادبی تنقید کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ ماحولیاتی تنقید :نظریہ و عمل (منتخب مضامین) ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے انگریزی سے ترجمہ شدہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں دس مضامین کا اردو میں جامع اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی نظریے سے متعلق استعمال ہونے والی اصطلاحات کو آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز مختصر وضاحت کے ساتھ مضمون نگاروں کا تعارف بھی شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں الف بائی ترتیب سے کتاب میں موجود انگریزی کے مصنفین کے ناموں کو بھی لکھا گیا ہے۔ اس کتاب سے متعلق ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ اردو میں اس موضوع کے بنیادی مباحث کو پہلی مرتبہ بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب میں ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو اس تنقیدی دبستان کی بنیاد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس کا دعوی کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ کتاب ماحولیاتی ادبی تنقید پر ایک بنیادی حوالے کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ (۴۷)

مندرجہ بالا بیان کردہ گنتی کے چند مقالے اور یہ بنیادی دو کتب راقمہ کی تحقیق کے مطابق اردو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی تحریریں ہیں۔ جن میں سے ۲۱، ۲۰، ۲۰۱۹ء میں لکھے جانے والے مقالات اور ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کی کتاب واضح طور پر ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہمارے ناقدین اور لکھاریوں کو اس ضمن میں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور ادب میں ایسی تحریروں کی تفہیم اور نئی تحریروں کے لکھے جانے کی ضرورت ہے جو اس کا احاطہ کر سکیں اور چلی آنے والی روایت کو توڑ سکیں۔ ذیل میں اسماعیل میرٹھی کے کلام پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ایک پس منظر سامنے لایا جا سکے کہ اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر کن کن حوالوں سے کیسا کام ہو چکا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کے کلام پر سابقہ تحقیقات کا جائزہ :

اسماعیل میرٹھی کا شمار جدید اردو ادب کے شعرا میں ہوتا ہے۔ جنھیں بیک وقت کئی حیثیتوں سے جانا جاتا ہے۔ انھیں ایک ہمہ جہت شاعر کہا جائے تو بے جانا ہوگا۔ جہاں اردو شاعری میں انجمن پنجاب، جدید نظم یا اردو کے جدید شعرا کا نام لیا جاتا ہے وہیں اسماعیل میرٹھی کا نام بھی شامل ہے۔ ۱۹۱۰ء سے اب تک اسماعیل میرٹھی کی کلیات، ان کے حالات زندگی اور شاعری پر مختلف حوالوں سے تحقیقی و تنقیدی تجزیے و تبصرے ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا کہ اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر کن کن حوالوں سے کام ہو چکا ہے۔

اسماعیل میرٹھی نے اپنی زندگی میں ہی اپنے کلام کو ترتیب دے کر ۱۹۱۰ء میں ایک کلیات شائع کروایا تھا۔ یہ پہلی باران کے کلام کا منظر عام پر آنا تھا۔ اس سے پہلے ان کا کلام بکھری ہوئی صورت میں ملتا ہے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے خلیل الرحمان المعروف سیفی پریمی نے **حیات اسماعیل** کے نام سے مقالہ لکھ کر اپنی پی، ایچ، ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے میں انھیں نے اسماعیل میرٹھی کے حالات زندگی، شاعری میں کیے جانے والے ان کے مختلف تجربوں اور ان کے شاعری کے ادوار کو بلترتیب تقسیم کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اس مقالے میں زیادہ تر ان کے حالات زندگی پر توجہ دی گئی ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۳۹ء میں کتابی صورت میں سامنے آیا۔(۴۸) **نگار** کے ستمبر ۱۹۳۹ء کے شمارے میں نیاز فتح پوری نے اپنا ایک تبصرہ پیش کیا جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ اسماعیل صرف اردو کا شاعر نہیں ہے اس کے ہاں فارسیت بھی ملتی ہے۔ اس کی شاعری کے مزید بھی پہلو ہیں جن پر کام کیا جانا ضروری ہے۔(۴۹) اس کے بعد سیفی پریمی نے ان کے کلیات کو دوبارہ سے موضوعات کے حوالے سے ترتیب دیا اور مختلف حصوں میں ان کی کلیات کو دوبارہ شائع کروایا۔ اس کے تین ایڈیشن شائع کیے گئے۔ پہلے اور دوسرے حصے میں بچوں سے متعلق نظمیں شامل ہیں۔ جب کے تیسرے حصے میں سنجیدہ نظموں کو "جذبات ملی" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن **کلیات اسماعیل حصہ سوم** کے نام سے ۱۹۵۱ء میں سامنے آیا۔ جس میں تینوں حصوں کے مقدمات کو بالترتیب شامل کیا گیا ہے۔(۵۰) اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے شجاعت علی سندیلوی نے **جواہرات اسماعیل** کے نام سے ان کی آسان نظموں کو ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ اس کا مقصد ان کے کلام کو زندہ رکھنا اور عام قاری تک پہنچانا تھا۔ انھیں نے ابتدا میں ان کا تعارف دیتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کو فطرت کا شاعر کہا ہے۔(۵۱) ان کے کلام کو یکجا کیے جانے کے حوالے سے تو کام ہوتا رہا لیکن ان کی شاعری پر کوئی تجزیے یا تبصرے کسی کتابی صورت میں سامنے نہ آ سکے۔ اس حوالے سے پہلا کام ۱۹۸۳ء میں **اسماعیل میرٹھی :ایک مطالعہ** کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کے مصنف سید خاور رضوی نگرامی ہیں۔ انھیں نے اس کتاب میں پہلی بار ان کی زندگی کے

مختلف واقعات اور ان کی نظم و نثر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا۔ اس کتاب میں دو مقدمے لکھے گئے ہیں جن میں مختلف مصنفین کی آرا موجود ہے اور اس بات کو سراہا گیا ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے حوالے سے اس قسم کے کام کی شد ضرورت تھی جسے خاور رضوی نے احسن طریقے سے سرانجام دیا ہے۔ انھیں نے اسماعیل میرٹھی کے زندگی کے ان واقعات کو شامل کیا ہے جس میں ان کی شاعری اپنے رنگ بدلتی ہے۔ ان واقعات کا بیان ہے جس نے ان کی سوچنے کی صلاحیتوں کو بدلا اور جب وہ ان کی شاعری کے موضوعات پر اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں تو انھیں ایک سائنس دان، ماہر طبعیات، ماہر حیوانات، ماہر موسمیات اور دیہی زندگی کی عکاسی کرنے والا شاعر کہتے ہیں۔ جو صرف لفظوں سے وہ مناظر نہیں کھینچتا بل کہ ان میں کھو کر ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پھر اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔ (۵۲)

اسماعیل میرٹھی کے حوالے سے میرٹھ میں چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی کی ایک طالبہ ڈاکٹر شاداب علیم نے بھرپور کام کیا ہے۔ ان کی اسماعیل میرٹھی پر مختلف کتب آچکی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔ جو دراصل ان کے ایم۔اے سے لے کر پی،ایچ،ڈی تک کے مقالات ہیں۔ ان میں میرٹھ کی انیسویں صدی کی تین تاریخ ساز شخصیات: قلق میرٹھی رنج میرٹھی اسماعیل میرٹھی،اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، جدید شاعری کا نکتہ آغاز اسماعیل میرٹھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کی کتب میں اسماعیل میرٹھی بحیثیت ماہر تعلیم (تحقیقی کتاب)،اسماعیل میرٹھی کا فکر و فن (نظمیہ شاعری کے حوالے سے) بھی شامل ہیں۔ شاداب علیم نے اپنے ایم۔اے کے مقالے میں میرٹھ کی تین شخصیات پر کام کیا تھا۔ جن میں رنج میرٹھی، قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی شامل تھے۔ اس تحقیق کے دوران وہ اسماعیل میرٹھی کی ایک اور جہت سے متعارف ہوئیں کہ وہ صرف بچوں کے شاعر نہیں ہیں بل کہ ایک ہمہ صفت اور ہمہ جہت شاعر ہیں۔ اس مقالے میں انھیں نے اس حوالے سے بھی تفصیل سے بات کی ہے کہ نظم جدید کی تحریک کا سہرا جو انجمن پنجاب اور محمد حسین آزاد کے سر باندھا جاتا ہے دراصل اس کی بنیادیں قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی اس سے پہلے ہی ڈال چکے تھے۔ انھیں نے اس بیان کو مختلف مثالوں اور کتابی حوالوں سے ثابت کیا ہے۔ ان کے ایم۔اے کا یہ مقالہ ۲۰۰۵ء میں نظم جدید کی تثلیث کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ (۵۳) اپنے اس تحقیقی کام میں انھیں اسماعیل میرٹھی کے حوالے سے کئی نئے رخ ملے اور انھیں نے اس پہ مزید کام ایم۔فل کے مقالے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ میں کیا ہے۔ اس مقالے میں انھیں نے میرٹھی کو ایک ہمہ جہت شاعر کے طور پر متعارف کروایا ہے اور ان کی شاعری کے حوالے سے لکھی جانے والی مختلف اصناف نظم، غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور

انھیں اس حوالے سے میر ٹھی کے ایک اور رخ کو تلاشا جس میں میر ٹھی کے زبان پر کیے جانے والے تجربات اور ان کی شاعری میں دی جانے والی نئی اصناف کو بھی شامل مطالعہ کیا۔ (۵۴) ان نئے نکات کو انھیں نے اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا۔ ان کے مقالے کا عنوان ''اسماعیل میر ٹھی کی شاعری میں ہیئت و زبان کے تجربات'' تھا۔ جسے کتابی صورت میں ۲۰۱۱ء میں **جدید شاعری کا نقطہ آغاز اسماعیل میرٹھی** کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس مقالے کو پانچ ابواب کی صورت میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں ان کی سوانح، ان کے عہد کے حالات، نظم و غزل میں ہیئت کے تجربات اور اس کی روایت، اسماعیل میر ٹھی کی متعارف کردہ اصناف اور اردو شاعری میں میر ٹھی کے تجربات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ شاداب علیم نے میر ٹھی پہ جو مقالات لکھے ہیں ان میں ان کی شاعری کو ہی زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ انھیں نے اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالے میں تجزیہ کرتے ہوئے میر ٹھی کو ایک فطری شاعر کہا ہے جو ماحول کو انسان سے جدا نہیں کرتا، جو مناظر فطرت کو محض نظاروں کے طور پر نہیں لیتا ہے بل کہ ان میں ڈوب کر انھیں صفحے کا حصہ بناتا ہے۔ اس حوالے سے انھیں نے مختصراً شعری مثالوں کو بھی حصہ بنایا ہے۔ اس مقالے میں مصنفہ نے زیادہ توجہ ان کی شاعری میں ہیئت کے تجربات پر دی ہے۔ (۵۵)

ڈاکٹر ناہید قاسمی نے اپنی کتاب **جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری** میں فطرت نگاری کی تحریک کے حوالے سے بحث کی ہے۔ یہ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ جس میں انھیں نے فطرت نگاری کی تحریک کے شعرا پر بھی روشنی ڈالی ہے اور حالی، آزاد اور اسماعیل میر ٹھی کو ان میں سر فہرست رکھا ہے۔ میر ٹھی کے حوالے سے انھیں نے جو نظریات پیش کیے ہیں ان کے مطابق میر ٹھی ایک فطری شاعری ہیں۔ جو قدرت کے مناظر کو محسوس کرتے ہیں اور انسانوں اور جانوروں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں نے سرسری انداز میں یہ بھی لکھا ہے کہ میر ٹھی بیک وقت ماہر نفسیات، ماہر حیوانیات، ماہر موسمیات اور ایک کامیاب فطرت نگار بھی ہیں۔ مصنفہ نے اس حوالے سے زیادہ کام اس تحریک کے آغاز اس کی وجوہات پر کیا ہے۔ جس میں شعرا کی چند شعری مثالوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ (۵۶)

سلام سندیلوی کی کتاب **اردو شاعری میں منظر نگاری** فطرت نگاری اور منظر نگاری کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے جو ۱۹۶۷ء میں کتابی صورت میں سامنے آئی۔ اس میں انھوں اسماعیل میر ٹھی کو بہترین منظر نگار کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ ان کی شاعری میں جتنے بھی مناظر فطرت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ان کا ذکر یا ان کی نشاندہی کرنا نہیں ہے بل کہ انھوں نے ہر منظر کو اور ہر قدرتی بیان کو ویسا ہی پیش کیا ہے جیسا وہ اپنی اصل حیثیت رکھتا ہے۔ اس حوالے

سے قدرت کے ساتھ ان کا لگاؤ اور ان کا گہرا مشاہدہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ان کی شاعری میں ہندوستان کی روح سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ فطرت کو ذی روح ہی نہیں بل کہ ناطق بھی تصور کرتے ہیں جو اپنا ہونا بتاتی ہے۔ (۵۷) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو کی جلد چہارم میں ''جدید دور کے ارتقا'' کے عنوان سے فصل چہارم میں اسماعیل میرٹھی کے کام پر بحث کی ہے۔ انھیں نے میرٹھی کی شاعری کو اخلاق درست کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ میرٹھی کے ابتدائی حالات ان کی نثری و شعری کتب کا مختصر احوال بھی بیان کیا ہے۔ وہ ان کی نظموں کو (نیچرل شاعری) کے نمونے اور ان کی غزلوں کو اخلاقی تصور کی غزلیں قرار دیتے ہیں۔ ان کی شاعری گویا پوری قوم سے ایک خطاب ہے۔ انھیں نے اسماعیل میرٹھی کی منتخب شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ہی شعری نمونے بھی دیے ہیں۔ وہ انھیں ایک نیچرل شاعر کے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔ (۵۸) ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اسماعیل میرٹھی کو بچوں کی نظموں کے حوالے سے ایک لاجواب شاعر مانتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں مصلح قوم اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی کرنے والا شاعر بھی کہتے ہیں۔ انھیں نے اصلاحی نظمیں بھی لکھیں۔ سلاست و روانی کے ساتھ غزل بھی کہی مگر جو شہرت انھیں بچوں کے شاعر ہونے کے حوالے سے ہے وہ قابل تعریف ہے۔ (۵۹) رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کی کتاب تاریخ ادب اردو میں میرٹھی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر مختصر بات کی ہے۔ وہ انھیں ایک بہترین نثر نگار اور شاعر مانتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے انھیں ایک صوفی طرز کا اخلاقی شاعر کہا ہے جس کی مثالیں ان کی غزلوں کی صورت میں ملتی ہیں۔ ان کے نزدیک میرٹھی نے اپنی شاعری میں قدیم و جدید دونوں رنگوں کو شامل کیا ہے۔ (۶۰)

اردو ادب کی تحریکیں میں انور سدید نے اسماعیل میرٹھی کا ذکر انجمن پنجاب کی تحریک میں کیا ہے۔ انھیں نے میرٹھی کو ان شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جو قومی و تعلیمی مقاصد میں پیش پیش تھے۔ ان کے مطابق میرٹھی نے نئی نظم کو ارتقا کے اگلے پڑاؤ پر ڈالا اور شاعری میں نئے نمونے پیش کیے۔ (۶۱) مولانا نعیم الاسلام قادری نے اپنی مرتبہ کتاب نگارشات میں ایک طویل مضمون" مولانا اسماعیل میرٹھی اور ان کی شعری و ادبی خدمات" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے اسماعیل میرٹھی کا جامع تعارف بیان کیا ہے جس میں ان کی پیدائش، تعلیم و ملازمت سب کو پیش نظر رکھا ہے دوسرے حصے میں ان کی شاعری کے مختلف موضوعات کو شعری مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مضمون کے دوسرے حصے میں نظم جدید پر بات کرتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کو صف اول کے شعرا میں بیان کیا ہے۔ ان کی دیہی

شاعری، صوفیانہ واخلاقی شاعری، اور نیچرل شاعری کو نمایاں دکھایا ہے۔ جس میں وہ ماحول سے قریب ترین شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا یہ تحقیقی مضمون اسماعیل میرٹھی کی شعری جہات پر جامع حیثیت رکھتا ہے۔ (۶۲)

۲۰۰۳ء میں نور احمد صدیقی کی ایک کتاب تذکرہ شعرائے میرٹھ سامنے آئی۔ اس تذکرے میں میرٹھ کے شعرا پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے کی جانے خدمات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے حوالے سے نور احمد صدیقی نے جو باب لکھا ہے اس میں انھیں نے اسماعیل میرٹھی کے کام اور ان پر لکھی جانے والی کتب کا ایک مختصر خاکہ کھینچا ہے۔ ساتھ ہی انھیں نے اسماعیل میرٹھی سے متعلق مختلف مصنفین اور ناقدین کی آرا کو زینت بنایا ہے۔ کتابی حوالوں کے ساتھ جو نام دیے ہیں ان میں شبلی نعمانی، مالک رام، انور سدید، سید اعجاز حسین، عبد القادر سرمدی، حامد حسن قادری، عبد الوحید، علی جواد زیدی، حسن الدین احمد، وزیر آغا، سعد اللہ، نیاز فتح پوری اور شیخ عبد القادر جیسے مصنفین کی آرا کو شامل کیا ہے۔ (۶۳) جدید نظم حالی سے میرا جی تک میں کوثر مظہری نے مختلف شعرا کی منتخب نظموں کا تجزیہ کیا ہے۔ انھیں نے اسماعیل میرٹھی کو مختصر اور جامع انداز میں بحیثیت شاعر کے متعارف کروایا ہے۔ جس کی ابتدا انھیں نے ان کی غزلوں سے کی ہے۔ اگرچہ میرٹھی کو غزل گو شاعر کی حیثیت سے اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن ان کی غزلوں کے مضامین انھیں ممتاز بناتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں تصوف کے تمام عناصر کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ملک کی اشیاء اور مناظر قدرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ ان کے منظوم تراجم نے اردو شاعری میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ صرف بچوں کے شاعر نہیں ہیں بل کہ اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزلوں کا ایک نیا رخ سامنے لایا گیا ہے۔ (۶۴) نصرت شمسی کی ایک کتاب بچوں کے شاعر اسماعیل میرٹھی جو ۲۰۱۶ء میں سامنے آئی اس کتاب کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس میں جن سولہ نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے ان کی تشریح روایتی تشریحات سے ہٹ کر ہے اور انھیں کہانیوں کی صورت دے کر بچوں کو ان کے ارد گرد کے ماحول اور دیگر مخلوقات سے بہتر رویہ اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ (۶۵) اسماعیل میرٹھی کے کلام کے حوالے سے مختلف تاریخ کی کتب، اردو شاعری پر لکھی جانے والی کتب، جدید اردو نظم پر لکھی جانے والی کتب، انجمنِ پنجاب کی ذیل میں لکھی جانے والی کتب وغیرہ میں اسماعیل میرٹھی کا ذکر لازمی حوالے کے طور پر ملتا ہے ان کا الگ الگ حوالہ دینا ضروری خیال نہیں کیا گیا۔ انھی کتابوں کو مختصراً بیان کیا گیا ہے جن میں اسماعیل میرٹھی کو بطور خاص مد نظر رکھتے ہوئے ان کے کام پر تنقید کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام کے کس کس پہلو کو کن کن حوالوں سے دیکھا گیا ہے۔ مختلف مقالہ جات، تواریخ اور تنقیدی کتابوں کے علاوہ اسماعیل میرٹھی اور ان کی شاعری کے حوالے سے مختلف

رسائل اور آن لائن ویب سائٹس پر بھی مقالے لکھے گئے ہیں۔ ''بچوں کا مقبول ترین شاعر اسماعیل میرٹھی''، ''مولوی اسماعیل میرٹھی''، ''بچوں کے ادیب اسماعیل میرٹھی''، ''جدید ذہن کا قدیم شاعر: اسماعیل میرٹھی''، ''بچوں کی شاعری اور اسماعیل میرٹھی'' ''مولانا اسماعیل میرٹھی اور ان کی شعری و ادبی خدمات''، اسماعیل میرٹھی بحیثیت موضوعاتی شاعر'' وغیرہ شامل ہیں۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۷ء میں ''بچوں کی شاعری کے امتیازات اور اسماعیل میرٹھی'' کے عنوان سے اردو اکادمی دہلی کی زیرِ اہتمام ایک توسیعی خطبہ ہوا جس میں علی احمد فاطمی نے ان کی بچوں کی شاعری اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ بچوں کے مقام پر جا کر ان کو سمجھنے اور ان کے ادب پر لکھنے والوں کو بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ میرٹھی کو یاد رکھنے اور ان کے کام کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ (۶۶) میرٹھ میں ۸ فروری ۲۰۱۸ء میں ''اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے سے'' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں اسماعیل میرٹھی کے عہد اور ان کی شاعری کے حوالے سے بھرپور مقالات پڑھے گئے۔ جن کے عنوانات میں ''اسماعیل میرٹھی: عالم و معلم، تربیت اطفال اور اسماعیل میرٹھی، پن چکی کا تنقیدی جائزہ، اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ترقی پسند عناصر، اسماعیل میرٹھی اور بچوں کی نفسیات، اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں سائنسی حقائق'' شامل ہیں۔ (۶۷)

چند تحریریں ایسی بھی ہیں جن میں راقمہ کو یہ اشارے ملے کہ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا ماحولیاتی مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ صبیحہ ناہید نے اپنے مقالے ''ہمہ جہت شاعر اسماعیل میرٹھی'' میں میرٹھی کو ایک ہمہ صفت اور ایک ہمہ جہت شخصیت کا حامل شاعر کہا ہے۔ جو ایک انقلابی ذہن رکھتے ہیں اور پرانی روایات سے انحراف کرتے ہیں۔ انھیں نے قلق میرٹھی کے انگریزی ترجموں سے متاثر ہو کر چند نظموں کی تراجم بھی کیے۔ انھیں نے کائنات کو صرف ایک شاعر کی نگاہ سے ہی نہیں دیکھا بل کہ ایک سائنسی مفکر کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ ان کے ہاں حقیقی فطرت نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ (۶۸) وسیم حسن راجا نے اپنے مقالے ''اسماعیل میرٹھی بحیثیت موضوعاتی شاعر'' میں ان کو ایک ہمہ جہت شاعر کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ جو ایک فطری شاعر تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی وہ ایک ایسا شاعر بھی ہے جو جدید سائنسی ترقی اور نظریات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔ انھیں نے اپنی شاعری کے ذریعے کائنات کی بکھری ہوئی خدا کی مخلوق اور مناظر فطرت سے جو پیغام دینا چاہا ہے وہ مسلم قوم کی مشاہداتی اور حسیاتی و ادراکی صلاحیتوں کو نکھارنے کا عمدہ طریقہ ہے۔ (۶۹) رئیسہ پروین اپنی تحریر ''اسماعیل میرٹھی'' میں ان کی شاعری کو تاریخی، قومی، سماجی، اخلاقی، علمی، نیچرل اور متصوفانہ مضامین کی شاعری کہتی ہیں۔ ساتھ ہی انھیں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ میرٹھی کی شاعری میں صرف تاثرات کی عکاسی نہیں ملتی بل کہ ان کا سائنسی نقطہ نظر بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظموں میں جدید سائنس کے نقطہ نظر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اب

وہ کیا جھلکیاں ہیں یا کس طرح کی ہیں ان کا کوئی بیان نہیں کیا گیا ہے۔ گویا ایک سوال چھوڑ دیا گیا ہے۔ (۷۰) علی احمد فاطمی نے اپنے ایک مقالے ''بچوں کی شاعری اور اسماعیل میرٹھی کی شعری جہات'' میں میرٹھی کی شاعری کا باریک نظر سے جائزہ لیا ہے۔ جس کا آغاز انھیں نے ایک سوال سے کیا ہے کہ کیا اسماعیل میرٹھی صرف بچوں کے شاعر ہیں؟ اسی کے پیش نظر انھیں نے ایک تفصیلی بحث کی ہے۔ اس دور کے دیگر شعراء کے ساتھ تقابل، ان کی شاعری میں ہیت کے تجربات، اخلاقی و متصوفانہ موضوعات، فطرت سے ان کا لگاؤ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک میرٹھی نے مظاہر فطرت کو اس طرح پیش نہیں کیا ہے جس طرح دیگر شعراء نے باقاعدہ ایک تحریک کے زیر اثر اسے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ میرٹھی نے قطرے کو صرف بارش کا قطرہ نہیں کہا ہے بل کہ اس کا انسان سے تعلق جوڑا ہے۔ یعنی وہ مظاہر قدرت اور انسان کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ فطرت سماجی حقیقت سے رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ علی فاطمی کے نزدیک ایسی شاعری کو نیچرل شاعری کہنا قدرے مشکل ہے۔ ان کی شاعری کو نئے سرے سے پہچاننے کی ضرورت ہے۔ (۷۱)

۵ دسمبر ۲۰۱۹ء کو ماہنامہ اردو دنیا میں شائع ہونے والے مقالے "مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور" میں حقانی القاسمی نے میرٹھی کے شعری سفر اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مقالے میں نہ صرف اسماعیل میرٹھی کے شعری سفر کی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے بل کہ ان کے اس میدان میں کیے جانے والے مختلف ہیتی تجربوں کو بھی مثالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جو بنیادی نکتہ مقالہ نگار نے بیان کیا ہے وہ اسماعیل میرٹھی کے ماحولیاتی شعور کے حوالے سے ہے۔ جہاں انھوں نے ہیت کی سطح پر مختلف تجربات کیے ہیں وہیں ان کی شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے بھی وسعت پائی جاتی ہے۔ زمین و زماں اور مکین و مکاں کے اعتبار سے بہت سے مسائل ان کی شاعری کا حصہ بن چکے ہیں انھوں نے فرد اور فطرت کے مابین حیاتیاتی رشتے کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ زمین اور اس کے متعلقات سے ان کی شاعری جڑی ہوئی ہے۔ جس کو انھوں نے نظموں کی صورت بیان کیا ہے۔ مقالہ نگار نے شعری مثالوں کے ذریعے سے ان کے ماحولیاتی شعور کے نمونے پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ان کے متن کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید میں دیہی مناظر اور مظاہر بہت اہمیت کے حامل ہیں اور مولانا کی بہت سی نظمیں دیہی تناظر میں ہیں۔ ۔۔۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا ماحولیات مرکوز شاعری کا مطالعہ Ecological perspective میں کیا جائے تو بہت سی نئی طرفیں سامنے آئیں گی۔ یہ فطرت سے مربوط شاعری ہے۔ جس میں فطرت کے تئیں انسان کے رویے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ (۷۲)

مندرجہ بالا بیان کردہ وہ مقالات جس میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی طرف اشارے دیے گئے ہیں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے اس خلا کی طرف نشاندہی کرواتے ہیں کہ ان کے کلام کا یہ مطالعہ بھی کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے مجوزہ تحقیق اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے ماحولیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ جس سے میرٹھی کی شاعری کو ایک نئے نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا نیز ان کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کا بھی مطالعہ کیا جائے گا۔ ذیل میں اس طریقہ کار کی وضاحت پیش کی جاتی ہے جس کو مد نظر رکھتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے گا۔

طریقہ تحقیق وفریم ورک:

مجوزہ تحقیق کے مطالعے / تجزیے کے لیے آنے والے ابواب میں جو طریقہ کار استعمال کیا جائے گا اس میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کا تجزیہ کرنے کے لیے ناصر عباس نیر کے ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق اٹھائے گئے بنیادی سوالات کو مدِ نظر رکھا جائے گا نیز ماحولیاتی مطالعے کے ساتھ نوآبادیاتی دور کے اس پس منظر کو بھی مد نظر رکھا جائے گا جو سرمایہ درانہ ذہنیت لیے ہوئے اس نظام کو متاثر کرنے کا باعث بنا جس کے مابعد اثرات آج ہم ماحولیاتی نظام میں بگاڑ کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ ماحولیاتی تنقید کے سوالات راقمہ نے ان کے مقالے ''ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں'' سے لیے ہیں ۔ یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں پہلا حصہ ماحولیاتی تنقید پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں انتظار حسین کے افسانوں کو اس نظریے کی ذیل میں دیکھا گیا ہے۔ پہلا حصہ اس نظریے کے بنیادی نکتے سے شروع ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ نظریہ بشر مرکزیت کے نظریے کو رد کرتا ہے اور ارض مرکز کو اہمیت دیتا ہے۔ جس کے مطابق صرف انسان اس کائنات کا مرکز نہیں ہے بل کہ زمین کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بنیاد کو مثالوں کے ساتھ واضح کرتے ہوئے ناصر عباس نیر نے ماحولیاتی تنقید کے بنیادی سوال بیان کیے ہیں جس پر اس نظریے کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ راقمہ نے ان سوالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا مطالعہ کرنا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے بڑے اور بنیادی سوالوں میں:

۱: ادب میں ماحول کی ترجمانی کیسے کی گئی ہے؟ کس طرح فطرت کے مناظر پہاڑ، ندی، بادل، بارش، پرندوں اور جانوروں کو شاعری یا فکشن میں پیش کیا گیا ہے؟

۲: فطرت کو لاحق خطرات کا بیان ادب میں کس طور کیا گیا ہے؟ آلودگی کی جملہ اقسام کے اسباب اور انسانی صحت پر

اس کے اثرات کو ادب میں کیوں کر موضوع بنایا گیا ہے؟

۳: فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمہ داریوں کو تخلیق کاروں نے بیان کیا ہے یا ان سے پہلو تہی کی ہے؟(۴۳)

ناصر عباس نیر ان سوالات کے ذریعے ماحولیاتی ادبی تنقید کے بنیادی نظریات کو سامنے لانے اور انھیں ادب میں تلاش کرنے کی جانب متوجہ کروایا ہے۔ یہ سوالات ادب میں اس نظریے کی تلاش میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے علاوہ بھی تین ایسی بنیادیں موجود ہیں جو ادب میں فطرت کے اظہار کی مختلف صورتوں کو دیکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد صرف سرسری معلومات فراہم کرنا نہیں ہے بل کہ ان صورتوں کو ان کی اصل کے ساتھ ادب میں تلاش کرنا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے تحت جو مطالعات کیے جاتے ہیں ان میں فطرت کے اظہار کی صورتوں کو تلاشنے کے لیے ان بنیادی نکات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے جن میں:

۱: فطرت کی طرف پلٹنے کی آرزو

۲: فطرت سے ہمدردی و ہم دلی

۳: فطرت کے بقا کی سعی و خواہش(۴۴)

شامل ہیں۔ ان تمام بنیادی سوالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور ان کی ادب میں مختلف صورتوں کو دیکھتے ہوئے آنے والے ابواب میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اسماعیل میرٹھی نے اپنی شاعری میں ان مظاہر فطرت کو اپنی اصل کے ساتھ بیان کیا ہے یا ان سے پہلو تہی کی ہے۔

ناصر عباس نیر کے ان سوالات کے ساتھ ساتھ اس مطالعے میں ماحولیاتی ادبی نقاد اور ناروے کے فلاسفر آرنی نائیس(Arne Naess ۱۹۱۲ء۔۲۰۰۹ء) کے تنقیدی نظریات کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔ جو اس نئے تنقیدی نظریے کی بنیاد رکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ماحولیات سے متعلق گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ آرنی نائس نے اپنی تحریر میں پہلی بار فلسفہ ماحولیات کی اصطلاح کو متعارف کروایا تھا۔ انھوں نے اپنے نظریات میں انسان اور ماحول کے گہرے رشتے کو واضح کیا ہے۔ ان کے بنیادی تنقیدی نظریات آٹھ نکات پر مشتمل ہیں لیکن مجوزہ تحقیق کے لیے آنے والے ابواب میں ان کے چھ سوالات کو مد نظر رکھا جائے گا جو درج ذیل ہیں:

۱: کرہ ارض پر موجود انسانی اور غیر انسانی ہر قسم کی حیات کی بقا و فروغ فی ذاتہ قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ غیر انسانی حیات انسانی حیات کے لیے فائدہ بخش ہے یا نہیں۔

۲: زندگی کی مختلف انواع (forms) کی کثرت تہہ بہ تہہ تنوع نہ صرف مذکورہ بالا قدر و قیمت کے اثبات کا ذریعہ ہے بل کہ بذات خود بھی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

۳: انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اشد ضرورت کے علاوہ، اس کثرت اور تنوع کو کم کریں یا اسے نقصان پہنچائیں۔

۴: انسانی حیات اور کلچر کی بقا اور ارتقا انسانی آبادی کی کمی سے مشروط ہے اور غیر انسانی حیات ایسی کمی کی متقاضی ہے۔

۵: غیر انسانی دنیا میں موجود انسانی مداخلت ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور یہ صورت حال روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔

۶: جو لوگ ان مذکورہ بالا نکات سے متفق ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کریں تاکہ مطلوبہ تبدیلی پیدا کی جا سکے۔

ان نظریات کو دیکھا جائے تو ان میں آرنی نائس کا ماحولیاتی نظام سے جڑا ایک گہرا مطالعہ دکھائی دیتا ہے۔ اپنے ان ماحولیاتی تنقیدی نظریات کو انھوں نے اپنی کتاب میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ نائس کے یہ نظریات ماحولیاتی نقصان پر نہ صرف اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں بل کہ اس رشتے/تعلق کو بھی واضح کرتے ہیں جو انسان اور ماحولیاتی نظام کے ساتھ ایک ان دیکھی ڈور سے جڑا ہے۔ انھوں نے اس نظریے میں موجود ماحولیاتی نقصانات پر نہ صرف اپنا تجزیہ پیش کیا ہے بل کہ انسان اور ماحول کے گہرے رشتے کو بھی واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کی کوئی بھی شکل چاہے وہ جس بھی حالت میں ہو آپس میں جڑی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں بھی کیا جاتا ہے جنھوں نے Love for nature Safe the nature, کے نعرے کا ساتھ دیا۔(۷۵)

ان تمام نظریات کو دیکھا جائے تو اس حوالے سے اردو میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا ایک مضمون موجود ہے جس میں انھوں نے اسی نظریے سے ملتے جلتے خیالات پیش کیے ہیں۔ راقمہ نے اس مضمون میں سے ان بنیادی نظریات کو نکال کر آٹھ نکات کی صورت میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اگر انھیں اردو میں ماحولیاتی تنقیدی مطالعات کے لیے فریم ورک کے طور پر لیا جائے تو کسی بھی متن کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کا یہ مضمون ان کی کتاب اسلام پاکستان اور مغرب میں "اکیسویں صدی کے ماحولیاتی مسائل: اسلامی تناظر" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس مضمون کا آغاز انھوں نے چند سوالات سے کیا ہے اور پھر اس کے جواب میں وہ کہتی ہیں کہ ہم ایک خوف میں مبتلا ہیں۔ کہیں ہمارے قدرتی وسائل کوئی لے نہ جائے، کہیں ہماری نسلیں بھوکی نہ مر جائیں، کرہ ارض آبادی کی وجہ سے تنگ پڑتا جا رہا ہے، سانس لینا دشوار تک ہوتا جا رہا ہے، ہم انھی خوف میں مبتلا ایک ایسی دنیا بسانے کے چکر میں جٹ گئے ہیں جہاں سب سہولیات ہوں اور

اس دوران ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم اپنی آسانی کے لیے دوسروں کا کتنا نقصان کر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کو قرآنی حوالوں اور حضورؐ کے فرامین کی مثالوں کے ساتھ بھی پیش کیا ہے۔ اس جانب توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ ماحول کی حفاظت میں ہی ہماری بقا پوشیدہ ہے۔ ذیل میں ان بنیادی نکات کو پیش کیا جاتا ہے:

۱: اکیسویں صدی کا ترقی یافتہ انسان اس قدر نا سمجھ نکلا ہے کہ خوف کی زنجیر میں لپٹ کر دوسروں سے کٹ کر، خود کو محفوظ کرنے کے کارِ زیاں میں الجھا ہوا ہے اور اس بات کا ادراک نہیں کر پا رہا ہے کہ کرہ ارض پر، اس پوری کائنات میں، اس تمام تر عالمِ کون و مکاں میں کوئی بھی تنہا، علیحدہ اور کٹا ہوا نہیں ہے۔

۲: اشرف المخلوقات ہونے کا ایک لازمہ یہ بھی ہے جو بقائے باہمی کے تعلق سے جڑا ہے۔ یہ بقائے باہمی انسان اور انسان کے درمیان نہیں بل کہ انسان اور کرہ ارض کی دیگر مخلوقات کے درمیان ہے۔

۳: انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسے دیگر تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے لیکن اس فضیلت کا اظہار دیگر مخلوقات کے استحصال سے نہیں، ان کے تحفظ اور دیکھ بھال سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ عالم فطرت کا نگہبان اور رکھوالا ہے، غاصب اور مطلق العنان حکمران نہیں۔

۴: انسان اپنی بقا کے لیے دیگر تمام مخلوقات سے جڑا ہوا ہے۔ زندگی کا چکر رواں دواں رکھنے کے لیے صرف اپنی نوع کا بقا ضروری نہیں ہے بل کہ دیگر انواع کے ساتھ بقائے باہم کا رشتہ قائم رکھنا بھی لازمی ہے۔

۵: انسان اور دیگر تمام جاندار اپنے گردوپیش کے ماحول، اپنے محل وقوع سے ایک زندہ اور دو طرفہ رشتے کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتہ کسی جدید یا مابعد جدید فہم و بصیرت کا محتاج نہیں بل کہ ہماری قدیم کلاسیکی زبان کے ادب میں بھی انسان اور عالمِ فطرت کے رشتے کو بڑی گہرائی سے سمجھا اور بیان کیا گیا ہے۔

۶: قرآن میں انسان اور کائنات کو ایک دوسرے کا مدمقابل نہیں، ایک دوسرے کے اثبات، ایک دوسرے کی بقا اور ارتقا کا ضامن ٹھہرایا گیا ہے۔

۷: زندگی کے چکر کو رواں دواں رکھنے کے لیے انسان ہی نہیں، درندے، چرندے، کیڑے مکوڑے، پرندے، آبی حیات غرض ہر نوع کی اپنی اہمیت ہے اور وہ حیات کے قیام و تحفظ میں اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

۸: ماحولیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ جب تک تمام انواع میں توازن قائم نہیں رہے گا، تب تک زندگی کا چکر، یہ سائکل مکمل نہیں ہوگا۔ (۷۶)

ان بنیادی نکات کو دیکھا جائے تو ماحولیاتی ادبی تنقید کے نظریات بھی انھی سے ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ کسی بھی ماحولیاتی شعور رکھنے والے مصنف سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ان مسائل کو ادب میں اجاگر کرے اور ان چیزوں کی طرف توجہ دلائے جو ان مسائل کی جڑ ہیں۔ انسان کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس ماحول کا ایک حصہ ضرور ہے اس کا مالک نہیں لہذا اپنے گرد پھیلے اس شش جہاتی قدرتی نظام سے اتنا ہی فائدہ اٹھائے جتنی اس کی ضرورت ہے۔

ان تمام تر بیان کردہ سوالات اور بنیادی نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے زیر نظر تحقیق میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا تجزیہ آنے والے ابواب میں کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کس حد تک ان نکات کا احاطہ کرتی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں فطرت کی طرف پلٹنے یا عالمِ فطرت سے رجوع کرنے کی خواہش جو انجمنِ پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں میں پروان چڑھی، دراصل کن محرکات کے تحت پیدا ہوئی۔ سرکاری سرپرستی میں فروغ پانے والی شاعری کیوں مخصوص موضوعات کا مطالعہ کرتی ہے اور ان منتخب موضوعات پر مرکوز ہونے سے نو آبادیاتی حکومتیں کیا فوائد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے انیسویں صدی کے نو آبادیاتی طرزِ حکمرانی اور اس کے تحت قائم کیے جانے والے سماجی ڈھانچے کو بھی اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے تجزیے میں مد نظر رکھا جائے گا۔

حواشی و حوالہ جات

۱: سلام سندیلوی، اردو شاعری میں منظر نگاری (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو۔ ۱۹۶۸ء)، ص ۲۱-۲۹۔

۲: ناہید قاسمی، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۔

۳: ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۵۹۔

۴: ایضاً، ص ۲۹۸۔

۵: الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری (لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۰۱ء) ، ص ۴۵۔

۶: جے۔ ایل چیپ مین اور ایم۔ جے ریائس، *Ecology,principles and applications* (کیمبرج: یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۔

۷: ایس۔ وی۔ ایس رانا، *Essentials of Ecology and Environmental Science* (نئی دہلی: جے پرنٹ بیک پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۹ء) ، ص ۱۔

۸: جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء) ، ص ۶۴۲۔

۹: وہاب اختر عزیز، ڈکشنری آف سائنس (لاہور: اظہر پبلی شرز، س ن)، ص ۲۵۹۔

۱۰: این۔ ایس سبرا ہمنیم اور اے۔ وی سمبا مورتی، *Ecology* (نیو دہلی: نارو سا پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۔

۱۱: ولیم ہاؤورتھ "Some principles of Ecocriticism"، مشمولہ: *The Ecocriticism Reader*، (مرتبہ) شیرل گلاٹ فیلٹی، ہیرولڈ فروم (لندن: جارجیا پریس، ۱۹۹۶ء)، ص ۶۹۔

۱۲: ناصر عباس نیر، " ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں"، مشمولہ: تحقیق نامہ، ش ۱۶ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء) ، ص ۲۶۔

۱۳: شیرل گلاٹ فیلٹی، "Literary studies in age of Environmental crisis" مشمولہ: *The Ecocriticism Reader*، (مرتبہ) شیرل گلاٹ فیلٹی، ہیرولڈ فروم (لندن: جارجیا پریس، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۸۔

۱۴: ڈریک گلیڈوِن(Derek Gladwin)، "ایکو کرٹی سزم"،
http//www.oxfordbibliographies.com.، تاریخ ملاحظہ: ۲۶ جولائی ۲۰۱۷ء۔

۱۵: کیرن رابر(Karen Raber)، “Recent ecocritical studies of English renaissance
literature”، www.asle.org/essays۔

۱۶: ناصر عباس نیر، " حرفِ اول"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)، (مترجم)
اورنگزیب نیازی(لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص۵۔

۱۷: قاسم یعقوب، " ادب اور فطرت ماحولیاتی تناظرات"، مشمولہ: معیار، ج۲۲(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء)، ص۲۴۳۔

۱۸: اورنگزیب نیازی، "ماحولیاتی تنقید پس منظر، آغاز و امتیازات"، مشمولہ: بنیاد، ج۱۰(۲۰۱۹ء)، ص۱۶۔

۱۹: اورنگزیب نیازی(مترجم)، ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)
(لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص۲۳۵۔۲۳۷۔

۲۰: نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ (دہلی: ایجوکیشنل
پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۶ء)، ص۴۲۔

۲۱: اورنگزیب نیازی، "ماحولیاتی تنقید پس منظر، آغاز و امتیازات"، مشمولہ: بنیاد، ج۱۰(۲۰۱۹ء)،
ص۱۱۔۲۵۔

۲۲: قاسم یعقوب، " ادب اور فطرت ماحولیاتی تناظرات"، مشمولہ: معیار، ج۲۲(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء)، ص۲۴۱۔۲۴۳۔

۲۳: رباب رضوی، " انسان اور ماحول ایک جغرافیائی مطالعہ " ، مشمولہ: قومی زبان، ج۵۷، ش۸ (جون، ۱۹۸۶ء) ،
ص۶۳تا۶۸۔

۲۴: عتیق اللہ، " پروین شیر کی شاعری ایک ماحولیاتی مطالعہ "، مشمولہ: جدید ادب، ش۱۸ (۲۰۱۱ء) ۔

۲۵: مولا بخش، " ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ " ، مشمولہ: ہمارا ادب(۱۴ء-۲۰۱۳ء)، ص۱۳۳تا۱۷۲۔

۲۶: مولا بخش، " مراثیِ انیس اور ماحولیاتی تنقید" ، مشمولہ: انیس اور انیس شناس، (مرتبہ) حسن مثنیٰ (دہلی: حسامی بک
ڈپو، ۲۰۱۳ء) ، ص۱۹۱تا۲۰۸۔

۲۷: ضیاء الحسن، " اردو ادیبوں کا فطرت سے بدلتا ہوا تعلق: چار صدیوں کے تناظر میں" ، مشمولہ: بنیاد، ج۶
(۲۰۱۵ء) ، ص۳۷۷تا۳۹۰۔

۲۸: سبین علی، ”اداریہ: ماحولیاتی ادب و تنقید“، مشمولہ: دیدبان، ش۳(۲۰۱۶ء)۔

۲۹: شیخ عقیل احمد، "قدیم ہندوستانی فلسفہ اور کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے"، مشمولہ: الماس، ش۱۹ (۲۰۱۷ء)، ص۷تا۲۱۔

۳۰: صوفیہ یوسف، " حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید"، مشمولہ: الماس، ش۱۹ (۲۰۱۷ء)، ص۸۹تا۹۵۔

۳۱: سرور غزالی، " اردو ادب میں فطری ماحول کے اثرات" ، دھنک (لندن)، http//www.dhanaklondon.com، تاریخ ملاحظہ: ۲۰۱۸ء۔۱۲۔۱۵۔

۳۲: ناصر عباس نیر، " ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں" ، مشمولہ: تحقیق نامہ، ش۲۱ (جولائی تا دسمبر، ۲۰۱۷ء)، ص۱۶تا۳۶۔

۳۳: طارق ہاشمی، " عصری نظم اور ماحولیاتی مسائل"، مشمولہ: خیابان، ش۳۸ (جنوری تا جون، ۲۰۱۸ء)، ص۴۱تا۵۱۔

۳۴: احمد سہیل، "ماحولیاتی ادبی تنقید کا نظریہ اور اردو شاعری"، https://www.punjnud.com، (۲۰۱۸ء)۔

۳۵: الیاس بابر اعوان، " تناظر: ایک ماحولیاتی تنقیدی تجزیہ"، مشمولہ: سہ ماہی کارواں، ج۴۶، ش ۱ (جنوری تا مارچ، ۲۰۱۸ء)، ص۱۴تا۲۱۔

۳۶: آرزو چفت سورین، " یشار کمار کے ناول سمندر میں ماحولیات کے مسائل"، مشمولہ: الماس ،ش۲۰ (۲۰۱۸ء) ، ص۷۱تا۷۶۔

۳۷: ذکیہ رانی، " مولانا الطاف حسین حالی کے تین نکات کا ماحولیاتی تناظر اور انجمنِ پنجاب کے مناظمے (تجزیاتی مطالعہ)"، مشمولہ: زبان و ادب، ش۲۴ (جنوری تا جون، ۲۰۱۹ء) ، ص۴۹تا۵۹۔

۳۸: شگفتہ حسین، " طاہرہ اقبال بحیثیت ایکو فیمنسٹ"، مشمولہ: جرنل آف ریسرچ، ج۳۸، ش۱ (جولائی، ۲۰۱۹ء) ، ص۳۴تا۴۶۔

۳۹: اورنگزیب نیازی، " ماحولیاتی تنقید: پس منظر، آغاز اور امتیازات"، مشمولہ: بنیاد، ج۱۰ (۲۰۱۹ء) ، ص۱۱تا۲۵۔

۴۰: قاسم یعقوب، " ادب اور فطرت: ماحولیاتی تناظرات" ، مشمولہ: معیار، ج۲۲ (جولائی دسمبر ۲۰۱۹ء)، ص۲۳۵تا۲۴۶۔

۴۱: یوسف نون، "عبدالباسط دے افسانیاں دا ماحولیاتی، سماجی، ثقافتی تے تہذیبی تناظر"، http//Incubator.wikimedia.org/wp/skr، تاریخ ملاحظہ: ۱۶ جولائی ۲۰۲۰ء۔

۴۲: سید کاشف علی شاہ اور رخشندہ مراد، " ماحولیاتی انصاف اور مجید امجد کی شاعری (ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ)، مشمولہ: الماس، ج ۲، ش۲۳ (۲۰۲۰ء) ، ص۶۶-۸۱۔

۴۳: خورشید عالم اور حماد نذیر، The Politics of Environmentalism: An Ecological Study of "Twilight in Delhi"، مشمولہ: بازیافت، ج۳۲، ش۱ (۲۰۱۸ء)، ص۱۵-۲۵۔

۴۴: اورنگزیب نیازی، "ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ"، مشمولہ: تاریخ ادب اردو، ج۳، ش۱، ص۸-۱۷۔

۴۵: اورنگزیب نیازی، "مجید امجد کی نظمیں: ایک ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ"، (https:/balagh18.com)، تاریخ ملاحظہ: ۲۳جون ۲۰۲۱ء۔

۴۶: نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۶ء)۔

۴۷: اورنگزیب نیازی، ماحولیاتی تنقید: نظریہ و عمل (منتخب مضامین) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)۔

۴۸: سیفی پریمی، اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات (دہلی: مکتبہ جامع لمٹیڈ، ۱۹۷۴ء)۔

۴۹: نیاز فتح پوری، "حیات وکلیات اسماعیل میرٹھی"، مشمولہ: نگار، ج۳۶، ش۳ (ستمبر ۱۹۳۹ء)، ص۴۷۔

۵۰: سیفی پریمی، کلیات اسماعیل (حصہ سوم) (لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۱ء)۔

۵۱: شجاعت علی سندیلوی، جواہرات اسماعیل (لکھنو: سرفراز پریس، ۱۹۵۸ء)۔

۵۲: سید خاور نگرامی، اسماعیل میرٹھی ایک مطالعہ (لاہور: مکتبہ لائبریری، ۱۹۸۳ء)۔

۵۳: شاداب علیم، نظم جدید کی تثلیث (میرٹھ: پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء)۔

۵۴: شاداب علیم، "پیش گفتار"، اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم۔ فل اردو، مشمولہ: جدید شاعری کانقطہ آغاز اسماعیل میرٹھی، شاداب علیم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء)، ص۱۰۔

۵۵: شاداب علیم، جدید شاعری کانقطہ آغاز اسماعیل میرٹھی (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء)۔

۵۶: ناہید قاسمی، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲ء)، ص۹۷تا۱۰۳۔

۵۷: سلام سندیلوی، اردو شاعری میں منظر نگاری (لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۳ء)، ص۳۶۳تا۴۵۳، ۳۶۷تا۴۵۷۔

۵۸: جمیل جالبی، "جدید دور کا ارتقا"، مشمولہ: تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) (لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۰۱۲ء)، ص ۱۵۲۶ء۔ ۱۵۴۴ء۔

۵۹: سلیم اختر، اردو کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۱۹۷۱ء)، ص۱۶۵۔

۶۰: رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (لاہور: سیونتھ سکائی پبلیشرز، ۲۰۱۴ء)، ص۳۲۴تا۳۲۵۔

۶۱: انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۶۰۔

۶۲: نعیم السلام قادری، "مولانا اسماعیل میرٹھی اور ان کی شعری و ادبی خدمات"، مشمولہ: نگار شات (یوپی: جامعہ شمس العلوم گھوسی، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۳۱ تا ۴۴۸۔

۶۳: نوراحمد صدیقی، تذکرہ شعرائے میرٹھ (کراچی: سہیل پریس، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۷۸ تا ۱۹۰۔

۶۴: کوثر مظہری، جدید نظم حالی سے میراجی تک (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء)، ص ۹۴ تا ۱۰۹۔

۶۵: نصرت شمسی، بچوں کے شاعر اسماعیل میرٹھی (یوپی: انجمن سٹریٹ قومی کونسل برائے فروغ قومی زبان اردو، ۲۰۱۶ء)۔

۶۶: رشیدالاسلام۔ ”بچوں کی شاعری کے امتیازات اور اسماعیل میرٹھی کے عنوان پر توسیعی خطبہ“۔ http//Urdu chauthiduniya.com۔ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۷ء۔

۶۷: " اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے سے"، http//m.dailyhunt.in/news/india/urdu، تاریخ ملاحظہ: ۹ فروری ۲۰۱۸ء۔

۶۸: صبیحہ ناہید، ”ہمہ جہت شاعر: اسماعیل میرٹھی“۔ مشمولہ: پیش رفت، http//peshraft.blogspot.com، تاریخ ملاحظہ: ۳۰ اپریل ۲۰۱۵ء۔

۶۹: وسیم حسن راجا، ”اسماعیل میرٹھی بحیثیت موضوعاتی شاعر“، http//urdu research journal online، تاریخ ملاحظہ: اکتوبر ۲۰۱۷ء۔

۷۰: رئیسہ پروین، ”اسماعیل میرٹھی“، http//www.sol.du.ac.in/mod/book/viewphp، یونی ورسٹی آف دہلی۔

۷۱: علی احمد فاطمی، ”بچوں کی شاعری اور اسماعیل میرٹھی کی شعری جہات“، مشمولہ: قومی زبان، ج ۹۰، ش ۴ (۲۰۱۸ء)، ص ۱۹ تا ۲۳۔

۷۲: حقانی القاسمی، " مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور"، مشمولہ: ماہنامہ اردو دنیا (نومبر ۲۰۱۹ء)، http//ncpulblog.blogpost.com، تاریخ ملاحظہ ۵ دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۷۳: ناصر عباس نیر، " ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں"، مشمولہ: تحقیق نامہ، ش ۱۶ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء)، ص ۱۷۔

۷۴: ایضاً، ص ۲۲۔

۷۵: آرنی نائس، (Arne,Naess) اینڈ ڈیوڈ (David)، *Ecology,community and lifestyel:outline of an Ecosophy* (نیو یارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء)۔

نائس کے ماحولیات سے متعلق آٹھ اصول مندرجہ بالا کتاب میں بھی موجود ہیں۔ راقمہ نے انھیں الگ سے چھپے ایک آرٹیکل سے لیا ہے جس کا حوالہ یہ ہے۔ The basic principles of deep ecology، http//uwosh.edu/ecology.pdf، ۱۹۸۴ء۔

۷۶۔ نجیبہ عارف، " اکیسویں صدی کے ماحولیاتی مسائل: اسلامی تناظر" ، مشمولہ: اسلام پاکستان اور مغرب(اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۷-۳۲۔

(باب دوم)

اسماعیل میرٹھی کے فکر و فن پر نو آبادیاتی اثرات: ایک جائزہ

اسماعیل میرٹھی کے فکر وفن پر نوآبادیاتی اثرات: ایک جائزہ

ادب تخلیق کرنے والا چاہے وہ کسی بھی علاقے یا ملک کا باشندہ ہو اپنے معاشرے/سماج سے اثر قبول کرتا ہے۔ اپنے ارد گرد ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی، علمی، مذہبی غرض ہر طرح کے حالات و واقعات کا اثر اس کی تحریروں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ کہیں ان حالات وواقعات کے خلاف بغاوت دکھائی دیتی ہے تو کہیں اس کے حق میں آواز بلند کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اردو ادب نے بھی ایسے ہی مختلف ادوار کے حالات وواقعات کا اثر قبول کیا اور اپنے اندر کئی موضوعاتی وفکری تبدیلیاں لائیں۔ کہیں درباری چپقلش تو کہیں جنگوں کے اثرات، کہیں زبانوں میں لفظوں کی ہیرا پھیری تو کہیں اپنا آپ منوانے کی جنگ۔ غرض یہ کہ اردو ادب نے اپنی پیدائش کے بعد سے ہر عہد میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کو نہ صرف قبول کیا بل کہ اسی زمانے کے تحت اس میں نثر اور شاعری لکھی گئی اور اسے اسی طور برتا گیا جس طرح وقت کی ضرورت تھی۔ پھر چاہے وہ ادب میں در آنے والے ہر صنف کے نئے موضوعات ہوں، نئی فکر ہو یا پھر قومی مفاد کی خاطر لکھے جانے کی دوڑ ہو۔ اردو ادب نے ہر نئے تجربے اور ہر نئی تبدیلی کو قبول کیا اور اس کے لکھنے والوں نے اسے ہر مقصد کے تحت استعمال کیا۔ ادب جہاں معاشرے سے اثرات قبول کرتا ہے وہیں معاشرے پر اثرات مرتب بھی کرتا ہے۔ اس حوالے سے ادب کا کردار مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

زیر نظر باب میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کا مطالعہ شامل ہے۔ جس طرح پہلے باب میں ماحولیاتی تنقید کے نظریے سے متعلق وضاحت پیش کی گئی ہے وہیں نوآبادیاتی دور کے حالات و واقعات اور نوآبادیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے جس کے تحت وہ شاعری لکھی گئی۔ تاکہ شاعری پر اس کے اثرات کے محرکات کو بھی جانا جاسکے اور ہمارے سامنے وہ پس منظر بھی آسکے جس نے اسماعیل میرٹھی کو ہر طرح کے موضوعات پر شاعری کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس حوالے سے انجمنِ پنجاب کے کردار کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔ جس نے اس دور کے شعرا کو ایک مخصوص موضوع کے تحت شاعری کرنے پر اکسایا۔ اس میں کس حد تک سیاسی عوامل کا دخل شامل تھا یا کس حد تک شعرا نے اسے قبول کیا اور شاعری کا حصہ بنایا۔ ان تمام تر حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کو دیکھا جائے گا۔

نوآبادیات: مختصر تعارف و پس منظر

نوآبادیات کی تعریف سے متعلق کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی ہے۔ نہ ہی اس کے آغاز کے بارے میں کوئی ایسی دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ اس کی ابتدا فلاں دور میں ہوئی یا فلاں علاقے سے شروع ہوئی۔ جہاں کہیں دوسرے ملک نے آکر کسی علاقے پر قبضہ کیا، اپنی حکمرانی چلائی اور اس علاقے کی زبان و ثقافت کو فتح کر لیا وہیں سے نوآبادیاتی نظام شروع ہو گیا۔ اب اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ چیز ہمیں زمانہ قدیم میں لے جاتی ہے جب طاقت کے بل بوتے پر کئی ادوار میں ایسی نوآبادیاں قائم ہوتی رہیں اور کئی تہذیبیں ایک دوسرے کو زیر کرتی آئی ہیں۔ ان سب کے باوجود نوآبادیات کے متعلق کوئی ایک تاریخ یا مقام متعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ روایتی تعریفوں اور پہلے سے لکھی جانے والی تفصیلوں کو بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک جگہ سے کسی چیز کو اٹھا کر دوسری جگہ لفظوں کے ہیر پھیر سے جوں کا توں منتقل کر دینا لیکن اس کی وضاحت کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے بیان کرنا شروع کیا جائے تو ایک الگ ہی باب جنم لیتا ہے جسے یہاں بیان کرنا ضروری نہیں۔ راقمہ صرف اسی عہد کے حوالے سے نوآبادیات کو بیان کرنا مناسب خیال کرتی ہے جس کا تعلق مجوزہ تحقیق کے ساتھ ہے۔ ذیل میں نوآبادیات کا مختصر تعارف اور پس منظر بیان کیا جاتا ہے۔

نوآبادیات کی تعریف پر روشنی ڈالی جائے تو مختلف انگریزی کی ڈکشنریز اور اردو کی لغات و فرہنگ میں الگ الگ وضاحتیں دی گئی ہیں۔ ذیل میں چند تعریفوں کو بیان کیا جاتا ہے۔

سٹین فورڈ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی کے مطابق نوآبادیات کی تعریف کچھ یوں ہے:

> Colonialism is a practice of domination, which involves the subjugation of one people to another. (1)

اسی طرح کیمبرج ڈکشنری کے مطابق:

> The belief in and support for the system of one country controlling another. (2)

اجارہ داری قائم کرنے والے اس رواج کی اصطلاح لاطینی لفظ colonus سے نکلی ہے جس کے معنی کسان کے لیے جاتے ہیں۔ (۳) سید ریاض ہمدانی نوآبادیات کی وضاحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تاریخ کی ایک نئی اصطلاح ہے جسے اردو میں نوآبادیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "سب سے پہلے رومیوں نے اس اصطلاح کا استعمال کیا تھا۔" (۴) جب وہ دوسرے ممالک اور علاقوں پر اپنا اقتدار اور تسلط قائم کرنے کے لیے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے

کہ نوآبادیات کی اصطلاح پر انیسویں صدی میں اس وقت بحث ہوئی جب یورپی ممالک نے دو قسم کے علاقوں پر قبضے کیے۔ ایک وہ علاقے جہاں انھوں نے باقاعدہ نوآبادیاں قائم کیں اور دوسرے وہ جہاں صرف فوجی طاقت و قوت پر قبضہ کیا۔ اس لیے سوال اٹھایا گیا کہ کیا ہندوستان کو انگلستان کی کالونی کہنا چاہیے یا نہیں؟ جس پر کئی مباحث سامنے آئے اور بل آخر یہ کہنا پڑا کہ نوآبادیات (کولونیل ازم) کے وقت کے ساتھ بدلتے مفہوم کے مطابق برطانوی عہد کو ہندوستان کی تاریخ میں "کولونیل دور" کہا جاتا ہے۔ (۵) یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور کے اعتبار سے نوآبادیات کو اس وقت کے مطابق سمجھا گیا اور اس کی وضاحتیں پیش کی گئیں۔

ڈکشنری میریم ویبسٹر نوآبادیات کو مختلف نکات کی صورت میں بیان کرتی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں نکلتا ہے کہ نوآبادکار بننے اور اپنی کالونی قائم کرنے کی خصوصیت کا ہونا اور لوگوں پر طاقت کے ذریعے اجارہ داری قائم کرنا نوآبادیات کہلاتا ہے۔ (۶) تاریخی حوالوں سے دیکھا جائے تو ہر وہ ملک جو نوآبادیات کا شکار ہوتا ہے ہر ہر لحاظ سے ٹوٹ پھوٹ اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ جس میں وہ علاقہ صرف سیاسی یا معاشی سطح پر ہی نہیں بل کہ تاریخی، تہذیبی، ادبی اور سب سے بڑھ کر ذہنی اعتبار سے بھی غلامی کا شکار ہو جاتا ہے۔

نوآبادیاتی صورت حال آخر ہے کیا؟ یہ کیسے جنم لیتی ہے اور اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اس متعلق ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے آسان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ ان کے مطابق نوآبادیاتی صورت حال کوئی فطری صورت حال نہیں ہے جسے باقاعدہ کسی قانون کے تحت عمل میں لایا جا سکے۔ یہ وہ صورت حال ہے جسے پیدا کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مخصوص مقاصد کے حصول کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ "انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورت حال ہے۔ اس گروہ کو نوآبادکار کا نام دیا گیا ہے۔" (۷) اسی حوالے سے مزید دیکھا جائے تو الیاس بابر اعوان ایسی صورت حال کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "نوآبادیات ایک تاریخی تصور ہے جو طاقت ور اقوام کی طرف سے کمزور یا ارفع جوہر کی حامل اقوام کی علاقائی توسیعیت کا نام ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق سرمائے کے حصول کے لیے مختلف منڈیوں کی تلاش سے تھا۔" (۸)

ہندوستان یا برصغیر کو نوآبادیات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہاں جب بھی کوئی نوآبادی قائم ہوئی انھوں نے ابتدا میں تجارت کی غرض سے قدم رکھا۔ کچھ انھی مقاصد کے تحت آتے اور جاتے رہے اور کچھ نے اس کی آڑ میں اپنی کالونیاں بنا کر یہیں ڈیرے جما لیے۔ ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی اپنی زرخیزی اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے باعث غیر

ملکی اقوام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یورپیوں کے لیے ہندوستان سونے کی چڑیا سے کم نہ تھا کیوں کہ یہاں انھیں وہ تمام چیزیں میسر آسکتی تھیں جن کی انھیں ایک چھت تلے تلاش تھی جیسے کہ ریشم، مصالحہ جات، افیون، ہر نسل کے جانور اور ایسی بہت سی اشیاء جن کی تجارت سے وہ مالا مال ہو سکتے تھے۔ اسی لیے ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ پہلے پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام پر برطانویوں نے یہاں کیسے حکومت کی۔ راقمہ پرتگالیوں اور ولندیزیوں کی آمد اور ان کے قیام کے مقاصد کو بیان کرنا مجوزہ تحقیق کی ضرورت کے مطابق خیال نہیں کرتی۔ صرف برطانوی حکومت کی آمد ان کے مقاصد اور قیام کو مختصراً بیان کر کے ان کے تعلیمی نظام اور ادب پر اثرات کو بیان کرنا مناسب خیال کرتی ہے۔ جس سے اس پس منظر کو جاننے میں مدد ملے گی جس کے تحت اردو شاعری و نثر میں تبدیلی آئی اور ادب میں نئے مضامین کو جگہ ملی۔ علاوہ ازیں انجمن پنجاب کے قیام اور اس کے تحت ہونے والے مشاعروں کو بھی بطور خاص مد نظر رکھا جائے گا جس کے تحت اردو شاعری میں نئے مضامین اور نئی فکر کو متعارف کروایا گیا۔ ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا تاکہ ہمارے سامنے ایک پس منظر آسکے جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے نوآبادیاتی مطالعے میں معاون ثابت ہوگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور برطانویوں کی آمد: مختصر جائزہ

ہندوستان کے دنیا بھر سے تجارتی تعلقات بہت پرانے ہیں۔ جس کے آثار ہمیں وادی سندھ کی تہذیب سے ملتے ہیں۔ ایک وقت یہ بھی آیا جس کا آغاز ہم پندرہویں صدی سے لیتے ہیں کہ جب یورپ میں تاجروں نے اس سرزمین سے جو منافع کمایا اور جو تجارتی رشتے قائم کیے وہ بعد میں سیاسی شکل اختیار کر گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان آنے کی ایک بڑی وجہ مصالحہ جات حاصل کرنا تھا۔ جس سے وہ نہ صرف اپنی اشیائے خورد و نوش کو محفوظ کرتے بل کہ انھیں وہ سستے داموں خرید کر مہنگے دام فروخت کر کے منافع بھی کمایا کرتے تھے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو باقاعدہ طور پر ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں تجارت کی اجارہ داری مل گئی تو ساتھ ہی اسے دیگر یورپی تجارتی کمپنیوں جنھیں وہ اپنا حریف مانتے تھے سے بھی مقابلہ کرنا پڑا جن میں پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی شامل تھے۔ انگریزوں نے ان سے جنگیں لڑیں جن میں کرناٹک، پلاسی، بکسر کی جنگیں اور چند چھوٹی علاقائی لڑائیاں بھی شامل ہیں اور کامیابی اپنے نام کی۔ مختلف علاقوں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں بھی بادشاہ اور علاقائی حکمرانوں کے اجازت ناموں سے قائم ہو چکی تھیں۔ اب وہ باقاعدہ طور پر ہندوستان میں ہر حوالے سے طاقت کے بل بوتے پر اپنے قدم جما چکے تھے۔ برصغیر ہندوستان میں اتنے کم وقت میں اس طرح ضم ہو جانا اور اپنا اثر ورسوخ بڑھا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ انگریزوں نے بڑی چالبازی اور حکمت عملی سے اس کام کو سر انجام دیا۔ ابتدا میں انھیں مقامی لوگوں کی زبان، ان کی تہذیب و ثقافت اور خصوصی طور پر ان کی تاریخ کو جاننے میں دشواری پیش آئی۔ انھوں

نے اس کمی کو اچھے سے محسوس کیا اور اس حوالے سے بھی بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ جن میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، چھاپہ خانوں کا قیام، اخبارات کا اجرا، انجمن پنجاب کا قیام وغیرہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے قیام میں لارڈ میکالے، کرنل ہالرائڈ، جان گلکرائسٹ اور جی ڈبلیو لائٹنر کے نام بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اداروں کے قیام کا مقصد ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور زبان کو جان کر عوامی سطح پر نہ صرف اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا تھا بل کہ ہر ہر سطح پر انھیں خود سے نیچا دکھانے کی بھی ایک سعی تھی۔ جسے غیر محسوس طریقے سے سرانجام دیا گیا۔ جس کا اندازہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر ہو رہا ہے۔(۹)

ہندوستان کی نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے یہاں یہ سوال بھی توجہ طلب ہے کہ آخر کیسے ایک کثیر آبادی پر مشتمل عظیم الشان مغلیہ سلطنت پر صرف چند ہزار انگریز افسروں اور سپاہیوں نے قبضہ کیا؟ جبکہ وہ یکسر مختلف تہذیب و تمدن، زبان اور خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہندوستان پر اُس وقت تک قابض نہ ہو سکتے تھے جب تک انھیں یہاں کے مقامی افراد کی حمایت اور تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ابتداء سے ہی ہندوستان میں چند ایک ایسے تاجروں اور دستکاروں وغیرہ کا تعاون حاصل رہا تھا جنھیں کمپنی کی تجارت سے فائدہ ہوتا تھا اور وہ کمپنی کے ایجنٹ کے طور پر کام کیا کرتے تھے مثلاً بنگال کی دیوانی کے بعد ہزاری مل، مہاراجہ نابھ کرشن اور کرشن کانت کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان لوگوں نے بہت دولت اکٹھی کی۔ پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے والے وہ ہندو سیٹھ اور بنئے تھے جن کے تجارتی مفاد کمپنی کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ اس حوالے سے جگت سیٹھ اور اُمی چند کے نام قابلِ ذکر ہیں درباری سطح پر بادشاہوں کی آپسی دشمنیوں اور اپنوں کی غداریوں نے بھی اس حوالے سے ایک اہم کردار کیا۔ اس چیز کا اعتراف کیا جانا بھی ضروری ہے کہ ہندوستان پر قبضے کے لیے انگریزوں کو بھی کئی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ علاقوں کے حکمرانوں نے تو تحفے تحائف اور بڑے انعام کی لالچ میں آکر اپنے علاقے انگریزوں کے نام کر دیے لیکن چند ایسے بھی علاقے تھے جہاں کے گورنروں نے باقاعدہ لڑائیوں کے نتیجے میں اپنی سلطنت کو کھویا تھا۔ ان میں مرہٹے، جاٹ اور سکھ شامل تھے۔ میسور کی جنگوں کو یکسر نہیں بھلایا جا سکتا جس کے نتیجے میں انگریز خوف کا شکار ہوئے تھے۔ ہندوستان کے زوال کو صرف مغل سلطنت کے ساتھ منسلک کر کے دیکھنا چاہیے کیوں کہ جو مغل بادشاہ، امرا اور دربار سے منسلک افراد کے ساتھ ہو رہا تھا اس کا اطلاق پورے ہندوستان پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران لکھنؤ، بنگال، حیدر آباد دکن، جے پور جیسی ریاستوں میں زندگی پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ پونا کی دستاویزات میں شہری و دیہاتی زندگی کی تفصیلات باقاعدہ طور پر موجود ہیں جنھیں برطانوی دور میں انگریز مورخوں کے لیے ممنوع قرار دے

دیا گیا تھا۔ یہ دستاویزات اس چیز کا ثبوت تھیں کہ " مغل انتظام اور اس کے ادارے اپنے زوال کے باوجود ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کامیابی سے کام کر رہے تھے۔ "(۱۰) اس حوالے سے یہ اعتراف کیا جانا ضروری ہے جسے ہماری تاریخ میں گڈ مڈ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ مغربی مورخین ایسی چیزوں کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ایسی دستاویزات کو یا ایسی معلومات کو دنیا کے سامنے نہ پیش کیا جائے جن سے ان کی ساکھ کو ٹھیس پہنچتی ہو یا ان کی کمزوریاں دنیا کے سامنے آ سکیں۔ نئی تحقیق ایسی کئی تاریخوں سے پردہ اٹھا کر آج بھی ہمیں اپنی اصل سے آگاہ کرنے میں پیش پیش ہے۔ جن میں ان مغربی مفکرین کا بھی حصہ شامل ہے جو ہندوستان کو اس کی اصل طاقت سمیت جانتے تھے اور جنھوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

کسی بھی معاشرے کی بنیاد اس کے تہذیب و تمدن، ثقافت، زبان و ادب اور رسوم و رواج جیسے شعبوں سے ہوتی ہے اور ہر معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، زبان و ادب اور مذہب وغیرہ کی وجہ سے دوسرے معاشرے سے مختلف ہوتا ہے، مگر یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے اندر چوں کہ یورپ کی مرکزیت کا تصور لیے ہوتا ہے لہٰذا وہ نوآبادیاتی اقوام کے سماجی شعبوں مثلاً تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، علم و تعلیم اور رسوم و رواج کو ہدفِ تنقید بنا کر اس کے مقابلے میں اپنے معاشرے یا سماج یا مغرب کا علم، نظامِ حکمرانی، تعلیمی تصورات اور ثقافتی رسوم کو سب سے اعلی اور برتر قرار دے کر قبضہ شدہ علاقوں میں انھیں پھیلانے اور رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی طرف سے قائم کردہ نوآبادیوں پر حکمرانی کے طریقوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناصر عباس نیر نوآبادیات کی صورت حال اور اس کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات میں سے ایک نظریہ جسے دراصل نوآبادکاروں کی طرف سے نوآبادیاتی باشندوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اختیار کردہ ایک حکمت عملی تصور کیا جا سکتا ہے کے مطابق نوآبادکار، نوآبادیاتی اقوام کے رسوم و رواج، ثقافت، تہذیب و تمدن اور ان کے ادب کو اُن کی پسماندگی اور زوال کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس طرح نوآبادکار نوآبادیاتی باشندوں کی زندگی میں ایک بہت بڑے خلا کا تعین کرتا ہے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے بڑی چالاکی سے نوآبادیاتی باشندوں کے سامنے اپنی شخصیت، اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، سیاسی نظریات اور فنون کو نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے جس کا مقصد ان کے اذہان کو اپنا غلام بنانا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال لارڈ میکالے کی تعلیمی رپورٹ کا یہ حصہ ہے جس کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے:

> فی الوقت ہماری بہترین کوششیں ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں لانے کے لیے وقف ہونی چاہییں جو ہم میں اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین، جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سر انجام دیں۔

> یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم وفراست کے اعتبار سے انگریز۔ (۱۱)

اسی سوچ اور حکمت عملی کو لیتے ہوئے انگریزوں نے تعلیمی میدان میں جو ادارے قائم کیے ان کا اصل مقصد سیاسی حوالوں سے اپنے مقاصد کو پورا کرنا تھا جن میں سے ایک ان کا اپنی زبان کو رائج کرنا، اپنی تعلیمی برتری کو ظاہر کرنا اور محکوم اذہان پر ان کے ادب کو انتہائی نیچا کر کے دکھانا غرض ہر سطح پر انھیں خود سے کمتر ثابت کرنا شامل تھا۔ جو انھوں نے انتہائی غیر محسوس طریقے سے سرانجام دیا۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان اداروں کے قیام سے اردو ادب میں نثری اور شعری دونوں حوالوں سے کئی اضافے ہوئے۔ تراجم کے ذریعے ہم مغربی کارناموں سے واقف ہوئے۔ چھاپہ خانوں سے ہمارا ادب عوامی سطح پر متعارف ہوا۔ وہاب اشرفی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ پس نوآبادیاتی مطالعوں کو دیکھا جائے تو وہ اس چیز کو مانتے ہیں کہ بیرونی حکومتیں اپنے عہد حکمرانی میں محکوم اقوام کے ذہن و دماغ کو اس حد تک متاثر کرتی ہیں کہ ان کے اثرات سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انگریزوں نے ہمیں بہت سی مثبت چیزوں سے بھی روشناس کروایا، نئے علوم کے در وا کیے، زندگی کے نئے اصولوں سے واقفیت دلوائی وہیں ہمارے اندر احساس کمتری کو اس حد تک اتارا ہے کہ ہم آج بھی اس سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔ (۱۲)

اس مختصر سے تعارف و پس منظر کو لیتے ہوئے جس میں انگریزوں کی آمد اور ان کے مقاصد کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے ذیل میں ان کے بنائے گئے ایک ادارے انجمن پنجاب کا تعارف پیش کیا جائے گا جس کا تعلق مجوزہ تحقیق کے ساتھ ہے اور جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے مطالعے میں معاون ثابت ہوگا نیز ان محرکات کو بھی جاننے میں مدد ملے گی جس کے تحت اردو شاعری میں نئی تبدیلیاں آئیں اور اردو نظم ایک نئے آہنگ سے متعارف ہوئی۔ جس کے لیے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کو بطور خاص مدنظر رکھا جائے گا۔

انجمن پنجاب کا قیام، مقاصد اور مشاعرے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے غدر کے نام سے جانا جاتا ہے ہندوستان/ برصغیر کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں جہاں سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی سطح پر بڑی تبدیلیاں آئیں اور دیگر شعبہ زندگی متاثر ہوئے وہیں علمی و ادبی سطح پر بھی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے جہاں ان کا ساتھ دیا وہیں انگریزی عہدوں پر انھیں تعینات کرتے ہوئے مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کو دوہرے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے بعد کچھ عرصہ مسلمان ہر لحاظ سے خود کو تہی دامن

خیال کرتے رہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد چند ایسے راہنما و قائدین بھی اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنی دور اندیشی سے کام لیا اور مسلمانوں کو وقت کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ اس حوالے سے ابتدائی سطح پر انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھیں رہیں یا پھر مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کریں کہ انگریزوں کے ساتھ مصالحاتی رویہ اپناتے ہوئے ہی ان کی گاڑی چل سکے گی۔ اس کے لیے تعلیمی سطح پر انقلاب لانے کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ عارف ثاقب لکھتے ہیں لکھنؤ جسے علم وادب کا گہوارہ مانا جاتا تھا آہستہ آہستہ اپنی رونقیں کھونے لگا۔ شعر وادب سے دل چسپی رکھنے والوں نے دیگر علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی جن میں حیدر آباد دکن اور پنجاب سرفہرست تھے۔ پنجاب اس حوالے سے ابھی قدرے پر امن علاقہ تھا کیوں کہ یہاں انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا۔ یہاں کے گورنر سر جان لارنس (۱۸۷۹ء-۱۸۱۱ء John Lawrence) نے پنجاب کے لیے ملکہ سے خصوصی مرعات حاصل کیں۔ ۱۸۵۹ء میں جب دہلی کو پنجاب کے ماتحت کر دیا گیا تو شعر وادب سے تعلق رکھنے والے افراد نے لاہور کا رخ کیا۔ درس وتدریس سے تعلق رکھنے والوں میں محمد حسین آزاد، منشی درگا پرشاد، مرزا اشرف بیگ، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی کریم الدین، مولوی سید احمد، ماسٹر پیارے لال وغیرہ شامل تھے۔ (۱۳)

اب تک مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور اردو زبان وادب میں اس چیز کی کمی تھی کہ اسے عوامی سطح پر اظہار کے لیے استعمال کیا جائے۔ قومی اصلاح اور مسلمانوں کو تنگ نظری وذہنی پستی سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ اردو زبان میں اس حوالے سے کچھ لکھا جائے تاکہ عوامی سطح پر شعور بیدار کیا جا سکے۔ اس حوالے سے ابتدائی سطح پر کچھ ادارے اگرچہ انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کر رہے تھے لیکن غیر شعوری طور پر ان اداروں کے توسط سے اردو ادب میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ شارب ردولوی لکھتے ہیں ان اداروں میں ایشیاٹک سوسائٹی، فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور انجمن پنجاب سرفہرست تھے۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب اور تعلیمی سطح پر پیچھے رہ جانے والی کمی کو محسوس کیا اس حوالے سے انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا۔ سر سید کی علی گڑھ تحریک نے اس وقت میں اہم کردار ادا کیا۔ جو رسائل، اخبار اور کتب لکھی گئیں ان میں مسلمانوں کو ان کی شکست کی وجوہات سے آگاہ کیا گیا اور ساتھ ہی اس چیز کی طرف بھی توجہ دلائی گئی کہ جب تک وہ انگریزی تعلیم حاصل نہیں کریں گے تب تک فکری سطح پر انقلاب نہیں لایا جا سکے گا اور معاشی حوالے سے بھی وہ پیچھے رہیں گے۔ (۱۴) دوسری طرف محمد حسین آزاد نے اس حوالے سے انجمن پنجاب کے تحت ایک نئی سوچ کو عوام میں بیدار کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ اگرچہ اس کے پیچھے انگریزوں کے سیاسی مقاصد شامل تھے لیکن اس انجمن کے مشاعروں سے اردو کے شعری سرمائے میں موضوعاتی اور فکری سطح پر اہم

اضافہ ہوا۔ ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء میں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" کی بنیاد رکھی گئی تھی جسے بعد میں انجمن پنجاب کا نام دے دیا گیا۔ پنڈت من پھول رائے نے افتتاحی تقریر میں انجمن کے قیام کا اعلان کیا جس کے مطابق ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کو اس کا پریزیڈینٹ، منشی ہر سکھ رائے کو شعبہ فارسی کا سیکرٹری اور بابو نوین چندر رائے کو انگریزی سیکشن کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اور اس کے مقاصد متعین کیے جن میں:

قدیم مشرقی علوم کا احیا۔

باشندگان ملک میں دیسی زبان کے ذریعہ علوم مفیدہ کی اشاعت۔

حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنے کے لیے علمی ترقی، معاشرتی مسائل اور نظم و نسق کے مسائل پر تبادلہ خیال۔

پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنا۔

ملک کی عام ترقی اور شہری نظم و نسق کی درستی کے لیے کوشاں رہنا۔

حاکم و محکوم کے درمیان رابطہ اتحاد و موانست کو ترقی دینا۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے انجمن نے مدارس، کتب خانے اور دارالمطالعے قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، رسائل جاری کیے گئے اور سماجی، تہذیبی، اخلاقی، انتظامی، علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کے لیے جلسے منعقد کیے گئے۔ غرض انجمن نے عوام کی فلاح کے لیے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں اصلاح اور امداد کا کام کیا۔(۱۵) اس تحریک میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب، درگا پرشاد نادر اور محمد حسین آزاد جیسے ادباء شامل تھے۔ انجمن کا اہم کام یہ تھا کہ اس نے مختلف مضامین پر ہفتہ وار مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا جو اپنا کردار ادا کرنے میں قدرے کامیاب رہا۔ انجمن کے ابتدائی جلسوں میں مولوی آزاد، پنڈت من پھول، مولوی عزیز الدین، بابو چندر ناتھ، اور پروفیسر علمدار حسین وغیرہ نے مضامین پڑھے اور ان میں سے بیشتر مضامین کی اشاعت رسالہ انجمن پنجاب میں ہوئی۔

انجمن کو کامیاب بنانے میں اس کے مشاعروں کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان مشاعروں کا آغاز ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو ہوا اور اس کا آخری مشاعرہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو منعقد ہوا۔ انجمن کے ان مشاعروں کی تعداد دس بتائی جاتی ہے۔ ان میں جن موضوعات پر نظمیں لکھنے کو دی گئیں ان میں "شب قدر، برسات، زمستان، امید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب، اخلاق" شامل ہیں۔ ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، انور حسین ہما، ولی دہلوی اور منشی الٰہی بخش رفیق وغیرہ نے مختلف موضوعات پر نظمیں پڑھیں۔ جن دو شخصیات کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں

محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کے نام شامل ہیں۔ ان دونوں شعرا نے نظم میں کئی تجربے کیے۔ آزاد نے قدیم اصناف میں نئے تجربوں کو آزمایا اور مثنوی کے امکانات کا دائرہ وسیع کیا تو دوسری طرف حالی نے اردو نظم میں جدیدیت پیدا کی اور" مدوجزر اسلام" جیسی نظم لکھ کر اردو شاعری میں نظم کے میدان میں ایک اہم اضافہ کیا۔ حامدی کاشمیری لکھتے ہیں کہ اردو میں نظم کی پہچان اور اس کی ابتدا ہمارے ہاں ان انگریزی نمونوں سے ہوئی جن کے تراجم ہم تک فورٹ ولیم کالج کی بدولت ہو کر آئے۔ انگریزی میں لکھی جانے والی ورڈزورتھ، کالرج، کیٹس کی نظموں کے نمونے تراجم کی صورت میں پڑھے گئے اور شاعری میں اس نئی جدت کو سراہا گیا۔ اردو کے تنقیدی و فکری اذہان نے ان چیزوں کو نہ صرف محسوس کیا بل کہ اپنے ادب میں بھی اس کے استعمال کی کوششیں شروع کیں۔ جن کی ایک بنیاد انجمن پنجاب کے مشاعرے ہیں۔ اس میں حالی اور آزاد کی اردو نظم سے متعلق خدمات کو نہیں بھلایا جاسکتا ہے۔ ابتدائی شاعری سے متعلق لکھے جانے والے مضامین اور بعد میں موضوعی مشاعروں کا اہتمام ان کی ایک بڑی کڑی تھی جس نے آنے والے وقت میں اردو نظم کو ایک پہچان دی۔ (۱۶)

صوفیہ یوسف لکھتی ہیں آزاد اردو زبان کو کسی مخصوص حوالے سے جوڑ کر نہیں رکھنا چاہتے تھے بل کہ اس کی ترقی اور فروغ کے لیے بدیسی زبانوں بالخصوص انگریزی زبان و ادب سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے اردو مضامین کو صرف نثر میں بیان کرنے کے بجائے نظم میں بھی ترویج دینا چاہتے تھے۔ ان کا یہ نظریہ سرسید احمد خاں کے نظریات سے متاثر تھا کیوں کہ سرسید نے مسلمانوں میں اس رجحان کی ترویج کے لیے تمام تر توجہ صرف کر دی تھی۔ وہ اور ان کے رفقاء اُردو نثر میں بنیادی تبدیلیوں کے ساتھ موضوعات کے تنوع کے قائل تھے۔ انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے اردو شاعری میں انقلابی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ مولانا حالی مشاعرہ انجمن کے کامیاب اور مقبول شعرا میں سے تھے انجمن کے مشاعروں کی بدولت اردو نظم میں نہ صرف بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئیں بل کہ شاعری کو فطرت اور صداقت کے قریب تر لانے میں اس نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ (۱۷) اس متعلق ڈاکٹر انور سدید آزاد کی اس خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> آزاد کی تحریک نے انسان کو لازوال فطرت کی آواز پر کان دھرنے، خیر کی قدر کو داخل سے اور حسن کی قدر کو خارج سے اجاگر کرنے پر مائل کیا اور یوں آزاد نے اس صداقت کو ابھارا جو جمال فطرت بن کر انسان کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ (۱۸)

انجمن پنجاب کے قیام کے پیچھے کے مقاصد کو اردو ناقدین و محققین الگ الگ حوالوں سے جوڑ کر لکھا ہے۔ ناہید قاسمی نے اس کا مقصد انگریزوں کا اپنی حکومت کو مستحکم کرنا، برطانوی راج کے خلاف نفرت کی خلیج کو باٹنے کی کوشش، سیاسی شعور کو ثقافتی محاذ کی طرف موڑنے کی کوشش، درسی مقاصد کے شعرا کو جدید طرز کی سادہ دل چسپ و سبق آموز نظمیں لکھنے کی ترغیب کے طور پر بیان کیا ہے۔ (۱۹) عارف ثاقب کے نزدیک ان مشاعروں کا بڑا مقصد سرکاری مدارس کے لیے منتخب موضوعات پر نظمیں فراہم کرنا تھا لیکن یہ مشاعرے صرف اسی تک محدود نہ رہے۔ ایشیائی شاعری جو کہ عشق و مبالغے کا شکار ہو گئی تھی اور حکمرانوں کی تعریفوں پر مبنی تھی اس کو حقائق و واقعات کی جانب لے جایا جائے۔ اس کے لیے انجمن نے اپنی خدمات سرانجام دیں۔ (۲۰) ساجد امجد اور عبادت بریلوی کے نزدیک مشاعروں میں مصرع طرح دے کر شاعری کرنے کا رواج ہے اسے ترک کر کے خاص مضامین و عنوانات کو فروغ دینا اس انجمن کے مقاصد میں شامل تھا۔ (۲۱) ادبی تواریخ لکھنے والوں نے بھی جہاں جدید نظم کا ذکر کیا ہے وہیں انجمن پنجاب کو اس کی بنیاد بتایا ہے۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ انجمن پنجاب نے جن موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی تھی وہ آزاد کی ایجاد نہیں تھے بل کہ اس وقت کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائڈ کی فرمائش پر وجود میں آئے تھے۔ انھوں نے یہ قدم صرف لیفٹیننٹ گورنر ڈونلڈ میکلوڈ کی خوشنودی کے لیے اٹھایا تھا جو چاہتے تھے کہ اردو شعرا بھی انگریزی انداز کی جدید حقیقت سے قریب تر فطری نظمیں لکھیں اور جنھیں اردو کی نصابی کتابوں میں بھی شامل کیا جا سکے۔ آزاد نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ضرورت کو محنت سے آنے والوں کے لیے قابل قبول بنایا اور اس انجمن کی تحریک کے بانی ہو کر پیشوا بن گئے۔ (۲۲)

انجمنِ پنجاب کی اس تحریک کے حوالے سے ناصر عباس نیر کا مضمون " انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر " توجہ طلب ہے۔ اس میں انھوں نے اس انجمن کے قیام کو نوآبادیات کے حوالے سے بھی پرکھا ہے کہ آخر برطانوی حکومت کا اس انجمن کے قیام کے پیچھے کا اصل مقصد کیا تھا۔ راقمہ نے اس کا مختصر مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد ہندوستانی اذہان پر گرفت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ برطانوی نوآبادیاتی ذہن اس حقیقت کو جنگ کے بعد بخوبی جان چکا تھا کہ یوں عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کی ترجیحات کو جاننا اور انھی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ جس کے لیے انھوں نے مشرقی علوم کی سرپرستی کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر اپنے کلاسیکی علوم کی اصل کو ہندوستانی معاشرہ جان گیا تو یہ بغاوت کی شکل میں حکومت کے آڑے آسکتا ہے۔ لہذا ان برطانوی نوآبادکاروں نے عوامی ہمدرد بن کر انھیں اپنی راہ پر لانے کے لیے مشرقی علوم میں عربی، سنسکرت، اور فارسی کو خوب اہمیت دی کیوں کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی بنیادی زبانیں تھیں اور انھی میں ان کا ادب لکھا گیا تھا۔ ان کے پیچھے کا

مقصد مشرقی علوم کے ذریعے مشرقی ذہن پر اقتدار حاصل کرنا تھا۔ جہاں تک شعری تبدیلیوں کا سوال ہے تو اس حوالے سے بھی ہمارے انیسویں صدی کے شعری سرمائے میں ایسی مثالیں موجود تھیں جنھیں مغربی علوم کا لبادہ پہنا کر شامل کیا جا رہا تھا لیکن ان کو قبول کرنے والا کوئی نہیں تھا لہٰذا اس کا یہ جواز ڈھونڈا گیا کہ ان کی شاعری کو سکول کی سطح کے بچوں کو نہیں پڑھایا جا سکتا ہے لہذا یورپی طرز کی نیچرل شاعری اردو میں تخلیق کی جائے اور اسے تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے۔ ان سب کے باوجود اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعری حوالے سے جن تبدیلیوں کی طرز ڈالی گئی تھی ان کا اطلاق اس وقت میں زبردستی دیکھا گیا لیکن بعد کے آنے والوں جیسے نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، نادر کاکوری وغیرہ نے ایسے تجربے کیے جن کے بغیر اردو کی جدید شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (۲۳)

راقمہ نے دوران مطالعہ بار بار دہرائی جانے والی تفصیلوں سے گریز کیا ہے اور مقالے کی ضرورت کے پیش نظر ہی مختصر طور پر ان نکات کو بیان کیا ہے جو مجموعی حوالے سے انجمن کے مقاصد میں شامل تھے۔ انجمن پنجاب کے قیام سے لے اس کی زیر نگرانی ہونے والے کاموں پر باقاعدہ مقالے لکھے گئے ہیں جن میں ان کی تفاصیل موجود ہیں۔ راقمہ البتہ اس چیز کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتی ہے کہ جن مشاعروں کو موضوعی مشاعرے کہہ کر ان کے بند ہونے کا پروانہ جاری کیا گیا تھا اس کے کچھ وقت بعد ہی طرحی مشاعروں کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں ایک مصرع اردو کا اور ایک فارسی کا شامل ہوتا اور اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے مشاعرے کا اجلاس منعقد کیا جاتا تھا۔ بعد میں ہونے والے یہ مشاعرے ۵ مئی ۱۸۸۳ء سے ۴ نومبر ۱۸۸۳ء تک ہوتے رہے۔ جہاں موضوعی شاعری کو پروان چڑھانے کی رسم چل نکلی تھی اور جس کے دور رس اثرات بھی دیکھے گئے وہیں اسی انجمن کے زیر نگرانی غزل پر بعد کے ہونے والے مشاعروں کو یہی کہا جا سکتا ہے کہ نظم پر چوٹ کرنے والے مخالفین کا یہ ایک انداز ضرور ہو سکتا ہے۔ (۲۴)

یہاں اس چیز کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ یہی وہ عہد بنتا ہے اور یہی وہ انجمن تھی جہاں سے ہم اردو میں فطرت نگاری کی تحریک کے آغاز کو لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مقالہ اردو شاعری میں منظر نگاری اور ڈاکٹر ناہید قاسمی کا مقالہ اردو شاعری میں فطرت نگاری بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جس میں ۱۸۵۷ء سے لے کر تا حال کی شاعری پر فطرت نگاری کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے انجمن پنجاب کی اردو شاعری کے حوالے سے خدمات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ ذیل میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کا جائزہ

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا اردو ادب میں ایک بنیادی مقام ہے۔ انھیں نظم، بچوں کی شاعری، درسی کتب، مترجم، فطری شاعر، مدرس وغیرہ کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے کلام اور ان کے کام پر مختلف حوالوں سے تحقیقی کام کیے گئے ہیں۔ ان کے تعارف پر بات کی جائے تو مختلف کتب میں جس بنیادی ماخذ کو استعمال کرتے ہوئے حوالے کے طور پر لیا گیا ہے وہ اسلم سیفی کی لکھی ہوئی کتاب حیات اسماعیل سے لیے گئے ہیں۔ راقمہ بھی اسی بنیادی ماخذ کو استعمال کرتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کا مختصر تعارف بیان کیا ہے جس سے ان کی شاعری، ان کے عہد اور ان کی فکری تبدیلیوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مولوی اسماعیل میرٹھی ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد مغلوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور انھیں میرٹھ میں جو جاگیر عطا ہوئی وہ بھی مغلوں کی ہی عطا تھی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر میں قرآن پاک سے شروع ہوا۔ ابتدا میں زبان فارسی کی تعلیم کے لیے مرزا حکیم بیگ کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا تقریباً چودہ سال کے ہوں گے جب غدر کا ہولناک واقعہ رونما ہوا جس نے آپ کے ذہن پر اثر چھوڑا۔ انگریزوں کی حکومت کی قیام کے بعد سکولوں میں انگریزی اساتذہ کا تقرر بھی ہو چکا تھا۔ مولانا کو میرٹھ کے ایک سکول میں والد کی منشا کے مطابق داخل کروایا گیا جس کے ہیڈ ماسٹر ایم کیزبن تھے۔ اس سکول میں آپ نے منشی ایسری پرشاد آنجہانی سے فزیکل سائنس اور علم ہیت کے مضامین پڑھے۔ آپ کو علم ہندسہ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ یہاں کے سکول سے تعلیم کے بعد آپ رُڑکی کالج اوورسیری کی تعلیم حاصل کرنے گئے۔ وہاں سے واپسی پر آپ کو ملازمت کرنا پڑی اور انسپکٹر مدراس سرکل میرٹھ میں بطور کلرک ملازم ہوئے۔ ایک عرصہ سہارن پور میں مدرس فارسی بھی رہے لیکن قدرت ایک بار پھر کلرک کی حیثیت سے میرٹھ لے آئی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ شاعری سے بھی واقفیت حاصل کر چکے تھے اور فارسی میں چند اشعار بھی کہہ لیتے تھے جس کا علم شیخ قمرالدین کو بخوبی تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا اسماعیل میرٹھی مرزا غالب کو اپنا استاد مانتے تھے شاید اسی لیے مولانا کے کلام میں کچھ غزلیں غالب کی زمینوں میں لکھی ہوئی بھی ملتی ہیں۔

دوسری بار میرٹھ واپسی پر جب آپ کا تقرر بحیثیت انسپکٹر مدراس ہوا تو وہاں آپ نے انگریزی نظموں کے ابتدائی تراجم دیکھے۔ ان دنوں ممالک مغربی و شمالی اودھ کے ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم مسٹر کیمسن تھے جن کے حکم سے مسٹر ٹی جیکن انسپکٹر مدراس سرکل میرٹھ نے انگریزی زبان کی اخلاقی نظموں کا انتخاب کر کے اس کا ترجمہ قلق میرٹھی سے کروایا۔ آپ

اسی دفتر میں کام کرتے تھے تبھی ان نظموں کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہیں سے آپ کی فکر میں تبدیلی آئی کہ جہاں بھاری بھر کم تشبیہات و استعارے اور مبالغہ آمیز شاعری کی جا رہی ہے وہیں آساں و سادہ الفاظ میں مناظر قدرت اور جذبات انسانی کا خوبصورت اظہار یوں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان تراجم سے متاثر ہو کر مولانا نے چند انگریزی کی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ جہاں لاہور میں ایک انجمن کے تحت اردو شاعری میں ایک بڑا انقلاب رونما ہو رہا تھا اور اس کے دیگر علاقوں میں بھی جلسے منعقد کروائے جا رہے تھے یہاں کے شعرا نے بھی ان کے اثرات اور مثبت تبدیلیوں سے فائدہ اٹھایا جن میں مولانا بھی شامل تھے۔ انھوں نے اس زمانے میں فارسی کی درسی کتب کی تالیف، قواعد اردو کی تحقیق، نظموں کی ترتیب، نجم الاخبار کے لیے مضمون نگاری، تدوینی کام وغیرہ انجام دیے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے شاگرد وزیر سنگھ کی دو انگریزی کتابوں کے ترجموں کی عبارت بھی درست فرمائی تھی جو اناٹومی اور فزیالوجی پر مشتمل تھیں۔ انھوں نے عملی کاموں میں بھی اپنا اہم کردار ادا کیا جس میں میرٹھ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے پہلا مسلم سکول قائم کیا، مسلم لیگ کی شاخ کا دفتر قائم کیا جس کا آپ کو وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا، علی گڑھ ٹیچرز کانفرس میں بحیثیت استاد رہے اور انجمن ترقی اردو کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی کا حالات کے مطابق ایک بار آگرہ اور دلی کا بھی دورہ ہوا۔ دلی میں ان کی ملاقات مولانا محمد حسین آزاد سے منشی ذکا اللہ کی بدولت ہوئی۔ مولانا کا تعارف سن کر آزاد نے ان سے انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لیے نظموں کی فرمائش کی جس پر مولانا نے تین مثنویاں " مکھیاں، چاند اور آب زُلال " طبع فرمائیں۔ " آب زُلال " ان نظموں سے میل کھاتی ہے جنھیں آزاد اور حالی نے اردو شاعری میں متعارف کروایا تھا۔ مولانا کی فطرت سے دلچسپی اور مناظر قدرت کا نظموں کی صورت میں بیان اس حوالے سے بھی منفرد اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے ان چیزوں کو قریب سے دیکھا محسوس کیا اور پھر تحریر کا حصہ بنایا۔ جیسے دوران ملازمت انھیں پہاڑ پر کچھ وقت رہنا پڑا تو اسے " کوہ ہمالہ " نظم کی شکل میں بیان کیا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اردو ادب میں شعری و نثری دونوں حوالوں سے بہت کام کیا۔ سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی ان کی تحریکوں میں شامل رہے اور اپنی خدمات انجام دیں۔ آپ کا انتقال میرٹھ میں ہی ا نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا۔ (۲۵)

یہاں ان کی کتب کی فہرستوں کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس مختصر تعارف میں اس پس منظر کو بیان کرنا تھا جو ان کی شاعری کے حوالے سے فکری تبدیلیوں کو بیان کر سکیں اور اس نکتے پر بھی روشنی ڈالی جا سکے جس متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے انگریزی اقتدار کو نہ صرف قبول کیا تھا بل کہ اس کی شان میں ان کا کلام بھی ملتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سر سید اور

ان کے رفقا انگریز کی علمی سطح کو مان کر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور عوام کو اس کے مثبت پہلوؤں سے آشکار کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے وہیں اسماعیل میرٹھی نے بھی انھی کی روش کو اختیار کیا اور ان کی جانب سے ہونے والے مثبت اقدام کو نہ صرف سراہا بل کہ اسے قبول کرتے ہوئے اس حوالے سے مثبت کام بھی سر انجام دیے۔ ذیل میں ان کی شاعری کا نو آبادیاتی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

انگریزوں کے ہندوستان پر حکومت کے بعد جہاں سیاست پر چند منفی اثرات مرتب ہوئے وہیں اگر دیکھا جائے تو تعلیمی میدان میں کئی مثبت چیزیں بھی سامنے آئیں جن سے ہندوستانی ادب خصوصاً اردو ادب پر گہرا اثر ہوا۔ انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے اور اس میدان میں ہونے والی نصابی تبدیلیوں نے بڑی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ مسلمانوں کے چند ایک قائدین اور فکری اذہان نے ان سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے عوامی سطح پر اس شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تحریروں سے مسلمانوں کے اس طبقے میں شعور بیدار ہوا جو انگریزوں کو مکمل طور پر اپنا دشمن سمجھ بیٹھے تھے اور ان کی بنائی ہر چیز سے نفرت کا اظہار کرتے تھے کچھ سنبھلے اور ان کی مثبت چیزوں سے سیکھنے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب حکومت کرنے والوں سے سیکھ کر ہی ان کا تختہ پلٹا جا سکتا تھا۔ سید احمد دہلوی، سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، نذیر احمد، مولوی عبد الحق اور ان کے رفقائے کار نے اس میدان میں کارہائے نمایاں سر انجام دیے۔

مولانا اسماعیل میرٹھی بھی اسی عہد کا ایک نمایاں نام ہیں جنھوں نے آزاد، سر سید و عبد الحق کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ان کا ساتھ دیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو جان چکے تھے کہ مفاہمت کی راہ یہی ہے۔ میرٹھی کی شاعری میں اس کے اثرات کئی جگہوں پر دیکھے جا سکتے ہیں جہاں وہ انگریزی اقتدار کی بھرپور حمایت کرتے ہیں:

لاکھوں چیزیں بنا کر بھیجے انگریز
سب کرتے ہیں دندان ہوس اس پر تیز
چڑتے ہیں مگر علوم انگریز سے
گڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز(۲۶)

نو آبادکار کی چیز کو قبول کرنا، اور اسے اپنے مقصد کے تحت استعمال کرنا جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق بالکل درست گردانا گیا تھا اور اس کا اقرار اسماعیل میرٹھی اس " جھوٹی نفرت " میں بخوبی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں اس جنگ عظیم کے بعد تباہی و بربادی کے منظر کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے تھے وہیں کچھ علاقے ایسے بھی شامل تھے جو اس جنگ سے قدرے محفوظ رہے تھے۔ میرٹھ کا شمار بھی انھی علاقوں میں ہوتا ہے۔ وہاں کی ادبی فضا اور شعرا کی دل چسپیاں و مشاعرے

بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ شاداب علیم امیر اللہ خاں شاہیں کے خیالات بیان کرتی ہیں کہ ان کے مطابق میرٹھ وہ علاقہ تھا کہ جہاں دہلی کے مقابلے میں زیادہ امن وامان قائم رہا۔ زبان اور تہذیب پر سکون امن کے دور میں ہی ترقی پاتے ہیں اسی لیے شاید حالات میرٹھ کی زبان کو پختہ اور رچا ہوا بناتے رہے ہیں۔" میرٹھ اجڑا کم ہے سنورا زیادہ ہے"۔ (۲۷) ایسے حالات میں جب حساس ذہن کا قلم چلتا ہے اور وہ سماج کو اسی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے جیسا وہ دکھائی دے تو پھر اس کے قلم سے تہنیتی الفاظ ہی نکلتے ہیں۔ پھر جہاں ایسے حالات کا نقشہ اسماعیل میرٹھی" خدا قیصرہ الہند کو سلامت رکھے" کی شکل میں کھینچیں تو اس پر حیرت نہیں کی جا سکتی ہے۔

عیش وطرب کے ہیں یہاں چہچے
کون بھلا جبر کسی کا سہے
کیوں نہ تہ دل سے رعایا کہے
جب تک اس اقلیم میں گنگا بہے
قیصرہ الہند سلامت رہے
ہند کا اس عہد میں بدلا مزاج
عدل نے اس دور میں پایا رواج
جملہ مفاسد کا ہوا ہے علاج
سب کی تمنا ہے کہ با تخت وتاج
قیصرہ الہند سلامت رہے (۲۸)

برطانوی حکومت نے مختلف راہنماؤں کی صورت میں برصغیر کی سرزمین پر منہ میں مٹھاس بھرے کردار بھیجے تھے۔ ان کی بظاہر نظر آنے والی خدمات اور الفاظ کسی بھی بڑے سے بڑے ذہن کو باآسانی شیشے میں اتار سکتے تھے۔ ایسا کئی سطحوں پر دیکھنے کو ملا۔ پری پلان منصوبے کے تحت ہر صوبے کے سامنے نظر آنے والے علاقوں میں ایسی بنیادی تبدیلیاں اور بہتریاں کی گئیں کہ ہمارے اذہان اس چیز کو مان بیٹھے کہ اب ہماری ترقی کا رز ابس انھی کے ہاتھ میں ہے۔ یہی ہماری بہتری چاہنے والے ہیں۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

بس کہ رعایا پہ ہے وہ مہرباں
کرتی رعایا ہے نثار اس پے جاں
شرق سے تا غرب کراں تا کراں

ملک اس آہنگ میں ہے نغمہ خواں
قیصرہ الہند سلامت رہے
فتنہ تو اس دور سے بس دور ہے
صلح سے اور امن سے معمور ہے
عافیت اس وقت کا دستور ہے
اس لیے افواہ میں مذکور ہے
قیصرہ الہند سلامت رہے (۲۹)

ایسے ہی" تہنیت جشن جوبلی حضور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصر ہند دام اقبالہا" میں ایک ترتیب سے اسی قسم کی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں پہلے ان حالات کا ذکر ہے جب ہندوستان کی خوشحالی اور اس کی ترقیوں کا دور دورہ تھا، جس کا شکرانہ خداوند کریم سے کیا جارہا ہے۔ تمام ادارے اپنے کام بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد ملکی تعمیر و ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے تھے۔ پھر اس دور کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب ہندوستان پر آل تیمور، غوری و خلجی، تغلق و شیر شاہی حکومتیں قائم تھیں۔ پھر اکبری دور اور پرتگیزیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا دور چلا جنھیں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

کس زباں سے ہو تری حمد و ثنا
ملک کو تو نے نئے سرے کیا سرسبز
جاٹ گردی تھی کبھی گاہ مرہٹہ گردی
کبھی پنڈاروں کا تھا ڈر کبھی سکھوں سے ہراس
پرتگیز اور ولندیز و فرانسیس بھی تھے
ملک گیری کی جنھیں بھوک تھی اور مال کی پیاس (۳۰)

جہاں اس دور میں غیر ملکی باشندے جو اپنے پیر جمانے میں مصروف تھے۔ علاقائی لوگوں کو اپنے جھانسے میں پھنسا کر ان سے فوائد حاصل کرنا خوب جانتے تھے۔ کچھ افسر شاہی بھی زر کی لالچ میں انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکے تھے۔ ایسے حالات میں ملکی نظام میں دراڑیں پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ جہاں انگریزوں نے ایک مفاہمت کے تحت اپنے پنجے برصغیر میں گاڑھے۔ کچھ ایسے کردار بھی شامل تھے جو سب کا بھلا چاہتے تھے لیکن بہت سی اندرونی سازشوں سے ناواقف تھے۔ اسماعیل

میرٹھی نے کچھ نام بیان کیے ہیں جن میں لارڈ کلائیو، ہیسٹنگز، ولزلی، ڈلہوزی، فورتھ ولیم شامل ہیں۔ وہیں جب غدر کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ملک کی بدلتی صورت حال کا تاج ملکہ وکٹوریا کو پہناتے ہیں:

غدر کے بعد ہوا دور شاہی کا آغاز
نیر دولت و اقبال چڑھا سمت الراس
پھر نئے سر سے ہوا کاخ حکومت ترمیم
قیصری قصر کی ہونے لگی مضبوط اساس(۳۱)

جہاں ہم مجموعی حوالے سے دیکھتے ہیں جنگ عظیم کے بعد برصغیر ہندوستان میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہوئیں۔ ہر شعبہ زندگی اس سے متاثر ہوا۔ بہت سوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور کئیوں نے انھیں قبول کرتے ہوئے ان سے فائدہ حاصل کیا جو اس وقت کی ضرورت تھی۔ اسماعیل میرٹھی نے اپنے اس کلام میں وہ تمام تر نقشہ بڑی ترتیب سے کھینچا ہے اور ان چیزوں کا برملا اعتراف کیا ہے جو اس وقت میں تبدیل ہوئیں اور جنھوں نے طرز حکومت کو بدلا اور بڑے پیمانے پر مثبت تبدیلیاں لائیں:

گاؤں در گاؤں ہوئیں علم کی نہریں جاری
اوکھ سے پینے لگے جن کو لگی زور کی پیاس
فیض تعلیم سے عالم ہوئے جاہل ہندی
کوئی عالم کوئی منشی تو کوئی حرف شناس
دم بدم ابر ترقی ہوا گوہر افشاں
کوئی ایف اے کوئی بی کوئی ایم اے ہی پاس
دور شاہی نے ترے ان کو بنایا انسان
ان میں کھانے کا سلیقہ تھا نہ تمیز لباس(۳۲)

ان کمزوریوں کا اظہار کرنا اور ان چیزوں کا اعتراف کرنا جو انگریزی حکومت کے مکمل قدم جمانے سے مثبت تبدیلیاں لا رہی تھیں انھی کا کام تھا جو فکری سطح پر یہ جانتے تھے کہ یہی عوام کی بہتری اور ان کی بھلائی کے لیے اچھا ہے۔ یہی وہ تبدیلیاں ہیں جنھیں اپنانے سے وہ شعوری طور پر اس مقصد کو جان سکیں گے جس سے وہ ترقی کر سکتے ہیں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ان عوامل کا اور ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کا بھی ایک یہ طریقہ تھا جو ایسی تبدیلیوں کا

باعث بن رہے تھے۔ ایک اور جگہ اسماعیل میرٹھی "تہنیت سالگرہ حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند دام اقبالہا" میں دعائیہ اشعار پیش کرتے ہیں:

جانتے ہیں ہم سبھی کون ہے ایسا سخی
قیصر ہندوستاں حضرت وکٹوریا
ایسے شہنشاہ کا سایہ ہو جس ملک پر
اس کے مبارک نصیب ہے وہی عشرت سرا
اپنی رعایا ہے اسے دل و جاں سے عزیز
اس کی رعایا اسے دیتی ہے دل سے دعا(۳۳)

ایسی ہی اور بھی مثالیں موجود ہیں جس میں اسماعیل میرٹھی نے انگریزی حکومت کی شان میں دل کھول کر لکھا ہے اور داد پیش کی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عطاالرحمن میوان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب مسلم راہنماؤں نے اور اہل قلم نے انگریز کے وجود کو تسلیم کر لیا اور ان کے قائم کردہ نظامی ڈھانچے سے اپنے فوائد دیکھنے لگے تو اس وقت کے شعرا کے ہاں ایک روش یہ بھی دیکھی گئی کہ جہاں وہ اپنے فن خطابت کا لوہا منواتے تھے وہیں انگریز حکومت کے اوصاف بیان کرنے سے بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے اور خصوصی طور پر مادر ملکہ کی لمبی عمر کی دعائیں مانگنے کے ساتھ ساتھ حکومت سے بھی اپنی ذہنی و قلبی وابستگی و محبت کا بر ملا اظہار کرتے تھے۔ (۳۴) اسماعیل میرٹھی کے ہاں بھی جو قصائد ملکہ وکٹوریا کی شان میں لکھے گئے ہیں ان میں ایسی ہی دعائیں اور تعریفی کلمات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک اور نمونے " جشن سالگرہ ملکہ وکٹوریا آنجہانی قطعہ مبارک باد (اعلی جناب ہیوٹ) " سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہمارے حاکم اعلی جناب ہیوٹ کو
نیا حضورِ شہنشاہ سے خطاب ملا
اگر مخاطب والا کا ہے خطاب بلند
خطاب کو یہ مخاطب بھی لاجواب ملا
مبارک آپ کو ہو نجم ہند کا الماس
ہمیں خوشی ہے دوبارہ یہ آفتاب ملا(۳۵)

اس کے ساتھ ساتھ ہی جب جارج پنجم کی ہندوستان آمد کے چرچے ہر سو ہوتے ہیں تو انھیں بھی ایک نظمیہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں بالترتیب ان کی آمد سے لے کر ان کے اوصاف بیان کرنے تک کو اشعار کی صورت لکھا گیا ہے۔ جس میں اس چیز کا اعتراف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا ہے کہ ایک شاعر کس طرح مدح سرائی کرنے کو دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کی یا اس دور میں انگریزی حکومت سے جڑے ہر شخص کی تعریف و توصیف اور اس کے کارنامے بیان کرنے کو اپنا ایک فرض سمجھتے ہیں۔ ذیل میں ایک مثال" نوید مقدم شاہی" کے عنوان سے پیش کی جاتی ہے:

جارج پنجم خسرو گیتی ستاں
جانبِ ہندوستاں آنے کو
وارثِ تاج و نگین قیصری
داورِ دارالستاں آنے کو ہے
مدح سنجی کے لیے دربار میں
شاعرِ جادو بیاں آنے کو ہے (۳۶)

انھی جارج پنجم کی ہندوستان آمد کے بعد جب ان کی تاج پوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے تو ان مناظر کو اور اس تیاری کو بھی اسماعیل میرٹھی نے ایک جشن کی صورت میں بیان کیا ہے۔ جسے" جشن تاج پوشی اعلحضرت جارج پنجم شاہِ قیصر بدارالخلافہ دہلی" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف دعائیہ اشعار شامل ہیں، بل کہ ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان میں ان کی آمد پر ہر طرف خوشی کا سماں ہے۔ ہر کوئی تیاریوں میں مصروف دکھائی دے رہا ہے۔ دربار اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کو سجا دیا گیا ہے۔ لوگوں میں ان کی عزت اور محبت کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے جو ان کی آمد پر خوشی سے نہال ہیں کیوں کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں زرعی و تجارتی سطح پر بہت سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ان سب کی جھلک ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:

ہو رہی ہیں جشن کی تیاریاں
کارفرما شوق سے مصروفِ کار
ہو مبارک تجھ کو اے ہندوستاں
جارج پنجم کا عہدِ زر نگار
رونق افروزے شاہنشاہ نے

تجھ کو بخشا ہے وہ عز و اعتبار
علم و دانش کے کیے دریا رواں
ریگ زاروں کو بنایا لالہ زار
عدل کے دستِ قوی سے ہو گئیں
امن و راحت کی بنائی استوار
کیا زراعت کیا تجارت کیا ہنر
سب پھلے پھولے نکالے برگ و بار
ہند کا ہر اک گوشہ سچ مچ بن گیا
اس مبارک دور میں باغ و بہار (۳۷)

اس کے علاوہ بھی ایسے اشعار دیکھے جا سکتے ہیں جن میں ایسے ہی اعترافات اور دعائیہ کلمات ادا کیے گئے ہیں جن کی کچھ بڑی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی کو کئی اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جس کے بارے ناہید قاسمی لکھتی ہیں کہ:

> " میرٹھی انگریز پرستی میں حد سے بڑھ گئے تھے اور ان کے قصائد کہتے رہتے تھے۔ اسے غلام ملک کی محکمانہ مجبوری (گورنمنٹ سروس کی مجبوری) سمجھ کر معاف کر دینا چاہیے۔"(۳۸)

جہاں اسماعیل میرٹھی کے ان چند قصائد پر انھیں انگریز پرست کہہ دیا گیا وہیں اس چیز کو بھی مد نظر رکھا جانا ضروری تھا کہ جہاں ایک طرف محکمانہ مجبوری مان بھی لی جائے تو ایسی بھی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ جہاں اپنے گورنر کی شان میں دعائیہ اور تہنیتی اشعار لکھے گئے ہیں وہ ان کی خدمات کے صلے میں ایک شکرانے کی مثال کہے جا سکتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہمارے یہ نیک دل پیرسن ہماری کرتے ہیں سر پرستی
ہمارے ہمدرد ہیں یہ دل سے ہمارے دل کی دوا کریں گے
ہمارے صوبے کے حکمراں نے جو سنگِ بنیاد آ کے رکھا
تو ایسی شاہانہ مہربانی کا ہم عوض کیا ادا کریں گے
مگر کہ جیمس میسٹن کی کبھی نہ بھولیں گے یہ عنایت
دوامِ دولت کی ان کے حق میں خلوصِ دل سے دعا کریں گے (۳۹)

جہاں انگریزی حکومت کے گورنروں کی خدمات کے اعترافات کیے گئے ہیں وہیں جب اپنوں کی حق تلفی کو دیکھتے ہیں تو اس کا بھی برملا اظہار کرنے سے نہیں کتراتے ہیں اور ان کے کیے ان احسانات کو بھی بھلا دیتے ہیں جو ان کے اپنوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر بھاری پڑ جاتے ہیں۔ جہاں جیمس میسٹن کی تعریف کی گئی وہیں جب کان پور مسجد کا واقع پیش آیا اور بہت سے نہتے مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا تو اس موقع پر ایسے اشعار بھی سامنے آئے:

توقع تھی جنابِ میسٹن سے داد پانے کی
مگر افسوس وہ بھی ٹائلر کے ہم نوا نکلے (۴۰)

ان کے علاوہ بھی ایسی بہت سی نظمیں موجود ہیں جو اس دور میں عوامی سطح پر ایک شعور بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہی تھیں۔ جن میں ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی جا رہی تھی جو مسلمانوں کے لیے اور ان کی ترقی کے لیے ضروری تھیں۔ انھیں غفلت سے جگانے اور اس دور کی اور وقت کی حقیقت سے آگاہی دلانے کے لیے بھی ایک اچھی کوشش تھی جنھیں شاعری کی صورت میں بیان کیا جا رہا تھا۔ نوآبادیاتی عہد کے بعد کے مطالعات کو دیکھا جائے تو اس طرح کے رویوں کو مثبت گردانا گیا ہے کہ جب نوآبادیاتی باشندہ نوآبادکار کی بنائی چیزوں کا نہ صرف اعتراف کرتا ہے بل کہ انھیں قبولنے سے بھی انکاری نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں ان کا اپنا فائدہ بھی پنہاں ہوتا ہے اور وہی وقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اسی وقت کی ضرورت کو سب سے پہلے جس شکل میں نوآبادیاتی عہد میں قبولا گیا وہ بعض کے نزدیک تعلیمی نظام تھا۔ اس عہد کی یادگاروں میں جس چیز کو یاد رکھا جاتا ہے ان میں سے ایک " ریل" بھی ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب میں نوآبادیات کی منطق کو سرمایہ دارانہ گردانا ہے۔ اپنے سرمائے میں اضافے کی خاطر انھوں ٹیکنالوجی کا سہارا لے کر بھی ہندوستانیوں پر حکومت کی جس کی ایک نشانی آج بھی " ریل گاڑی" کی صورت میں یاد رکھی جاتی ہے۔ اس چیز پر انھوں نے کثیر سرمایہ خرچ کیا تھا۔ اس پس منظر میں صرف انگریز حکومت نے اپنا کردار ادا نہیں کیا تھا بل کہ ہندوستانیوں کا کردار بھی شامل تھا۔ " سرمایہ دار اور صارف میں بعض خاموش مفاہمتیں ہو جاتی ہیں جو سرمایہ داریت کو کسی مزاحمت کے بغیر جاری رکھتی ہیں۔ "(۴۱) اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی بھی اپنا دامن نہ بچا سکے اور ان کی نظموں میں بھی اس ریل کا ذکر شامل رہا۔ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہونچا گئی وطن میں
ڈالی ہے جان اس نے سوداگری کے تن میں

ہر چیز سے ہے نرالی چال ڈھال اس کی
پاؤ گے صنعتوں میں کمتر مثال اس کی
برکت سے اس کی بے پر پردار بن گئے ہیں
ملک اس کے دم قدم سے گلزار بن گئے ہیں
ہم کہہ چکے مفصل۔ جو کچھ ہے کام اس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اس کا
جی ہاں سمجھ گیا میں۔ پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرہ سے آتی ہے ریل گاڑی(۴۲)

نوآبادکار سے متاثر ہونے والا وہ طبقہ جو اس سے وابستہ ہر شے سے، ہر تصور، ہر عمل اور متعلقہ سہولیات سے متاثر ہوتا اور اسے اپنے لیے وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے اختیار واستعمال کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ تعلیمی نظام ہے، سرکار کی نوکری ہے یا نوآبادکار کی بنائی جدید سہولیات ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں یہ چیز نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی چند ایسی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں کہ جہاں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ انگریز کی طرف سے کسی حوالے سے زیادتی کی گئی ہے یا ناانصافی دکھائی گئی ہے تو وہ اس پر چوٹ کرنے سے بھی نہیں کتراتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے جہاں انگریزی حکومت کی تعریف کی، ان کے اقدامات کو تسلیم کیا ہے وہیں مسلمانوں کو ان کی اصل کی بھی یاددہانی کرانے سے گریز نہیں کیا۔ اپنے ایک اور قصیدے" انگریزی فیشن والے "میں ان پر چوٹ بھی کرتے ہیں اور ان کی ترقی کے راز کو بھی بیان کرتے ہیں:

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نے خدا ترسی
گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم ہیں لبرل ہیں یا رڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار(۴۳)

انگریزی حکومت چاہے خود کو جیسا بھی پیش کرے یا جیسا بھی سمجھے لیکن ہماری نظر میں وہ غیر ہی ہیں۔ ہمیں ان کی ذات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے بس اس مشکل وقت میں ان سے سیکھنا ہے اور ان کے بنائے نظام سے اپنا اجڑا نظام سنوارنا ہے۔ اسماعیل

میرٹھی اس قصیدے میں مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے بھی یاد کرواتے ہیں اور ان کی موجودہ اجڑی صورت حال پر انھیں جھنجھوڑتے بھی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

وہ اہل فضل کہ تھے افتخار ہندوستاں
اب ان کی نسل کو دیکھو تو ہے وہ ٹھیٹ گنوار
وہ جن کے نام سے نامی تھے شہر اور قصبات
گداگری میں ہے مصروف ان کا خیل تبار
وہ دودمان امارت کے تھے جو چشم و چراغ
اب ان کے ہاتھ میں ڈھولک ہے یا بغل میں ستار
جو منتخب تھے نجابت میں اور شرافت میں
اب ان کی آل کو دیکھو تو سخت بدکردار
یہ ہانکتے ہیں جو گاڑی کسی مہاجن کی
انھیں کے مورث اعلی تھے صوبہ دار بہار
ہے آج ٹکڑے کو محتاج ان کی ذریت
کہ جن کی دھاک تھی سلہٹ سے لے کے تا قندھار
امارت اپنی امیروں نے قرض میں کھو دی(۴۴)

اپنے اسلاف کی کامیابیوں اور ترقیوں سے جہاں ہم واقف ہیں اور ان کی خدمات کے چرچے ایک عالم میں مشہور ہیں۔ وہیں دوسری جانب ان کی اپنی راہ، اپنی اصل سے ہٹنے کی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کی داستاں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز مکمل طور پر ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑھ چکے تھے۔ اسماعیل میرٹھی جب قوم سے مخاطب ہو کر انھیں ان کا روشن ماضی یاد کرواتے ہیں تو ساتھ ہی ان وجوہات کا ذکر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ سونے کی چڑیا اپنی خوبصورتی کھو چکی تھی۔ دولت کے نشے میں ڈوب کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھی۔ اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اپنی راہ تلاشنے والوں کا پھر یہی حال ہوتا ہے۔ مزید شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

وگرنہ کس کو یہ غم ہے؟ کہ میری پیاری قوم
ہوا ہے زرد یہ کیوں تیرا چہرۂ گلنار
یہ تیرے پھول سے پنڈے پہ کیوں ہے میل کچیل؟

یہ تیرے چاند سے مکھڑے پہ کیوں ہے گرد و غبار؟
کدھر ہے تیری طبیعت؟ کہاں ہے تیرا دل؟
خموش کیوں ہیں؟ یہ تیرے لب شکر گفتار
اٹا ہے خاک سے کیوں؟ تیرا یہ دامن دولت
چبھے ہیں کیوں تیرے تلوے میں مفلسی کے خار؟
کہاں ہے وہ تیری عزت کا گوہر رخشاں؟
کہاں ہے وہ تری حشمت کا خلعت زرتار (۴۵)

ان تمام ناکامیوں اور کمیوں کی نشان دہی سے ہی ان وجوہات تک پہنچا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اقوام اپنی ڈگر سے ہٹ کر اپنی اصل سے دور ہو جاتی ہیں۔ انھیں پھر کیسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی مثالیں تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی جہاں اپنی قوم کے کارناموں اور کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ نہ صرف ان کی ناکامیوں اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والی وجوہات کو بھی بیان کرتے ہیں بل کہ انھیں آئینہ دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ نیز مسلمانوں کو ان راستوں کی نشاندہی بھی کرواتے ہیں جن پر چل کر وہ پھر سے اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اپنا کھویا مقام حاصل کر سکتے ہیں:

اگرچہ ملک میں علم و ہنر کا ہے چرچہ
حصول عزت و دولت کا گرم ہے بازار
پلٹ گیا ہے زمانہ بدل گئی ہے رت
نمو کا وقت ہے اور ابتدائے فصل بہار
زمانہ چونک پڑا ہے پر اے مسلمانو!
جھنجھوڑنے سے بھی ہوتے نہیں ہو تم بیدار (۴۶)

اور بیداری کے لیے مسلمانوں کو اس وقت جس چیز کو حاصل کرنے کی اشد ضرورت تھی وہ تھی تعلیم اور اس میدان میں ہم ابھی بہت پیچھے تھے کہ انگریزوں کی بنائی تعلیمی اصلاحات کو اتنی جلد قبول کر لیتے یا ان کے بنائے نظام میں بالکل ویسے ہی ضم ہو جاتے جس طرح وہ ہماری سرزمین پر ہوئے۔ اس حوالے سے بھی اسماعیل میرٹھی نے ان تعلیمی تبدیلیوں کو بخوبی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ اور وقت کی ضرورت جانتے ہوئے مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کروانے کی کوشش کی ہے کہ

جس سے ہم پھر سے اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ جس کی ایک مثال "مسلمان اور انگریزی تعلیم" کی صورت میں پیش کی جاتی ہے:

ایک دن تھا بحکمِ سرکاری
گئے اسکول جا بجا کھولے
نہ تو کچھ فیس تھی نہ داخلہ تھا
مفت تعلیم تھی اُسے جو لے
ہم مسلمان سب اکڑ بیٹھے
پہلے فتویٰ جواز کا ہو لے
مُنہ زبانی بھی اور لکھ کر بھی
پوچھ گچھ کی تو مولوی بولے
" ایسی تعلیم سے تو بہتر ہے
آدمی ٹوکری کہیں ڈھو لے "
اُن کو تنقیصِ دین کی سوجھی
تھے تعصّب کے آنکھ میں پھولے (۴۷)

یہ وہ وقت تھا جب انگریز سرکار کی طرف سے مختلف تعلیمی اصلاحات نافذ کی جا رہی تھیں۔ انگریزی زبان کو لازمی قرار دے دیا گیا تھا اور صرف انھی لوگوں کو سرکاری نوکری دی جاتی تھی جو اس سے واقف ہوں۔ اس حوالے سے مسلمانوں کا ایک طبقہ تو اسے وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے اسے قبول کر چکا تھا۔ جب کہ دوسری جانب ایک ایسی سوچ بھی موجود تھی کہ جن کا کہنا تھا کہ ہمارے نزدیک اس بدیسی زبان کے سیکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیں۔ یہ وہ طبقہ تھا جو نوآبادکار کے مقابلے میں مکمل طور پر باغیانہ جذبات لیے ہوئے تھا۔ اور اس چکر میں:

وہم و وواس کے رہے چلتے
سالہا سال توپ اور گولے
رہ نما بے خبر تو بات کو پھر
کون میزانِ عقل میں تولے
رہے علمِ معاش سے کورے

شہر قصبے محلّے اور ٹولے
ہیں ہمارے جو اور ہمسایے
گویا بیٹھے ہی تھے وہ مُنہ کھولے
خوانِ یغما پہ جا کے ٹوٹ پڑے
بھرلئے ٹھونس کر جھولے(۴۸)

اسی وہم وگماں کے ترازو میں ہم ایک عرصہ ڈانواڈول رہے۔ جو سمجھ گئے وہ نکل گئے اور جو ٹھہرے ذرا وہ مزید کچل گئے۔ اس حوالے سے ہمارے ہمسائے جو انگریز کی چال اور پالیسی سے بخوبی واقفیت حاصل کر چکے تھے اور ہمارے مقابلے میں اپنی ایک خوشامدانہ تصویر پیش کر چکے تھے اس حوالے سے نوازے گئے۔ نوکریوں کے حصول سے لے کر تعلیمی میدان مارنے تک انھوں نے وقت کی نزاکت کو بخوبی سمجھا اور اسے استعمال کیا۔ دوسری جانب ہم اور ہماری سرکار منہ تاکتے ہی رہ گئے۔ کچھ جو سمجھانے والے اور سیدھی راہ دکھانے والے موجود تھے وہ ہمیں آئینہ دکھاتے رہے:

محکموں کی پلٹ گئی کایا
آفسوں کے بدل گئے چولے
کہا سیّد نے قوم سے "ناداں!
تو بھی اُٹھ بیٹھ ہاتھ مُنہ دھو لے
پیچھے اُمید جمع خرمن کر
پہلے کھیتوں میں بیج تو بولے
تب ہوئی کچھ جِھجک ہماری دور
اور ہم نے بھی بال وپر کھولے(۴۹)

اس کلام میں وہ مکمل کہانی بیان کی گئی ہے جو حالات جنگ کے بعد ہماری عوام میں تعلیمی سطح پر پیدا ہوئے۔ وہ تعلیم جسے ہم نے انگریز کی تعلیم کہہ کر جھٹلا دیا اور مزید پستیوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ جنھوں نے اس مصلحت کو سمجھا اور اسے اپنایا وہ وقت کے ساتھ اسی میدان میں شامل ہوئے جہاں انھیں انگریز کے برابر تو نہیں پر اسی میدان میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ ایسے میں چند ایسے قائدین اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سر سید اور ان کے رفقا کے ساتھ ساتھ اسماعیل میرٹھی بھی ان تحریکوں میں شامل رہے اور اپنا حصہ بخوبی ڈالا۔ ان کی شاعری میں ایسی

مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں انگریزوں کی ہونے والی تبدیلیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس مثال میں لفظوں کی تبدیلی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک نمایاں مثال " مریض علم پر خدا کی رحمت" ہے:

کھلائی گیڑیوں کے بدلے ہاکی
تلافی کی بھی تو صاحب نے کیا کی
قیامت آئے گی فٹ بال پر بھی
اڑے کاغذ تو پیپر ویٹ رکھا
نہ کچھ پیری چلی بادِ صبا کی
معاذاللہ اس موٹر کی رفتار
حقیقت کیا سمند بادبا کی(۵۰)

جہاں اسماعیل میرٹھی نے اس دور کی برطانوی حکومت کی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے وہیں ان کی شاعری میں اس عہد کی لسانی سطح کی تبدیلیوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی شامل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جہاں اسماعیل میرٹھی اس دور کی اہم ضرورت کے تحت ہر تبدیلی کو قبول کر اس میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے، انگریزی کی نوکری کر رہے تھے، دوسری طرف انھوں نے انگریزی نظموں کے کچھ تراجم بھی کیے تھے جن میں کیڑا، ایک قانع مفلس، موت کی گھڑی، فادر ولیم، حب وطن اور انسان کی خام خیالی بنیادی مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں قلق میرٹھی کے کیے جانے والے تراجم بھی ان کی نظر سے گزرے تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیٹے سے بھی انگریزی تعلیم کے حوالے سے کچھ نہ کچھ سیکھتے سمجھتے رہتے تھے۔ اس لیے بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کو غیر شعوری کوشش بھی کہا جاسکتا ہے۔

جملہ ڈیلیگیٹ سے اب خیر مقدم عرض ہے
اور پریزیڈنٹ کی خدمت میں شکریہ ڈبل(۵۱)

اس طرح کی اور بھی مثالیں کہیں مصرعوں کی شکل میں اور کہیں شعر کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اوپر پیش کردہ مختلف مثالوں کے ساتھ ساتھ آخری ایک مثال ایسی بھی ہے جس میں دو کردار شامل ہیں۔ یہ نظم انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم کو اس دور کے نظام سے بھی جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے جہاں انگریز کا کردار " کلن" کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے اور ہندوستان کی حکومت کو" مفلس" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں زباں اگرچہ عوام کے پاس ہے اور اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہے۔ جو اس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جو اسے قبول کر چکا ہے، اسی کے رحم و کرم پر اپنی

روزی روٹی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی اس بات سے واقف ہے کہ میں اس حال میں مطمئن ہوں اور اس سے بہتر زندگی جی رہا ہوں کیوں کہ میرے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں سرمایہ دار یا نوآبادکار کے کردار کو کلن کی صورت میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

سو ہزار ایکڑ ہے کلن کی زمیں
ملک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اس کا نہایت شان دار
اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار
ان گنت ہے اس کی نقدی و مال
ایک پائی کے لیئے میں پائمال
اس کا رتبہ ہے بڑا عزت بڑی
میرے سر پر خاک ذلت کی پڑی
ہے زمیندار آج کلن واقعی
زر سے پر ہے اس کا دامن واقعی (۵۲)

دولت دنیا میں آدھا بھی نہیں مصرعوں کی صورت میں ایک ترتیب اس نظام کو بخوبی بیان کررہی ہے۔ جہاں سرکار اور عوام کے رہن سہن، طور طریقوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا وجود ہی ایک ایسی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد صرف اور صرف سرمائے کا حصول تھا۔ پھر چاہے وہ کسی بھی شکل میں موجود ہو۔ جب یہ نظام سولہویں، سترہویں صدی میں یورپ میں سامنے آیا تو اس میں ریاست کی بجائے تجارت اور صنعت کے شعبوں کو کنڑول کرنے کے منصوبوں کی طرف زیادہ زور دیا گیا تھا۔ جس کی ایک مثال خود برصغیر پاک وہند پر برطانوی سامراج کے قبضے کی داستاں ہے ایوب ملک اس حوالے سے نوم چومسکی کے خیالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> ۱۷۰۰ء کی دہائی میں ساؤتھ ایشیا صنعتی ترقی میں بہت آگے تھا اور ۱۸۲۰ء تک برطانیہ کے صنعت کار یہاں پر لوہا سازی کی تربیت لینے آیا کرتے تھے۔ ریل کے انجن بنانے کی جو صنعت بمبئ میں تھی وہ ٹیکنکل طور پر برطانیہ کے برابر تھی۔ برصغیر کی لوہے کی صنعت اور بھی زیادہ ترقی کرسکتی تھی اگر برطانیہ کی جانب سے امپورٹ پر ڈیوٹیاں نہ لگائی جاتیں۔ دوسرے لفظوں میں برطانیہ نے دانستہ طور پر ہندوستان کی لوہے اور ٹیکسٹائل کی صنعتوں کو برباد کیا۔ برطانیہ نے وہاں ٹیکسٹائل پر ڈیوٹی اور بعد میں مکمل پابندی عائد کردی تھی۔ (۵۳)

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں سونے کی چڑیا کے نام سے جانا جانے والا یہ خطہ کچھ ہی عرصے میں بد حالی کا شکار ہو گیا۔ جس میں صرف معاشی بد حالی شامل نہ تھی ہر شعبہ زندگی اس اجارہ داری سے متاثر ہوا تھا۔ جس کا مقصد صرف اور صرف اس ملک کی صنعتوں اور سرمائے کی بربادی اور اپنے فائدے کے حصول کے لیے ان کا استعمال تھا۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر کی یہ بات بھی بالکل بجا معلوم ہوتی ہے کہ " نوآبادیات کی اگر کوئی منطق تھی تو وہ سرمایہ دارانہ تھی۔"(۵۴) مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

ست ہے کلن بایں ناز و نعم
میں ہوں چاق و چست ہر دم تازہ دم
واں امیرانہ ہے مخمل کا لباس
میں ہوں مفلس میری پوشش ہے پلاس
وہ ہے قیدی۔ پائے بند ملک و مال
اور میں آزاد ہوں مثل خیال
ڈاکٹر واں بیس ہیں بہر علاج
یاں نہیں ہے ایک کی بھی احتیاج
ہے مصیبت مال و دولت میں بڑی
موت کا دھڑکا ہے اس کو ہر گھڑی(۵۵)

یہ وہ سرمایہ دار ہے جو شش جہاتی سہولیات کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تہی دامن خیال کرتا ہے۔ بیسیوں پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے۔ زر کا حصول اسے چین نہیں لینے دیتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ طبقہ ایک ایسے انجانے خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہے۔ جس علاقے پر قبضہ جمائے ہوتا ہے اسے وہاں کے لوگوں سے بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کے بیچ جلنے والی چنگاری بغاوت کا شعلہ نہ بن جائے اور اس کی آگ میں کہیں اس کا وجود خاک نہ ہو جائے۔ ایسے ہی انجانے خوف اسے زندگی کی کسی بھی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتے ہیں۔ اس متعلق شاداب علیم لکھتی ہیں:

> قناعت مفلس کی بہترین دولت ہے۔ سرمایہ داروں کو کبھی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہیں۔(۵۶)

لطف قدرت کا نہیں اس کو نصیب
یہ بہار بے خزاں بھی ہے عجیب

یہ بیاباں یہ سمندر یہ ہوا
گونجتی ہے ان میں قدرت کی نوا
کان سے کلن کی لیکن دور ہے
وہ تو دولت کے نشہ میں چور ہے
راگنی قدرت کی ہر دم ہے چھڑی
میں توہوں اس لے کا دیوانہ سڑی (۵۷)

سرمایہ دار اور اپنے درمیان دنیاوی دولت کا موازنہ کرتا ہے۔ جسے بے انتہا دولت کی وجہ سے معاشرے میں بے انتہا عزت حاصل ہے۔ اسماعیل میرٹھی جو مفلس طبقے کی حمایت میں کھڑے نظر آتے ہیں ان کی نظر میں ایک مفلس سرمایہ دار سے بہتر ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے کلام میں سے یہ جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں یہ بیان کرنے کو کافی ہیں کہ اس دور کے مثبت اثرات کو قبول کرنے اور انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے میں میرٹھی بھی سرسید، آزاد، حالی، عبدالحق اور مرزا غالب کی طرح پیش پیش تھے۔ ایک طرف تعلیمی میدان میں ہونے والی تبدیلیاں اور ان اصلاحات سے فائدہ اٹھانا، ان کی جانب سے دی جانے والی نوکریاں، علاقائی سطح پر دی جانے والی مرعات وغیرہ۔ اگرچہ ان کے پیچھے انگریز کے سیاسی مقاصد شامل تھے لیکن برصغیر پاک وہند کا ایک بڑا طبقہ انھیں ایسے قبول کر چکا تھا کہ جیسے انھیں تعلیمی و معاشی سطح پر اگر کوئی سنوار سکتا ہے تو وہ صرف برطانوی حکومت ہی ہے۔

حقانی القاسمی اس حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بے شک ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار کے منفی اثرات مرتب ہوئے ہوں گے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم اور تخلیق پر اس کے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے جنھیں مثبت اور صحت مندانہ تبدیلی کہا جا سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے سرسید اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے دور اندیشی اور حکمت عملی کے تحت انگریزوں کی طرف اپنا رخ بدلا اور ان کے اقتدار کی حمایت کی ہے (۵۸)۔ میرٹھی کی شاعری پر اس لحاظ سے نوآبادیاتی اثرات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے جنھیں مثالوں کی صورت بیان کیا گیا ہے۔ آنے والے ابواب میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے انسان کے حیوانی مخلوقات، ثقافت اور عالم فطرت سے تعلق کا مطالعہ/تجزیہ ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں کیا جائے گا۔ اس تجزیے میں نوآبادیاتی عہد کی بدولت ہونے والے اس سماجی ڈھانچے اور ماحولیاتی تبدیلیوں کو بھی مدنظر رکھا جائے گا جو اس صنعتی معاشرے کی پیداوار تھی۔ جس سے نہ صرف مختلف شعبہ زندگی متاثر ہوئے بل کہ اس قدرتی/فطری نظام پر بھی برے اثرات مرتب ہوئے۔ اس تجزیے کے لیے متعلقہ مثالوں کو مدنظر رکھا جائے گا۔

حواشی و حوالہ جات

۱: سٹین فورڈ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی، "Colinialism"، http/plato.standford.edu/entries/Colonialism، تاریخ ملاحظہ ۲۹ اگست ۲۰۱۷ء۔

۲: کیمبرج ڈکشنری، http/Dictionary.Cambridge.org/definition/colonialism۔

۳: ایضاً۔

۴: سید ریاض ہمدانی، " نوآبادیات اور نوآبادیاتی تمدن"، مشمولہ: جرنل آف ریسرچ، ج ۳۱، ش ۱ (جون ۲۰۱۷ء)، ص ۱۰۵۔

۵: مبارک علی، برطانوی ہندوستان (کراچی: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء) ، ص ۱۳۔

۶: میریم ویبسٹر، http/Merriam-webster.com/dictionary/colonialism، تاریخ ملاحظہ: ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

۷: ناصر عباس نیر، "نوآبادیاتی صورت حال"، مشمولہ: لسانیات اور تنقید (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۔

۸: الیاس بابر اعوان، " نوآبادیات اور لکھاری"، http/naibat.pk، تاریخ ملاحظہ: ۳ مارچ ۲۰۱۸ء۔

۹: مبارک علی، برطانوی ہندوستان (کراچی: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء) ، ص ۱۸-۲۱۔

۱۰: ایضاً، برطانوی راج : ایک تجزیہ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء) ، ص ۲۴-۲۹۔

۱۱: ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں (کراچی: اوکسفرڈ پریس، ۲۰۱۳ء) ، ص ۱۲۔

۱۲: وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء) ، ص ۱۱۴-۱۱۵۔

۱۳: عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے (لاہور: زاہد بشیر پبلی شرز، ۱۹۹۵ء) ، ص ۱۹-۲۰۔

۱۴: شارب ردولوی، جدید اردو تنقید اصول و نظریات (لاہور: بھٹی سنز پبلی شرز، ۱۹۹۴ء) ، ص ۸۶ ۔

۱۵: عطاالرحمن میو، انیسویں صدی میں پنجاب کی انجمنوں کی اردو خدمات (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۶ء) ، ص ۱۱۱-۱۱۲۔

۱۶: حامدی کاشمیری، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات (دہلی: مجلس اشاعت ادب، ۱۹۶۸ء) ، ص ۷۷۔

۱۷: صوفیہ یوسف، " اردو کے فروغ اور اس کے نفاذ کے لیے ہندوستان کی دیگر انجمنوں اور تحریکوں کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی شراکت" ، مشمولہ: خیابان، ش ۱۷۔ khayaban.uop.edu.pk۔

۱۸: انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۵ء)، ص۳۴۸۔

۱۹: ناہید قاسمی، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری (کراچی: انجمنِ ترقی اردو، ۲۰۰۲ء)، ص۱۰۶-۱۰۹۔

۲۰: عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے (لاہور: زاہد بشیر پبلی شرز، ۱۹۹۵ء)، ص۳۶۔

۲۱: یہ جملہ ساجد امجد کی کتاب اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات میں صفحہ ۳۳۵ پر درج ہے نیز عبادت بریلوی کی کتاب جدید شاعری میں صفحہ ۱۳ پر بھی یہی الفاظ موجود ہیں۔

۲۲: جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء)، ص۱۰۰۵۔

۲۳: ناصر عباس نیر، " انجمنِ اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر "مشمولہ: مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں (کراچی: اوکسفرڈ پریس، ۲۰۱۳ء)، ص۱۵۸- ۱۸۷۔

۲۴: انجمنِ پنجاب کے مشاعروں پر جہاں تحقیقی کتب میں بارہادہرائی جانے والی چیزیں دیکھنے کو ملیں وہیں ان مشاعروں کے بند ہونے کے بعد راقمہ کی نظر سے جو نئی چیز گزری وہ ان کے بعد کے طرحی مشاعروں کا ذکر تھا جن کا ذکر ناصر عباس نیر کی کتاب مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں کے ایک مضمون" انجمنِ اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر" کی حواشی میں صفحہ ۱۹۱ پر اور ڈاکٹر عطاالرحمن میو کی کتاب انیسویں صدی میں پنجاب کی انجمنوں کی اردو خدمات میں صفحہ ۲۰۶ سے ۲۰۹ تک ان بعد کے مشاعروں کی کچھ تفصیل موجود ہے۔

۲۵ : اسلم سیفی، حیات اسماعیل (دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء)۔

۲۶ : اسماعیل میرٹھی، کلیات اسماعیل، مرتب: اسلم سیفی (دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء)، ص۳۳۹۔

۲۷: شاداب علیم، جدید شاعری کا نقطعہ آغاز اسماعیل میرٹھی (دہلی: عفیف آفیسٹ پرنٹرس، ۲۰۱۱ء)، ص۷۰۔

۲۸: اسماعیل میرٹھی، کلیات اسماعیل، مرتب: اسلم سیفی (دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء)، ص۱۲۳۔

۲۹: ایضاً۔

۳۰: ایضاً، ص۲۰۵-۲۰۶۔

۳۱: ایضاً، ص۲۰۶-۲۰۷۔

۳۲: ایضاً، ص۲۰۷۔

۳۳: ایضاً، ص۲۰۹۔

۳۴: عطاالرحمن میو، انیسویں صدی میں پنجاب کی انجمنوں کی اردو خدمات (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۶ء)، ص۱۷۵۔

۳۵: کلیات اسماعیل، ص۲۴۹۔

۳۶: ایضاً، ص۲۰۹-۲۱۲۔

۳۷: ایضاً، ص۲۱۳-۲۱۶۔

۳۸: ناہید قاسمی، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲ء)، ص۹۶۔

۳۹: کلیات اسماعیل، ص۳۱۹۔

۴۰: ایضاً، ص۳۱۷۔

۴۱: ناصر عباس نیر، جدیدیت اور نوآبادیات (کراچی: آکسفرڈ یونی پریس، ۲۰۲۱ء)، ص۳۲-۳۳۔

۴۲: کلیات اسماعیل، ص۹۹-۱۰۰۔

۴۳: ایضاً، ص۱۷۷۔

۴۴: ایضاً، ص۱۷۸۔

۴۵: ایضاً، ص۱۷۷۔

۴۶: ایضاً، ص۱۷۸-۱۷۹۔

۴۷: ایضاً، ص۲۳۴۔

۴۸: ایضاً۔

۴۹: ایضاً، ص۲۳۴-۲۳۵۔

۵۰: ایضاً، ص۳۱۸۔

۵۱: ایضاً، ص۲۳۳۔

۵۲: ایضاً، ص۲۷۔

۵۳: ایوب ملک، " نوآبادیاتی دور اور ہماری پسماندگی"، مشمولہ: جنگ، تاریخ ملاحظہ: ۲۴جون ۲۰۱۷ء۔

۵۴: ناصر عباس نیر، جدیدیت اور نوآبادیات (کراچی: آوکسفرڈ یونی پریس، ۲۰۲۱ء)، ص۳۲۔

۵۵: کلیات اسماعیل، ص۲۷۔

۵۶: شاداب علیم، نظم جدید کی تثلیث (میرٹھ: شعبہ اردو چرن سنگھ یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص۱۰۸۔

۵۷: اسماعیل میرٹھی، کلیات اسماعیل، ص۲۷۔

۵۸: حقانی القاسمی، "مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور"، مشمولہ: ماہنامہ اردو دنیا (نومبر ۲۰۱۹ء)، http//Ncpulblog.blogpost.com، تاریخ ملاحظہ: ۵ دسمبر ۲۰۱۹ء۔

(باب سوم)

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کا دیگر مخلوقات سے تعلق کا مطالعہ

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کا دیگر مخلوقات سے تعلق کا مطالعہ

قدرت نے دنیا کی ہر شے کو ضرورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز دوسری شے کو کسی نہ کسی طریقے سے متاثر کرتی ہے۔ پھر چاہے اس کا تعلق کسی بھی نوع سے کیوں نہ ہو۔ انسان چوں کہ زبان اور شعور کی وجہ سے ان پر فوقیت رکھتا ہے تو اسے اپنا وجود ہی سب سے افضل دکھائی دیتا ہے اور وہ اسی برتری کے چکر میں اس پورے نظام کو اپنی مٹھی میں کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ وہ بھی صرف اس کائناتی نظام کا ایک حصہ ہے جس طرح باقی انواع ہیں۔ یہ پورا نظام ایک زنجیر سے جڑا ہوا ہے اور ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔ جہاں قدرتی مظاہر پر انسان خوراک کے حصول کے لیے انحصار کرتا ہے جس میں پیڑ، پودے، پہاڑ، دریا وغیرہ شامل ہیں، وہیں حیوانی زندگی سے بھی اس کا ایک قدیم تعلق جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس پر اس کا اتنا ہی انحصار ہے جو ایک شے کو زندہ رہنے کے لیے دوسری پر ہو سکتا ہے۔ حیوانی زندگی پر انسان کے انحصار کے حوالے سے ایس۔ ایم محسن لکھتے ہیں کہ:

> دنیا کی حیوانی زندگی نے خود انسان جس کا ایک جز ہے انسان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور وہ اس کے تمام کاروبار، افعال و حرکات کو متاثر کرتی رہتی ہے۔۔۔ ہمارا انحصار زیادہ تر حیوانی دنیا پر ہے۔ (1)

انسان ابتدائی قدیم زمانے میں ایک کمزور اور غیر محفوظ مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ قدیم زمانے پر نظر دوڑائی جائے تو انسان اس تعلق سے اس قدر واقف نہ تھا جیسا آج کے جدید زمانے میں ہے۔ ابتدائی زمانے میں انسان کے لیے ماحول بدلنے کی بڑی وجہ فطرت تھی، جب برف کا زمانہ آیا تو ہر چیز جم گئی جیسے زندگی مفلوج ہو گئی ہو پھر اس کے پگھلنے کا دور آیا اور ہر جگہ ہریالی نے لے لی۔ گھنے جنگل، پرندے جانور ہر جگہ دکھائی دینے لگے۔ پھر ایک وقت میں سیلاب ہر شے بہا کر لے گیا۔ لاوے نے ایک عجب نقصان پیدا کیا۔ غرض یہ کہ فطرت انسان کی سمجھ سے باہر کی چیز تھی۔ ارتقا کے ایسے ابتدائی مراحل میں بہت سے جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے فطرت کی تبدیلیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جس کی وجہ سے بدلتے ماحول کے ساتھ ان کی بہت سی نسلیں ختم ہو گئیں۔ ایسے حالات میں انسان نے ہمیشہ اپنے شعور اور مشاہدے سے فطرت کو ہی اپنے استعمال میں لا کر خود کو محفوظ کرنے کا سامان پیدا کیا۔ پانی کے قریب اس کی بستیوں کا قیام، پتوں سے جسم کا ڈھکنا، پتھروں سے آگ، جنگلات سے لکڑی، چارے اور غذا کا حصول، جانوروں سے گوشت، دودھ حاصل کرنا ان کی کھال سے جسم کو ڈھکنا یہ سب جاری و ساری تھا۔ زمین کی وسعت زیادہ تھی اور انسانی آبادیاں کم۔ وقت بدلنے کے ساتھ جس علاقے کی

آبادی بڑھی ساتھ ہی وسائل بھی بڑھنے لگے اور یوں آپسی لڑائیوں اور وسائل رکھنے والے علاقوں کے بیچ جنگ وجدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طاقت ور علاقے کمزور پر حکمرانی کر بیٹھے۔ جنھیں تاریخ میں نو آبادیاتی عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی حکومتوں نے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں کر کے ماحولیاتی نظام کی تباہی کا نقارہ بجانے کا سامان پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ صنعتی وسائل کے پیدا ہونے نے انسان کو آسانیوں اور مشینوں سے واقفیت دلوائی اور یوں وسائل کی تباہی کا پروانہ جاری ہو گیا۔ ضروریات بڑھیں پیداوار بڑھی اور ماحولیاتی نظام کو مسخر کرنے کے آلات وجود میں آنے لگے۔ ماحول کا اثر انسان کی جسمانی بناوٹ، رہائش، زندگی گزارنے اور زندگی بچانے جیسی سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ یہ ساری چیزیں جب تک فطری انداز میں رہیں ساری دنیا کا نظام معمول کے مطابق رہا اور انسان اپنے ماحول سے پوری طرح فوائد حاصل کرتا رہا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی نے سائنسی انکشافات کی بدولت من مرضیاں کیں اور انسانی ہوس نے قدرت کے نظام میں دخل اندازی شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی لالچ میں یہ استحصال بڑھتا گیا اس نے اپنی سہولت اور فائدے کی خاطر پُل، بند، کالونیاں، فلک بوس عمارتیں، کارخانے وغیرہ بنائے نیز قدرتی ماحول میں مداخلت کرتے ہوئے بری طرح جنگلات کی صفائی کی، سمندری نظام کو تجربوں کے لیے استعمال کیا، ساحلی علاقوں کے ارد گرد کی چیزوں کو ختم کر کے انسانی آبادی قائم کیں۔ اس طرح یہ تعمیرات بھی اس ماحول کا حصّہ بن گئیں، غرض یہ کہ انسان نے اپنی آسانیوں اور آسائشوں کے لیے زمین آسمان ایک کر دیا اور کئی نئی دنیائیں بھی تلاش لیں۔ ان سب کے باوجود ایک چیز قابل غور رہی ہے کہ انسان چاہے کتنی ہی ترقی کی منازل کیوں نہ طے کر لے وہ اپنی اس زمین، یہاں کے ماحول سے الگ نہیں رہ سکتا اور نہ وہ ماحول کے بغیر کچھ کر سکتا ہے۔ دوسرے جانور، پودے، چرند پرند اپنے وجود کے لیے انسانوں کے محتاج نہیں مگر انسان کو قدم قدم پر ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنے فطری ماحول سے اگر الگ ہو گا تو گویا وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا(۲)۔ یہی چیز آج کے اس جدید ترقی یافتہ سماج کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے اس کے ماحول کو فطری نظام کو بچایا جا سکتا ہے اور ان کے آپسی رشتے کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ اس متعلق سلام سندیلوی لکھتے ہیں کہ :

> انسان اور فطرت میں ایک گہرا رشتہ قائم ہے۔ دراصل انسان فطرت ہی کا ایک حصہ ہے یا یوں سمجھنا چاہیے کہ انسان فطرت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔(۳)

فطرت کی اس ترقی یافتہ شکل نے اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ارد گرد کے نظام کو نقصان پہنچایا ہے۔ صرف اپنے ہاتھوں ہی نہیں بل کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے ہاتھوں بھی۔ انسانوں نے جہاں ماحول اور اس کے نظام کو اپنے زیر کیا ہے وہیں ایک وقت میں جب بڑی سطح پر سیاسی، ادبی اور معاشرتی اشیا پر اجارہ داری کرنے کی مثالیں ملتی ہیں وہیں

نوآبادکار کی شکل میں اس علاقے کے ماحولیاتی نظام پر بھی قبضہ کرنے کی ایک تاریخ موجود ہے۔ جس کے لیے انھوں نے بڑی حکمت عملی سے کام کیا۔ اس سلسلے میں جب نوآبادیاتی نظام قائم ہونے لگے تو حکومت کرنے والوں نے ماحول اور سماجی نظام سے متعلق پہلے معلومات اکٹھی کیں تاکہ انھیں حکمران طبقے کے فوائد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ نوآبادی قائم کرنے والوں نے پہلے اس علاقے کو سمجھنے اور اس کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے وہاں کے سماج کو سمجھا اور اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم کیے جاتے اور انھیں وہاں جغرافیہ، ارضیات، علم نباتات، علم حیوانات، جنگل بانی وغیرہ جیسے مضامین صرف اس لیے پڑھائے جاتے تھے تاکہ ان سے نوآبادیاتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قدرتی وسائل کے انتظام اور ان کے استعمال میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس حوالے سے ماحولیاتی ادبی تنقید اپنی تحریروں میں جو پیغام دیتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ماحولیاتی ادبی تنقید جسے ایک امریکی اصطلاح کہا جاتا ہے برطانیہ میں سبز مطالعات کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس متعلق الیاس بابر نے پیٹر بیری کے خیالات کو ترجمہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک جہاں امریکی ادب میں اس حوالے سے جشن کا تاثر ملتا ہے وہیں دوسری جانب برطانوی تحریروں میں دھمکی اور خطرے کی نشاندہی دیکھنے کو ملتی ہے نیز ان میں سرکاری اداروں، صنعتوں، کمرشل اور نئی نوآبادیاتی طاقتوں کو ماحولیاتی خطرات کی سب سے بڑی وجہ مانا جاتا ہے۔(۴) اس بیانیے میں کئی سیاسی عوامل بھی پوشیدہ ہیں جن کی تفہیم ہونا باقی ہے۔

انسان نے جب اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس سرزمین میں موجود ہر شے کو اپنے زیر کیا وہیں سے ایک اصطلاح متعارف ہوئی تھی جسے بشر مرکزیت کا نام دیا گیا۔ اس کی تاریخ دیکھی جائے تو یہ نظریہ ہمیشہ سے موجود نہ تھا۔ قدیم انسان کے نزدیک دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے سے منسلک تھیں اور وہ انھی کا حصہ تھا۔ اس کے اور حیوانات کے طرز زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ یہ وہ واحد جاندار تھا جو گروہ کی صورت میں ایک ساتھ رہتا تھا۔ اس نے اپنی سمجھ کے ذریعے اس فطری ماحول کو جانا اور اسے اپنے مقاصد کے استعمال کے لیے زیر کرنا شروع کر دیا، یہیں سے انسان اور فطری نظام کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس میں سب سے زیادہ دخل اس کی زبان کا اور اس کا دو پیروں پر اپنی قدرتی صلاحیت سے کھڑا ہونا بھی شامل تھا۔ یہیں سے ثقافت و تمدن کی ابتدا ہوئی اور فطری ماحول سے کٹ کر انسان نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی اور خود کو سب سے افضل اور برتر جاننے اور ماننے لگا۔(۵) جب کہ اس کے برعکس ماحولیاتی تنقید اس بات پر زور دیتی ہے کہ اس تصور کو توڑا جائے اور انسان اور اس کے فطری ماحول کے اسی تعلق کو پھر سے بحال کیا جائے۔ جس میں یہ ایک دوسرے کی اہمیت کو مانتے تھے اور نہ صرف باہمی اتفاق و ربط سے زندگی کو جاری و ساری رکھے ہوئے تھے بل کہ ایک دوسرے کی مدد سے قدرت کے بنائے اس فطری نظام کو بھی محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ جس میں نہ ہی ایک دوسرے کا

استحصال کرنا شامل تھا، نہ نقصان پہنچانا اور نہ ہی کسی ایک کی دوسرے پر برتری کو ماننا۔ اس حوالے سے ظفر حسن لاک کے تصور فطرت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> لاک کے خیال میں فطرت کی صحیح خصلت عقل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محض انسان کے بے لگام، بے قابو اور وحشیانہ جذبات کا نام نہیں ہے۔ کوئی انسان عقل کا ساتھ نہ چھوڑے چوں کہ ہم سب برابر اور یکساں ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم دوسرے کی جان مال اور آزادی میں دخل انداز نہ ہوں اور ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ (٦)

لیکن آج کے انسان نے جہاں اپنی عاقبت خراب کی ہے وہیں اس نے اس پوری کائنات کے فطری، ماحولیاتی نظام کو بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ سائنسی دنیا اس کائنات کے جلد ختم ہو جانے اور اس قدرتی نظام کی بڑی تباہی کا بھی نقارہ بجا چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے مطالعات سامنے لائے جائیں اور ان مسائل کو اجاگر کیا جائے جو انسانی دنیا کے جلد ختم ہو جانے کا سفر تیزی سے طے کر رہے ہیں۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے ان مثالوں کو پیش کیا جاتا ہے جس میں ارضی حوالے موجود ہیں۔ جہاں انسان کو باآسانی یہ پیغام جاتا ہے کہ خدا کا بنایا یہ نظام ایک آپسی رشتے سے جڑا ہوا ہے۔ ایک کا ہونا ہی دوسرے کے ہونے کی وجہ ہے۔ پرندے دنیائے فطرت کا ہی ایک حصہ ہیں۔ دلفریب آوازوں کے ساتھ ماحول کو نیا آہنگ بخشتے ہیں۔ جہاں فطرت کی بات ہو وہاں پرندوں اور جانوروں کا بیان نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔ یہ باب انسان کے حیوانی مخلوقات سے تعلق کو واضح کرنے کی ایک سعی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی بیشتر نظمیں اگرچہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اسی نفسیات کو مد نظر رکھا جائے تو محمد اسحاق کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ماحول کی قدر و قیمت، فطری ماحول کے برقرار رکھنے کی اہمیت سے واقف کروانے کا زمانہ پرائمری سکول سے سکینڈری سطح تک کا ہے کیوں کہ یہی بچے بڑے ہو کر اس کی حفاظت کر سکیں گے۔ اسماعیل میرٹھی بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے انھوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں ماحولیاتی عناصر کی اہمیت، ان کا ہماری زندگی میں کردار بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ نظموں کی شکل میں ماحولیاتی نظام اور فطری مناظر سے تعارف اور واقفیت کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے جس میں بچے پڑھنے کے ساتھ ساتھ سیکھتے ہیں۔ (۷) ان کے اذہان اپنے قدرت کے نظاروں سے، ان کی موجودگی کی وجوہات سے اور انھیں اپنی ہی طرح کا ایک جاندار سمجھنے سے جس قدر واقف ہوں گے اتنا ہی وہ ایک دوسرے کی اہمیت کو جان سکیں گے۔ اسماعیل میرٹھی نے حیوانی مخلوق کو جس طرح اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے اور پھر ان کے کام کرنے کے طریقوں، ان کی ہماری زندگی میں اہمیت، ان کی بدولت

دیے جانے والے سبق، یہ سب ایک ماہر نفسیات اور ماحول دوست ہی کر سکتا ہے جسے اسماعیل میرٹھی نے بڑی خوبصورتی سے انجام دیا ہے۔ بچے کا کردار ماحول کے اثرات کے زیر سایہ نشو نما پاتا ہے اور جو بھی تعلیمی اور تربیتی عوامل اسے میسر آتے ہیں ان کے عمل اور رد عمل سے اس کی زندگی اور کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ ابتدائی سطح پر اسماعیل میرٹھی کی نظمیں بچوں کے اس کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دوسری طرف ان کی یہ نظمیں اس پورے ماحولیاتی نظام کی بھی عکاس ہیں جو انسانوں کے ساتھ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ذیل میں ایسی ہی نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے جنھیں گزشتہ کی جانے والی تحقیقات میں تو بچوں کو ایک اخلاقی سبق دینے والی اور فطرت کے مناظر کی عکاسی کرنے والی نیچرل نظموں کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ راقمہ نے انھیں ماحولیاتی حوالوں سے بھی بیان کیا ہے۔ جس میں مخاطب صرف بچے نہیں بل کہ پوری انسانیت ہے۔ نظم "کیڑا" ملاحظہ ہو:

تم اس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار/تمہاری راہ میں ہے گرم رفتار
چلا کترا کے کیا کیا پیچ و خم سے/جھجکتا ہے یہ آواز قدم سے
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے/سویرے اٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
کرو چشم حقیقت بیں سے تمیز/کہ سمجھے ہو جسے تم سخت ناچیز
اسے قدرت نے زریں پر دئے ہیں/کچھ اک سبزی و سرخی بھی لیے ہیں
تمہیں لگتی ہے اچھی مور کی دم/کہ خوش ہوتے ہو اس کو دیکھ کر تم
جو دیکھو ناچ اس کا دور ہی سے/تو اس پر لوٹ ہو جاتے ہو جی سے
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا/یہ مانا خاک مٹی میں ہے لیٹا
نہ بے پروائی سے چلیے جھپٹ کر/قدم رکھیے ذرا کیڑے سے ہٹ کر (۸)

جہاں ہم انسان بحیثیت انسان اپنی برتری کے زعم میں قدرت سے کھلواڑ کرتے ہیں، وہیں ان میں فرق کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ جو چیز آنکھوں کو بھلی معلوم ہو وہی برتری کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔ کچھ چیزوں کو ان کے چھوٹے پن اور کمزوری کی وجہ سے ہم حقیر و ناتواں سمجھتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔ انسان کے لیے بظاہر کیڑے مکوڑے ایک حقیر مخلوق ہیں کیوں کہ یہ انہیں ان کے وجود کے بل بوتے پر دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن اگر انسان کی اس سوچ کی نفی کی جائے اور خدا کی قدرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مخلوق انسان سے کئی درجے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ ان میں نہ ہی کوئی نفسانی خواہشات زور پکڑتی ہیں اور نہ ہی مادی کشش موجود ہے۔ یہ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ جو چیز

اس کی آنکھوں کو بھلی لگے وہ اسے فوقیت دیتا ہے لیکن ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی نہ ہی ظاہری خوبصورتی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کی بنا پر کسی ایک شے سے اچھا برتاؤ کرے اور دوسری سے سلوک روا رکھے۔ اسماعیل میرٹھی کی اس نظم میں بھی انسان کے ایک ایسے ہی رویے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید اشعار ملاحظہ ہوں: :

کہ ہے دونوں سے دانا دیکھ سکتا/نمونے دو ہیں کاریگر ہے یکتا
ہے دونوں ہی میں یکساں دستکاری/کسے ہلکی کہیں اور کس کو بھاری
ہے ان دونوں کو اس کا لطف حاصل/کہ بخشا ہے برابر عیش کامل
اگر ہے خوبصورت مور پیارا/تو کیڑا بے گنہ کیوں جائے مارا
بظاہر کچھ نہیں اس کی حقیقت/مگر جب اس کی کرتے ہو بری گت
تو ہے ننھی سی جان اس کی تڑپتی/ہے تم جیسا ہی اک جاندار وہ بھی(۹)

(انگریزی سے ترجمہ شدہ) یہ نظم نہ صرف ایک نصیحت ہے بل کہ اس میں بچوں کو کیڑے کے رہن سہن، اس کے کھانے پینے اور رہنے کے طریقوں سے واقفیت دلواتی ہے بل کہ اسے بھی اپنے جیسا ایک جاندار سمجھتے ہوئے اس سے محبت کرنا بھی سکھاتی ہے۔ جس طرح بچوں کے کھیلوں میں کیڑوں سے کھیلنا، انھیں تنگ کرنا بھی شامل ہے۔ یوں نہ صرف کئی حشرات معذور ہو جاتے ہیں بل کہ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جیسے بچے تتلیوں کے پر نوچ لیتے ہیں، جگنوؤں کی چمکتی روشنی کے حصول کے لیے اسے کاٹ دیتے ہیں۔ رنگ برنگے اڑتے حشرات کو قید کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی کئی نازک معاملات کو سلجھانے اور ان جیسی چیزوں سے محبت پیدا کرنے کے لیے یہ نظم بڑی کارگر ہے۔ بظاہر اس میں ایک نصیحت دکھائی دیتی ہے۔ جب کہ اس کی دوسری تیسری پڑھت اس چیز کو بھی سامنے لاتی ہے کہ شاعر نے اس معمولی کیڑے کے رہن سہن اور اس کے وجود کو کتنی باریک بینی سے دیکھا ہے اور اسے اس چیز کا احساس ہے کہ وہ بھی ایک جاندار ہے اور ہر طرح کی تکلیف محسوس کر سکتا ہے۔ شاعر نے اسے زبان دے کر اس کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال اس مکالمے میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ جب ایک بچے کے ہاتھوں ایک جگنو لگ جاتا ہے اور وہ اسے قید کر لیتا ہے۔ "ایک جگنو اور بچہ کی باتیں" سے شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک جگنواور بچہ کی باتیں

سناؤں تمھیں بات اک رات کی/کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں/ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک بچہ کی ان کی پر نظر/پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر
چمک دار کیڑا جو بھایا اسے/تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے
وہ جھم جھم چمکتا ادھر سے ادھر/پھرا کوئی رستہ نہ پایا مگر
تو غمگیں قیدی نے کی التجا/کہ چھوٹے شکاری، مجھے کر رہا(۱۰)

قدرت نے اس کائنات کو بے شمار خوبصورتیوں سے نوازا ہے۔ اس کی ہر شے میں کوئی نہ کوئی حکمت اور کاریگری چھپی ہوئی ہے۔ کائنات پر غور و فکر کرنے کا اسی لیے کہا گیا ہے تاکہ ان کے رموز کو جانا جا سکے، ان سے سیکھتے ہوئے انہیں اپنی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے بنا نقصان پہنچائے استعمال کیا جا سکے۔ "کروں گا نہ آزاد اس وقت تک" یہ الفاظ انسانی برتری اور اس کے حق پر دلالت کرتے ہیں کہ میں اتنی قدرت رکھتا ہوں اور یہ کر سکتا ہوں۔ تم میرے سامنے ایک حقیر سی، کمزور اور ناتواں شے ہو۔ جو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے۔ ماحولیاتی مطالعے انسانی برتری کے اسی زعم کو توڑنے اور انھیں برابری کی سطح پر ایک دوسرے کی اہمیت منوانے کی طرف گامزن ہیں۔ جس میں انسانی زندگیوں کی حفاظت اور انھیں بچانے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں نہ کہ ان سے چھیڑ چھاڑ کر کے انھیں ختم کرنے کے۔ کیوں کہ زندگی چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو اپنا ایک مقام اور اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں انسانی تجسس کی مثال کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے:

ارے چھوٹے کیڑے نہ دے دم مجھے/کہ ہے واقفیت ابھی کم مجھے
اجالے میں دن کے کھلے گا یہ حال/کہ اتنے سے کیڑے میں ہے کیا کمال
دھواں ہے نہ شعلہ ہے نہ گرمی نہ آنچ/چمکنے کی تیرے کروں گا میں جانچ
یہ قدرت کی کاریگری ہے جناب/کہ ذرہ کو چمکائے جوں آفتاب
مجھے دی ہے اس واسطے چمک/کہ تم دیکھ کر مجھ کو جاؤ ٹھٹک
نہ الھڑ پنے سے کرو پائمال/سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال(۱۱)

اس مکالماتی گفتگو میں انسان قدرت کے ایک شاہکار سے مخاطب ہے۔ جہاں اس نے ایسی انمول چیز دیکھی اس کو پانے اور اسے سمجھنے کی دوڑ میں لگ گیا۔ ایسے ہی کچھ بچے بھی ان چیزوں کے لیے بڑی دل چسپی اور انہماک محسوس کرتے ہیں جو عام چیزوں سے ذراہٹ کر ہوں۔ ایسے ہی اس جگنو کا ملنا اور اس کی چمک کے راز کو پانا اس بچے کے تجسس میں شامل ہے۔ جہاں اس گفتگو میں اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آخر تم کس طرح چمک رہے ہو تو دوسری طرف قدرت کی اسی انمول تخلیق کی زبانی اس کاریگری کو بھی بتایا جارہا ہے کہ رب کائنات کی میں بنائی ایک ایسی تخلیق ہوں جو تمہیں راستہ دکھانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

یہ مکالمہ جس میں انسان قدرت کی ایک خوبصورت تخلیق سے مخاطب ہے دراصل اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس راز کو جانا جاسکے جس سے یہ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ تحقیق بھی کی گئی ہے کہ بنا بجلی کے یا کسی دوسرے سہارے کے بجلی کیسے پیدا کی جاسکتی ہے یا روشنی کو کس طرح اندھیرے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ روبرٹ ایلن لکھتے ہیں کہ امریکی کمپنی سیانمڈ نے ایک ایسی روشنی ایجاد کی ہے جو حرارت اور چنگاری کے بغیر اجالا دیتی ہے۔ اس کا استعمال ان جگہوں پر کیا جاتا ہے جہاں عام روشنی کا لے جانا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ کانوں، معدنیاتی علاقوں یا کسی حادثے کے وقت جہاز / طیاروں وغیرہ کے دروازوں کے اوپر ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس روشنی کی تلاش کا اصل منبع وہ روشنی ہے جسے جگنو پر تحقیق کر کے بنایا گیا ہے۔ یہ تحقیق بتاتی ہے کہ اس کی دم میں جو مادہ پایا جاتا ہے اسے Chemoluminescence کہتے ہیں۔ جگنو سے دو قسم کے مادوں کا اخراج ہوتا ہے ان میں سے ایک Lucifrase اور دوسرا Luciferin کہلاتا ہے۔ جب یہ دونوں مواد آپس میں ملتے ہیں تو ان سے توانائی اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ (۱۲) خدا جسے چاہے جیسی چاہے نعمتوں سے نواز دے اور اس نے جگنو میں یہ جو صلاحیت رکھی ہے یہ صرف رات کے وقت ہی آشکار ہوتی ہے۔ انسان اس کی تخلیق کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ہر چیز میں قدرت نے ایک حکمت رکھی ہے جس تک پہنچنے کے لیے اگر صحیح راستہ اختیار کرو، اس کی قدر کرنا جانو اور اسے بجائے قید کرنے کے آزادی سے جینے دو تو یہ بھی ایک فطرت کا حصہ ہے اور راتوں کو منور کرتا ہے۔ جہاں انسان ایک حیوانی تخلیق سے مخاطب تھا ذیل میں ایک مکالمہ ملاحظہ ہو جس میں دو حیوان پرندے ایک دوجے سے مخاطب ہیں اور قدرت نے انھیں جن نعمتوں سے نوازا ہے اس کا نمونہ پیش کرتے ہیں:

مور اور کلنگ

دم مور نے پھول کر دکھائی/اور بولا کلنگ سے کہ بھائی
کیا خوب ہیں نقش اور کیا رنگ/دنیا مجھے دیکھ کر ہوئی دنگ

میری سی کہاں ہے آپ کی دم/کر نہیں سکتے مقابلہ تم
بولا اس سے کلنگ ہنس کر/ہاں آپ کے لاجواب ہیں پر
لیکن نہیں کچھ بھی کام آتے/بچوں ہی کے دل کو ہیں لبھاتے
اڑنے نہیں دیتی دم تمہاری/لیتے ہیں پکڑ تمہیں شکاری(۱۳)

جہاں انسان اپنی سمجھ بوجھ اور صلاحیتوں پر ناز کر کے اس دنیا کو زیر کرتا اور قدرت کی چیزوں کو اپنی سہولت اور مرضیوں کے مطابق ڈھالتا آیا ہے۔ انسان کو اپنی ان غلطیوں سے سیکھ کر ان سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور جو نعمتیں اور صلاحیتیں اسے خدا کی طرف سے دی گئی ہیں انہی پر صبر و شکر کرنے کی خو ڈالنی چاہیے۔ اس کے برعکس انسان آج تک اپنی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر دکھائی دیتا ہے اور اپنے سے کمزور اور کمتر مخلوق کو ہی آج تک زیر کرنے میں، اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر حیواناتی دنیا پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا والوں کو بھی اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جب قدرت کے کچھ شاہکار خود پر غرور کرنے لگیں اور اپنی خوبصورتی پر شیخی بھگارنے لگیں تو قدرت کے بنائے ویسے ہی کچھ انمول شاہکار انھیں ان کی کچھ کمزوریوں سے بھی واقفیت دلواتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کردہ کلام میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں مور کو اپنی رنگ برنگی دم پر ناز ہے وہیں اس کی یہ دم اس کی ایک بڑی کمزوری بھی ہے۔

یہ کہہ کے پروں کو پھٹپھٹا کر/بولا اونچا ہوا پے جا کے
آؤ کریں آسمان کا پھیرا/کچھ دم ہے تو ساتھ دو نہ میرا
منہ اپنا سا لے کے رہ گیا مور/تھا اس میں کہاں اڑان کا زور
بھاتا ہے جنھیں نرا دکھاوا/وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا
بس ان کو ہے ٹیپ ٹاپ کی دھن/شیخی کے سوا نہیں کوئی گن
دیکھیں کسے یاد ہے زبانی/مور اور کلنگ کی کہانی(۱۴)

اسماعیل میرٹھی نے اگرچہ اس کے ذریعے بچوں کو ایک سبق دینے کی کوشش کی ہے لیکن اگر اس کا ایک دوسرا رخ دیکھا جائے تو وہ یہ بھی ہے کہ اس کرہ ارض پر ہر جاندار اپنے اندر ایک مکمل شاہکار ہے مگر جہاں وہ قدرت کے کارخانے میں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہیں اسے سبق بھی سکھا دیا جاتا ہے اور اس کی جتنی صلاحیتیں ہیں ان کی بھی یاد دہانی کروا دی جاتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے قدرت کی بنائی ہر چیز کو اس کے رہن سہن کو بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔

ان چیزوں کو ایسے بیان کیا ہے جیسے کہ انھوں نے خود ان کی زندگی جی ہے اور انھیں بالکل ہی ویسے بیان کیا ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کا نظام ایک ترتیب سے انجام پاتا ہے ویسے ہی یہ حیوانی زندگی بھی انھی مراحل سے گزرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھیں اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے تگ و دو نہ کرنی پڑے۔ ذیل میں ایسی ہی ایک مثال ملاحظہ ہو جس میں چڑیا کے بچوں کو ان کی ماں زندگی گزارنے کے طریقے سکھا رہی ہے:

چڑیا کے بچے

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینے سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
اس طرح روزمرہ کرتی ہے ماں حفاظت
سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو
لیکن چڑا گیا ہے چگا تلاش کرنے
دانہ کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کر
جب لائے گا تو بچے منہ کھول دیں گے جھٹ پٹ
ان کو بھرائے گا وہ ماں اور باپ دونوں
بچوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر(۱۵)

چڑیا کو کھیتوں کی حفاظت کے سلسلے میں ایک بنیادی مقام حاصل ہے۔ اس جیسے دیگر جاندار بھی اس حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں کیوں کہ یہ وہ پرندے ہیں جو فصلوں کی حفاظت کے لیے ان حشرات کو کھا جاتے ہیں جو انھیں نقصان پہنچانے کا باعث بنیں جو گندم، کپاس، چاول یا دوسری فصلوں کی بڑھوتری میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ اگرچہ وہ فصلوں کو پک جانے پر نقصان بھی پہنچاتے ہیں ان سے بھی فصلوں کو محفوظ رکھنے کے کئی طریقے ہیں۔ انسانی دنیا میں چڑیا جیسے پرندوں کی اہمیت اس وقت ابھر کر سامنے آئی جب چین جیسے ملک میں کسانوں اور زمینداروں نے حکومت سے ایسے پرندوں کو ختم کرنے کی اپیل کی کہ اس سے فصلوں کا نقصان ہوتا ہے وہیں پھر یہ دیکھنے میں آیا کہ بہت سے ایسے حشرات کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جنھیں یہ پرندے کھا جاتے تھے۔ حکومت کو پھر ایسے پرندوں کو درآمد کرنا پڑا۔(۱۶) یہاں یہ کہنا بجا ہے کہ نہیں ہے کوئی چیز نکمی قدرت کے کارخانے میں۔ بقیہ نظم ملاحظہ ہو:

اور چھوٹے بچے خوش ہیں تکلیف کچھ نہیں ہے
اے چھوٹے چھوٹے بچو تم اونچے گھونسلے سے
ہرگز نہیں گروگے پر اور پرزے اب تک
نکلے نہیں تمہارے، اس واسطے ابھی تم
اونچے نہ اڑ سکو گے، ہاں جب تمہارے بازو
اور پر درست ہوں گے تو دن کی روشنی میں
سیکھو گے تم بھی اڑنا کرتے پھرو گے چیں چیں
اڑتے پھرو گے پُھر پُھر اے چھوٹے بچو لیکن
کوا بری بلا ہے اس سے خدا بچائے (۱۷)

قدرت کا ایک نظام جیسا انسانوں کے لیے مختص کیا گیا ہے جس میں اس کی زندگی گزارنے کے تمام اصول وضوابط موجود ہیں ویسے ہی حیوانات وچرند پرند کے لیے بھی بنائے گئے ہیں۔ ان کے اپنے طور طریقے ہیں جن کے مطابق وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے ان کی زندگی کے ہر بنیادی اور چھوٹے سے چھوٹے پہلو کو بالکل ایسے بیان کیا ہے جیسے وہ خود ان کے مشاہدے کا حصہ ہوں۔ ان کا مقصد صرف ان کو بیان کر دینا کافی نہیں سمجھا بل کہ انھیں ان کے مکمل محسوسات کے ساتھ پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا خود اس زندگی کو جی لیتا ہے جو ہے تو بالکل ان کے جیسی ہی لیکن ان میں کچھ فرق ہے۔ جس طرح انسانی دنیا میں بہت سے دشمن عناصر موجود ہوتے ہیں ویسے ہی اس حیوانی دنیا میں بھی ایسے کردار موجود ہیں جس طرح چڑیا کی ماں اپنے بچوں کو کوے سے محتاط کرتی ہے کیوں کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا ظلم بھی ہو چکا تھا۔ ایک پیڑ پہ چڑیا کا بسیرا تھا وہ کیسے اجڑا ملاحظہ ہو:

پیڑ پہ تھا چڑیا کا بسیرا/اس کو ظالم نے جا گھیرا
ہاتھ لگا چھوٹا سا بچّا/نوچا پھاڑا کھا گیا کچّا
چڑیا رو رو جان ہے کھوتی/ہے ظالم کی جان کو روتی (۱۸)

اس کائنات کی ہر شے چاہے وہ انسان ہوں یا حیوان اپنے زندہ رہنے کے لیے دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ جس طرح انسان اپنی خوراک کے لیے کچھ جانوروں کا شکار کرتے ہیں ویسے ہی کچھ چرند پرند بھی اپنی بھوک مٹانے کو اپنے ہی جیسوں کا شکار کرتے ہیں اور یوں زندگی کا سائیکل چلتا رہتا ہے۔ کوے پر ایک پوری نظم " کوا" کے عنوان سے موجود ہے جس میں

اسماعیل میرٹھی نے کوے کے طور اطوار اور اس کی عادات کو بیان کیا ہے جس کا کچھ حصہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بقیہ کلام ملاحظہ ہو:

کوا

کوے ہیں سب دیکھے بھالے/چونچ بھی کالی ، پر بھی کالے
کالی کالی وردی سب کی /اچھی خاصی ان کے ڈھب کی
کالی سینا کے ہیں سپاہی /ایک سی صورت ایک سیاہی
لیکن ہے آواز بُری سی /کان میں لگتی ہے چُھری سی
یوں تو ہے کوا حرص کا بندہ /کچھ بھی نہ چھوڑے پاک نہ گندہ
اچھی ہے پر اُس کی عادت/بھائیوں کی کرتا ہے دعوت
کوئی ذرا سی چیز جو پالے/کھائے نہ جب تک سب کو بُلا لے
کائیں کائیں پنکھ پسارے/کرتا ہے یہ بھوک کے مارے
اُچھلا ، کُودا ، لپکا، شکرا/ہاتھ میں تھا بچے کے ٹکڑا
آنکھ بچا کر جھٹ لے بھاگا/واہ رے تیری پُھرتی کاگا!(۱۹)

انسان کے بچے ہوں، چڑیا کے بچے، کسی کھیت میں لگا اناج ہو کوے کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ اپنی خوراک کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے اور کسی بھی خطرے کا سامنا کرتے ہوئے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتا ہے۔ یہ چیز ہر جاندار میں پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے جیسے جانداروں کو اپنے زندہ رہنے کے لیے مار بھی سکتے ہیں اور ان کی حفاظت کی خاطر مر بھی سکتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی معاشرے میں کوے کو مہمانوں کی آمد کا ایک ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ کوے کی ایک اسلامی حیثیت سے بھی ہم واقف ہیں جس میں اس نے انسان کو قبر بنانا سکھایا۔ اس کا شمار ان جانداروں میں بھی کیا جاتا ہے جو ماحول کو غلاظتوں سے بھی پاک کرتا ہے۔ ان پرندوں اور حشرات کی مثالیں اور ان کے آپسی مکالمے دیکھے جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے فطرت کے ان شاہکاروں کی آواز اور ان کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے جذبات واحساسات کی آواز بن کر اس انسانی دنیا تک پہنچایا ہے۔

جہاں اوپر چند پرندوں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں وہیں ذیل میں کچھ جانوروں کے حوالے سے بھی چند نمونے ملاحظہ ہوں جن میں انسان ان حیوانات کے ساتھ کسی نہ کسی رشتے سے منسلک ہیں۔ پھر چاہے وہ ان سے انس کا رشتہ ہو یا پھر اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے ان سے فائدہ حاصل کرنا ہر حوالے سے ان کا ایک آپسی تعلق نظر آتا ہے۔ پھر وہ "اسلم کی بلی"

ہو یا" ہمارا کتا ٹیپو" بچوں کے ساتھ ساتھ کس طرح وہ انسانی معاشرے میں اپنی موجودگی سے ایک کردار ادا کرتے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے ان حیوانات کو تنگ نہ کرنے اور ان کا خیال رکھنے کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں انھیں اپنے جیسا ہی جاندار سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ پھر چاہے وہ بچے ہوں یا بڑے۔

اسلم کی بلی

چھوٹی سی بلی کو میں کرتا ہوں پیار/صاف ہے ستھری ہے بڑی ہے کھلار
گود میں لیتا ہوں تو کیا گرم ہے/گالے کی مانند رواں نرم ہے
میں جو نہ چھیڑوں تو نہ جھلائے وہ/میں نہ ستاؤں تو نہ غرائے وہ
کھینچ کے دم اب نہ ستاؤں گا میں/گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں
اب نہ ڈرے گی وہ مری مار سے/کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے (۲۰)

اب نہ ستاؤں گا میں، اب نہ بھگاؤں گا میں، اب نہ ڈرے گی وہ جیسے مصرعے ایسے جانداروں سے پیار محبت اور انھیں ایک زندہ وجود سمجھنے کا درس دیتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے بلی، کتے کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ انھیں تکلیف پہنچانے سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے کو جہنمی قرار دیا ہے۔ (۲۱) بلی ایک ایسا شائستہ جانور ہے جس سے پیار سے پیش آیا جائے تو وہ بھی بدلے میں ایک اچھا تاثر دیتی ہے۔ یہ ایسا بے ضرر جانور ہے جو انتہائی ضرورت کے علاوہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن جب اس کے بچے کو نقصان پہنچایا جائے تو وہ سب کچھ بھلا کر اس ماں کا کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہے جو اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ جہاں کچھ جانوروں کو ہم پالتو جانور کے طور پر اپنے گھروں میں رکھتے ہیں ان سے پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ قدرت کے ان شاہکاروں کی قدر کرتے ہیں ایسے ہی کچھ جانوروں کو ہم اپنی ہی حفاظت کے لیے بھی بطور گارڈ رکھتے ہیں جس کی ایک مثال کتا ہے۔ اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی کی یہ نظم اہمیت کی حامل ہے اور اسے انسانوں سے بہت بہتر گردانا گیا ہے کیوں کہ چاہے اس جانور کے ساتھ جیسا بھی سلوک کر لو وہ اپنے مالک سے وفاداری نبھانا بخوبی جانتا ہے۔ "ہمارا کتا ٹیپو" سے اشعار ملاحظہ ہوں:

ٹیپو ہے اس کا نام یہ کتا عجیب ہے/بڈھا ہے با ادب ہے نہایت غریب ہے
ہم دونوں بہن بھائیوں سے الفت ہے اس قدر/جب دیکھتا ہے دور سے آتا ہے دوڑ کر
افسوس میرے ٹیپو، حیراں ہوں کیا کروں/کس ڈھب سے تیرے ساتھ محبت کیا کروں
میں دودھ پی رہا ہوں تو بیٹھا ہے میرے پاس/کچھ شک نہیں کہ تو ہے وفادار حق شناس (۲۲)

انسان اپنے ارد گرد کی جڑی ہر شے سے بخوبی واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کیسے ان سے فائدہ حاصل کرنا ہے یا انھیں اپنی ضرورت کے تحت استعمال کرنا ہے۔ لیکن اس آشنائی کے باوجود بھی اس کے اندر سے اپنے اشرف المخلوقات ہونے یعنی انسانی برتری کا غرور نہیں جاتا ہے اور اس کا برملا اظہار کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے:

البتہ میں بھی کرتا ہوں صرف اس قدر سلوک/دیتا ہوں ایک ٹکڑا کہ دب جائے تیری بھوک
لیکن مجھے یقین ہے اگر کچھ نہ دوں تجھے/دیکھے گا پھر بھی پیار کی نظروں سے تو مجھے
اس واسطے کہ تو ہے وفادار حق شناس/مالک کا اپنے تجھ کو بہت ہے لحاظ و پاس (۲۳)

تجھ سا رفیق ہاتھ، تو ہے وفادار حق شناس، گھر کا پرانا رفیق، باوفا ہے نہات شفیق، گھر کی چوکسی کرتا ہے رات بھر۔ انسان کے ساتھ اس جاندار کی محبت اور وفاداری کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔ جہاں ہم اسے اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے رکھتے ہیں وہیں یہ مویشیوں کی رکھوالی بھی کرتا ہے، اسے شکار کے لیے بھی تیار کیا جاتا ہے اور کمانڈوز اسے دشمنوں کی تلاش کے لیے بھی تربیت دیتے ہیں۔ آج کے ہمارے اس معاشرے میں اس جانور کے ساتھ مختلف سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ کہیں گلی محلوں میں اس کے گلے میں رسی باندھ کر گھسیٹا جا رہا ہے تو کہیں اسے پتھر مارے جا رہے ہیں۔ بہت سے گھروں میں انھیں پالتو جانور سمجھ کر ان کی اچھی خاصی دیکھ بھال بھی کی جاتی ہے۔ تصویر کے دونوں رخ موجود ہیں لیکن توجہ اس بات پر دی جانی چاہیے کہ ان بچوں کے دل میں ایسے جانداروں کے لیے محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ وہ بھی خدا کی بنائی تخلیقات میں شامل ہیں بے شک وہ حیوانات میں شامل ہیں لیکن انسانوں کی طرح ہی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے ایسے جانوروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی جابجا تلقین کی ہے۔ کیوں کہ ایسے بہت سے جانور ہیں جنھیں ہم اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انسان جب ابتدائی دور میں اپنی زندگی گزار رہا تھا اور جدید سہولیات سے محروم تھا تب ایسے ہی جانوروں سے اپنے کام لیا کرتا تھا۔ جنگلوں میں جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے ہاتھی کی سواری کی جاتی تھی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے کے لیے بیل گاڑیوں پر سامان لادا جاتا تھا۔ دور دراز کے سفر کرنے اور پیغام رسانی کے لیے گھوڑوں کی مدد لی جاتی تھی۔ ایسے ہی صحرائی علاقوں میں جہاں تپتی ریت کا سمندر موجود ہوتا ہے وہاں اونٹ جیسا جانور ہماری مشکل کو آسان کرنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اونٹ کی ایک تصویر اسماعیل میرٹھی پیش کرتے ہیں:

اونٹ

لق و دق صحرا میں یا میدان میں/یا عرب کے گرم ریگستان میں
سایہ افگن ہے نہ واں کوئی چٹان/سرد پانی کا نہ دریا کا نشان

چلچلاتی دھوپ ہے اور چپ ہوا/واں پرندہ بھی نہیں پر مارتا
تو وہاں کے مرحلے کرتا ہے طے/دن بہ دن اور ہفتہ پے بہ پے
قیمتی اشیا ہیں تیری پشت پر/تاجروں کا ریشم اور شاہوں کا زر
تودہ تودہ تیرے اوپر لدرہا/ہے بھرا گویا جہاز پر بہا(۲۴)

پرانے زمانے میں صحرائی علاقوں اور ریتلے پہاڑی میدانوں میں ان لمبی قطاروں کو نہیں بھلایا جا سکتا ہے۔ جو ہر طرف سے لدی جہاں انسانی وجود کا بار اٹھاتی دکھائی دیتی ہیں وہیں اس انسان کی ضروریات زندگی کا سامان بھی ان پر ایسے لاد دیا جاتا ہے جیسے وہ کسی بڑے جہاز کی سی طاقت رکھتے ہوں۔ جب کہ انسان یہ بھی جانتا ہے کہ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں لادا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ جانور بنا کسی چوں چراں کے یا اپنی تکلیف کو ظاہر کرنے کے کئی میلوں کا سفر طے کر جاتے ہیں اور انھیں اپنی منزل مقصود پر پہنچا کر دم لیتے ہیں۔

چند ہفتے جب کہ جاتے ہیں گزر/اور تھکا دیتا ہے راکب کو سفر
اونٹ !گھبراتا نہیں تو بار سے/دیکھتا ہے اس کی جانب پیار سے
گویا کہتا ہے کہ اے میرے سوار/ایک دن تو اور بھی ہمت نہ ہار
ہاں نہ بے دل ہو نہ رستے میں ٹھٹک/صاف سر چشمہ ہے آگے دھر لپک
مجھ کو آتی ہے ہوا سے بوئے آب/ناامیدی سے نہ کر تو اضطراب
صبر سے کرتا ہے طے راہ دراز/سچ کہا ہے تو ہے خشکی کا جہاز
الغرض تو ہے حلیم وخوش خصال/ تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال(۲۵)

یہ نظم جہاں ہمت نہ ہارنے کا پیغام سنا رہی ہے وہیں اونٹ جیسے جاندار کی انسانی زندگی میں اہمیت کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔ اونٹ جیسا جانور جسے صحرائی جہاز بھی کہا جاتا ہے اپنی مثال آپ ہے۔ پرانے زمانے میں تجارت کے لیے اس کی پشت پر کئی من سامان لادا جاتا تھا۔ اس کا گوشت کھایا جاتا، دودھ بھی پیتے جو بہت سی انسانی بیماریوں کے علاج میں بھی مدد دیتا، ساتھ ہی اس کی کھال سے خیمے بھی بنائے جاتے۔ انسانوں کے ٹولے اس پر سواری کرتے اور ریتلے چٹیل میدان عبور کرتے جہاں کسی کو یہ علم نہ ہوتا کہ آیا پانی کا کوئی تالاب ملے نہ ملے۔ کہیں کوئی سبزہ ہو یا نہ ہو۔ ایسے مشکل حالات میں بھی یہ جانور اپنا سفر جاری رکھتا اور مالک کو اس کی منزل مقصود پر پہنچا کر ہی دم لیتا۔ ہم مسلمان اس جانور کی قربانی بھی کرتے ہیں۔ اس کی انسانی زندگی میں اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس کی ایک مثال اسماعیل میرٹھی نے اپنے اس کلام میں پیش کی ہے۔ جہاں انسانی زندگی کے نظام کو چلانے کے لیے باقاعدہ ایک نظام موجود ہے وہیں جنگل کی زندگی کو چلانے کا بھی ایک طور

طریقہ ہے اور اس کی حکمرانی شیر کے سپرد ہے جسے جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں جب انسانی آبادی بڑھی اور انسان کے رہنے کے لیے آبادیاں قائم کرنے کے لیے جنگلوں کا صفایا کیا گیا تو بہت سے جنگلی جانور دربدر ہو گئے۔ ایسے میں شیروں کی بہت سے نایاب نسلیں اب چند ہی جوڑوں کی شکل میں رہ گئی ہیں۔ اس حیوانی زندگی میں بھی زندہ رہنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے سے کمزور جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے۔ یہی قدرت کا کھیل ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم "شیر" بھی اس کی ایک مثال ہے۔

اے شیر تیرے تن پہ ہے طاقت کا پوستیں/شاہی کے حق میں کوئی بھی ساجھی ترا نہیں
پیدا ہے تیرے رخ سے تری شوکت اور جلال/ظاہر ہے تیری شکل سے باطن کا تیرے حال
دل تیرا بزدلی و غلامی سے ہے بری/پھٹکے نہ تیرے پاس کبھی خوف اے جری
تیرا حریف کون ہے جو تو ہٹے بچے/جھپکے نہ تیری آنکھ نہ گردن تیری لچے
حق نے عطا کیا ہے تجھے زور بے خلل/پہچانتے ہیں جانور آواز شیر کی
وہ ہولناک ہے کہ دہلتا ہے سب کا جی/جاتی ہے ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل
ہیں بھاگتے کہ گویا تعاقب میں ہے اجل (۲۶)

زندگی کے نظام کو چلانے کے لیے قدرت نے جو ماحولیاتی نظام تشکیل دیا ہے اس میں چاہے انسان شامل ہوں یا اس کے علاوہ حیوانات، نباتات، جمادات یا پھر فطرت کے تمام شاہکار سب ایک انجانی کڑی سے جڑے ہیں۔ انسانی و حیوانی دنیا ایک بڑے فرق کے ساتھ اس قدرتی ماحول میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہے جس کی ایک تصویر امریکن مصنف مارک ٹوئن(Mark Twain ۱۸۳۵ء--۱۹۱۰ء) نے اپنے مضمون میں کھینچی ہے۔ انھوں نے لندن زولوجیکل گارڈن میں جانوروں کی عادات و خصوصیات کا مشاہدہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات میں انسانوں کو بھی شامل کیا ہے۔ ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ایک انگریز بادشاہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ شکار کے لیے گیا۔ جہاں اس نے بہتر بھینسوں کا شکار کیا اور ان میں سے بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے ایک بھینس کے کچھ حصے کو اپنی خوراک کے طور پر استعمال کیا اور بقیہ اکہتر کو گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اسی کے پیش نظر اس نے ایک اژدھے کے پنجرے میں سات بچھڑے رکھے جس میں سے ایک کو اس اژدھے نے چیر پھاڑ کھایا اور اپنی بھوک مٹ جانے پر دوسروں کو چھوئے بغیر ایک کونے میں سکون سے جا بیٹھا۔ (۲۷) اس سے انسان کی حصول مال کی ہوس اور لالچ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ضرورت کے مطابق ہی قدرت کی نعمتوں کا استعمال کرے ایک توازن برقرار رہے تو پورا ماحولیاتی نظام ایک بہتر طور پر چل سکتا ہے کیوں کہ ہر شے دوسری

کی محتاج ہے۔ ایک کے ہونے سے دوسری کی زندگی کا وجود ہے۔ تہذیبوں کی کہانی لکھنے والے ہوں، انسان کے قصے بیان کرنے والے یا پھر سائنسی دنیا کو مسخر کرنے والے ہوں بلترتیب ایسی کئی تحریریں لکھ چکے ہیں جس میں واضح طور پر ایسی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جس میں انسان ہمیشہ سے اپنے اس فطری ماحول کا محتاج رہا ہے۔ جہاں اس نے اس کو مسخر کرنا شروع کیا وہیں سے اس کی تباہی کا سامان پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اس نقصان کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ اپنے لیے آسائش کا سامان جمع کرنے میں اس قدر کھو چکا ہے کہ اسے اپنے ارد گرد کی ختم ہونے والی چیزوں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ کرسٹو فر مینز اپنے مضمون میں بوکچن کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان "دوم فطرت" یعنی کلچر کے حامل ہیں۔ ان کی باقاعدہ تہذیب و ثقافت، روسم و رواج اور رہن سہن کے طریقے ہیں جن پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہ چیز انہیں دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں یہ حق حاصل ہے بل کہ ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اس اہلیت کے بل بوتے پر غیر انسانی دنیا کو تبدیل کر دیں۔ انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ ایسا کرنے میں اگر انہیں ان کا نقشہ بھی بدلنا پڑ جائے تو وہ اس میں کوئی عار محسوس نہ کریں کیوں کہ ان کے پاس ان کی برتری کی خاصیت موجود ہے جس سے وہ اس دوسرے نظام کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ (۲۸)

انسان کے اس روپ کی مثالیں ہمیں اس نو آبادیاتی عہد کی یاد دلاتی ہیں جب کمزور اقوام پر سرمایہ درانہ قوتیں قابض ہو جاتی ہیں۔ اپنی برتری، طاقت اور قوت کے زعم میں چھوٹی اور کمزور ریاستوں کو اپنے مفاد کے چکر میں جھانسا دے کر زیر کر لیتی ہیں۔ تاریخ میں اس کی سب سے بڑی مثال ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کی ہی ہے جسے رہتی دنیا تک نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس قبضے اور حکومت کرنے کے چکر میں پھر چاہے انہیں کس طرح کا بھی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ وہ قدرتی نظام سے کھلواڑ کرنے کی شکل میں ہو یا زرعی نظام سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں۔ اس نظام کو زیر کرنے کے چکر میں شہری زندگی ایسے خلا کا سب سے زیادہ شکار ہوئی ہے کہ وہ اپنی اصل کھو بیٹھی ہے اس مقابلے میں دیہی زندگی ابھی قدرت سے جڑی ہے۔ جہاں نہ صرف ماحول ابھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے بل کہ وہاں کے قدرتی حیوانات ہوں یا نباتات اپنے آپسی تعلق کے ساتھ موجود ہیں۔ جس کی ایک مثال اسماعیل میرٹھی کی اس نظم کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے:

ہماری گائے

رب کا شکر ادا کر بھائی/جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں/جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں

خاک کو اس نے سبزہ بنایا/سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں/دودھ بنی اب گائے کے تھن میں (۲۹)

قدرت نے یہ جو آپسی تعلق بنایا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کہاں اس خاک کو اس قابل بنایا گیا اس میں بیج بو کر کچھ نہ کچھ اگایا جائے جس کی اس کی ایک مثال سبزے کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ خاک کو اس نے سبزہ بنایا۔ اس سبزے سے کئی جانور اپنی بھوک مٹاتے ہیں جن میں سے ایک گائے بھی ہے۔ سبزے کو پھر گائے نے کھایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دودھ دینے کے قابل ہو گئی۔ یہ بھی خدا کے بنائے اس فطری ماحول کی ایک چین کہی جا سکتی ہے۔

سبحان اللہ دودھ ہے کیسا/تازہ گرم سفید اور میٹھا
دودھ میں بھیگی روٹی میری/اس کے کرم نے بخشی سیری
دودھ دہی اور میٹھا مسکا/دے نہ خدا تو کس کے بس کا (۳۰)

اس دودھ سے ہم کیا کیا فوائد حاصل کرتے ہیں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ دیہی زندگی کا دارومدار انھی چیزوں پر قائم ہے۔ جس سے چرواہے نہ صرف اپنی بھوک مٹاتے ہیں بل کہ اسی دودھ سے بننے والی چیزوں دہی، لسی، مکھن سے اپنی گزر بسر بھی کرتے ہیں۔ دودھ دور دراز علاقوں میں بیچا جاتا ہے۔ دہی سے جو لسی بنائی جاتی ہے ساتھ ہی اس سے مکھن بھی بنتا ہے جو پھر دیسی گھی بنانے کا کام آتا ہے۔ اسی متعلق حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

> تم گائے کے دودھ کو اپنے اوپر لازم کر لو کہ یہ شفا بخش ہے۔ اس کا گھی دوا ہے اور اس کے گوشت میں روگ ہے۔ (۳۱)

گویا ایک گائے بیک وقت انسان کو کئی فائدے پہنچاتی ہے۔

صبح ہوئی جنگل کو سدھاری/سبزے سے میدان ہرا ہے
جھیل میں پانی صاف بھرا ہے/پانی موجیں مار رہا ہے
پانی پی کر چارا چر کر/شام کو آئی اپنے گھر پر
دوری میں جو دن ہے کاٹا/بچے کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت/دودھ ہے دیتی کھا کے بنسپت
بچھڑے اس کے بیل بنائے/جو کھیتی کے کام میں آئے

رب کی حمد و ثنا کر بھائی / جس نے ایسی گائے بنائی(۳۲)

جہاں گائے نے انسان کو اتنے فوائد سے نوازا ہے وہیں قدرت نے اس کے لیے پیڑ پودوں سے ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن سے وہ اپنی بھوک مٹاتی ہے۔ ارد گرد کھیتوں میں اگا سبزا، ٹیوب ویلوں کی صورت نکالا جانے والا پانی اس کی بھوک پیاس بجھاتا ہے۔ پھر اسی سے ہم گوشت بھی حاصل کرتے ہیں جو ہماری غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے بچے بڑے ہو کر جب بیل بنتے ہیں تو وہ پرانے زمانے میں جہاں سواری اور سامان لادنے کے کام آتے تھے آج انھیں کھیتوں میں ہل چلانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ دیہی علاقے جہاں مشنری سہولیات میسر نہیں ہیں وہاں یہی حیوان ایسے مشقت طلب کام کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ انھی بیلوں کو جوت کر تیل نکالنے کے لیے بھی ایک جگہ گول گول چلایا جاتا ہے جہاں درمیان میں نصب لکڑی سے بنی ایک مشین سے تیل نکلتا ہے۔ کسانوں کی زندگی کا دار و مدار انھی چیزوں پر قائم ہے جس سے وہ اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔

انسانی زندگی اور انسانی معاملات پر فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا ہونا کس طرح انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس کی واضح مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جس طرح گلاٹ فیلٹی ماحولیاتی تنقید کے حوالے سے کہتی ہیں کہ ادب میں فطرت کو کس طرح سے پیش کیا گیا ہے کیا وہ اس کی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے۔(۳۳) اسماعیل میرٹھی کی یہ نظم اس بات پر پورا اترتی ہے جس میں فطری مظاہر کا ایک دوسرے سے تعلق اور پھر ان کا اپنی اصلی حالت میں بنا کسی تشبیہ استعارے کے بیان اسے مکمل طور پر اس کے اصل وجود کے ساتھ مثالوں کی صورت بیان کرتا ہے۔ بہت سے جانور اور پرندے جہاں انسانوں کے مادی فوائد میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں وہیں بہت سے حشرات الارض ہمیں اخلاقی درس بھی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک چیونٹی بھی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے جس طرح اس کی زندگی کے مراحل، اس کی عادات اور محنت پر روشنی ڈالی ہے وہ کوئی اس کے حیاتیاتی مطالعے رکھنے والا ہی ڈال سکتا ہے۔ اس کا پورا نظام جس طرح ایک قاعدے کا پابند ہے اور اس کی پیروی کرنا اس پورے خاندان پر جیسے فرض ہے۔ جس کی کوتاہی کرنے والا ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

چھوٹی چیونٹی

بڑی عاقلہ ہے بہت دور بیں ہے / کہ فکر اپنی روزی کا تیرے تئیں ہے
اسی دھن میں پہنچی کہیں سے کہیں ہے / کبھی اپنے دھندے سے غافل نہیں ہے
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے / نہیں کام سے شام تک تجھ کو فرصت

ذرا سی تو جان اور اس پر یہ محنت/بہت جھیلتی ہے مشقت مصیبت
نہیں ہارتی پر کبھی اپنی ہمت/اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے(۳۴)

جہاں خوراک کو جمع کر کے ذخیرہ کرنے کے یہ مختلف مراحل طے کرتی ہے، وہیں اس قدرتی نظام سے بھی بخوبی واقف ہے کہ اسے کب بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے زندہ رہنے کے لیے خوراک جمع کرنی ہے اور اپنے خاندان کو کس طرح موسموں کی سختی سے محفوظ رکھنا ہے۔ ماہر حیوانات کا کہنا ہے کہ اس جاندار کے اندر انسان کی طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ جس کا واضح ثبوت اس کے ایک نظام کے تحت چلنے اور اس پر عمل کرنے کی صورت میں ملتا ہے۔ چیونٹی، مکوڑے اور اس جیسے دیگر کئی حشرات ہیں جو زیرِ زمیں رہتے ہیں اور انسانوں سے پہلے آنے والی چند آفتوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانے کے دیہی لوگ جب ایسے جانداروں کو زمیں سے باہر جھنڈ اور قطاروں کی شکل میں نکل کر خوراک جمع کرتا دیکھتے تو اندازہ لگا لیتے تھے کہ بارش آنے والی ہے۔ بہت سے ماہرین اس بات پر بھی اتفاق رکھتے ہیں کہ ایسے حشرات زلزلہ، سیلاب، بارش یا آتش فشاں کے پھٹنے کی صورت حال سے بہت پہلے سے واقف ہو جاتے ہیں اور اپنے لیے خوراک کا بندوبست شروع کر دیتے ہیں۔ حشرات الارض جو اس کائنات کا باقاعدہ حصہ ہیں اس نظام میں بھی اپنا ایک کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک طرف جہاں ان کا فصلوں کے لیے نقصان دہ ہونا مانا جاتا ہے وہیں ان کی موجودگی دیگر پرندوں اور جانوروں کے لیے خوراک کی وجہ بنتی ہے ۔ یہ اپنی خوراک جمع کرنے کے لیے کتنی محنت کرتی ہے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

کبھی کام تو نے ادھورا نہ چھوڑا/ کبھی تو نے تکلیف سے منہ نہ موڑا
بہت کام تو نے کیا تھوڑا تھوڑا/ذخیرہ یہ جاڑے کی خاطر ہے جوڑا
اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے/جو گرمی کی رت میں نہ کرتی کمائی
تو جاڑے کے موسم میں مرتی بن آئی/تجھے ہوشیاری یہ کس نے سکھائی
سمجھتی ہے اپنی بھلائی برائی/اری چھوٹی چیونٹی تجھے آفریں ہے(۳۵)

مذکورہ نظمیں جنھیں شعری مثالوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے یہ وہ نظمیں جن میں حیوانی مظہر چاہے وہ پرندوں جانوروں کی شکل میں ہوں یا حشرات الارض کی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں جس طرح وہ اپنا اصل وجود رکھتے ہیں۔ اشعار کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انھیں کسی علامت کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ بیان کردہ حیوانی مخلوقات کا انسانی زندگی میں اور اس ماحولیاتی نظام میں کیا کردار ہے اور ان کا ہونا کیوں ضروری ہے ان مثالوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب شعری

روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے تو چند ایسی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جس میں کسی مظہر کو علامتی پیرائے میں بیان کرتے ہوئے ایک پیغام دینے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا اظہار یہ عموماً غزلیہ اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے لیکن راقمہ نے ان مثالوں میں صرف نظمیہ حصے کو بیان کرنا مناسب خیال کیا ہے تاکہ اس تصویر کو بھی سامنے لایا جا سکے جو ایک شعری روایت کا حصہ ہے علاوہ ازیں اس علامت کو جس طرح حیوانی مثال لیتے ہوئے بیان کیا گیا ہے وہ بھی ایک الگ ہی پیغام لاتی ہے اور ان خصوصیات کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں جس طرح وہ وجودی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے جن نظموں کو بحیثیت کسی علامت کے استعمال کیا ہے نھیں انسانی دنیا میں سبق دینے کو ایک حیوانی تشبیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں مثالیں ملاحظہ ہوں:

" دو مکھیاں " (۳۶) ایسی نظم ہے جس میں اس میں ایک احمق ہے دوسری درویش۔ پہلی مکھی کو احمق اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لالچ میں آکر شیرے پر دھاوا بول دیتی ہے اور اس چکر میں اپنے پروں اور ٹانگ سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اس کے برعکس درویش مکھی لالچ کی بجائے اپنی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اتنا ہی لیتی ہے جس سے اس کا پیٹ بھر سکے بجائے اس کے وہ لالچ میں آکر اپنا نقصان کر بیٹھے۔ ہم بحیثیت انسان آج کے اس دور جدید میں جن طبقات میں بٹے ہوئے ہیں وہ حصول زر کی دوڑ شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنی سہولت اور آسانی کے لیے ہم اس ماحولیاتی نظام کا کتنا نقصان کر بیٹھے ہیں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری تصویر یہ بھی ہے کہ غریب طبقہ صبر و شکر کر کے روکھی سوکھی پر گزارا کر لیتا ہے لیکن امیر طبقہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں اپنی زندگی کا سکون گنوا بیٹھا ہے لیکن اس کی لالچ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ یہ دو مکھیاں اس سماج کے ان کرداروں کی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک اور مثال "عجیب چڑیا" کے عنوان سے ملاحظہ ہو جسے ایک گھڑی سے تشبیہ دی گئی ہے:

چڑیا ہم نے عجیب پالی/زنجیر اس کے گلے میں ڈالی
دن رات ہو۔ شام یا سویرا/لیتی ہے وہ جیب میں بسیرا
دن رات میں چھیڑ دو کسی آن/یہ چھیڑ ہے اس کے جسم کی جان
جب تک جیتی ہے جاگتی ہے/لو کام تو چیز کام کی ہے
کہتی ہے کہ وقت کی خبر لو/جو کچھ کرنا ہے جلد کر لو
غفلت کیجیے تو ٹوکتی ہے/عجلت کیجیے تو روکتی ہے (۳۷)

مندرجہ بالا اشعار میں چڑیا کو گھڑی کا کردار دیتے ہوئے اس کی خصوصیات گنوائی جا رہی ہیں۔ جس میں اوقات کا ذکر۔ کھانے پینے، سونے جاگنے کا ذکر اور اس کے کام کی ادائیگی شامل ہے۔ جس میں وقت کی قدر کرنے کا پیغام اور اس کے صحیح استعمال کی طرف زور دیا جا رہا ہے اور اس کی بار ہا یاد دہانی کروائی جا رہی ہے۔ دوسری طرف جس طرح گھڑی میں موجود ہندسوں کا کردار ہے۔ یا گھنٹے اور منٹوں کی ایک ترتیب شامل ہے اس کا بھی بڑے اچھوتے انداز سے ذکر کیا ہے۔ ذیل میں اس کی مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

اس طور سے کرتی ہے گزارہ/انڈے دیتی ہے دن میں بارہ
پھر اتنے ہی رات کو ہے دیتی/دیتے ہی ہر ایک کو ہے سیتی
انڈے ہیں تمام اس کے سچے/ایک ایک سے نکلے ساٹھ بچے
ہر بچہ نے اگلے ساٹھ دانے/ہر دانے میں ہیں بھرے خزانے
جو دانہ گرا سو ہو گیا گم/ڈھونڈا کرو پھر نہ پاؤ گے تم
دانہ کی بتاؤں کیا قیمت/دانا سمجھیں اسے غنیمت(۳۸)

ایک طرف یہ گھڑی نما چڑیا جہاں وقت کی قدر کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ وہیں دوسری جانب اسماعیل میرٹھی نے اس سے ایک سبق یہ بھی دیا ہے کہ کس طرح دن میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور وہ منٹوں اور سیکنڈوں میں کیسے تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کی سطح پر ان کو ایک یاد دہانی کروانے کا بھی ایک طریقہ ہے جس سے وہ جلدی اس نظام سے وقت دیکھنے سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وقت کا انسانی زندگی میں بنیادی کردار ہے۔ جس پر اس نظام کائنات کا پہیہ چل رہا ہے۔ اس حوالے سے صرف دن رات کے آنے جانے کے اوقات پر ہی نظر ڈال لی جائے تو اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس وقت کے نظام کو اس گھڑی کی شکل میں بڑے انوکھے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ انسان کا اس وقت سے تعلق ایسے ہی ہے جیسے جسم کا روح سے کیوں کہ اگر ایک دن بھی سورج اپنے وقت پر نکلنا چھوڑ دے تو ہم، ہمارا یہ کائناتی نظام بالکل رک جائے۔ اگر بارہ گھنٹے دن اور رات کی بجائے چوبیس گھنٹے صرف رات چھائی رہے تو انسانی و قدرتی دونوں نظام تہس نہس ہو جائیں۔ اس پورے ماحولیاتی/قدرتی نظام میں وقت کا بھی ایک بنیادی کردار ہے۔ جسے سمجھنے، اس کی قدر کرنے اور اس کا بہتر استعمال کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ زندگی کا پہیہ اسی سے مشروط ہے۔

دوسری جانب چڑیا ایک ننھا منا سا پرندہ ہے جو بچوں کی دل چسپی کا بھی سامان لیے ہوتی ہے۔ بیشتر افراد اسے اپنے روزگار کے حصول کے لیے پنجروں میں قید کر دیتے ہیں اور معاوضہ ملنے پر انہیں آزاد کر دیتے ہیں۔ ایسے انسانی رویے یا غیر

اخلاقی کام تب جنم لیتے ہیں جب ایک طبقے پر انتہائی برا وقت آجائے اور وہ بجائے روزگار کے مواقع تلاش کرنے کے ایسے جانداروں کو قید کر کے اسے اپنے روزگار کا ذریعہ بنائے۔ ہمیں اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس کی تصویر ایک الگ ہی روپ سے پیش کی ہے جس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ " ایک گھوڑا اور اس کا سایہ " اس نظم میں گھوڑا اپنے سائے سے بدکتا ہے اور اس حرکت پر اس کا مالک اسے دوسنا جاتا ہے۔ جس کے جواب میں گھوڑا اسے انسان ہونے کا طعنہ دے جاتا ہے۔ مصرعے ملاحظہ ہوں:

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار/اپنے سایہ سے بدکتا بار بار
اس سے مالک نے خفا ہو کر کہا/سن تو احمق، جس سے تو ہے ڈر رہا
جسم کا تیرے ہی تو سایہ ہے وہ/کچھ درندہ ہے نہ چوپایہ ہے وہ
جسم رکھتا ہے نہ اس کی جان ہے/تو بڑا ڈرپوک او نادان ہے
یوں دیا گھوڑے نے مالک کو جواب/سچ کہا یہ آپ نے لیکن جناب
آدمی سے بڑھ کر میں وہمی نہیں/ان ہوئی باتوں کا ہے جس کو یقین (۳۹)

انسان جو ہر لحاظ سے وہمی مانا جاتا ہے۔ یہ بھی اس کی ذات کا ایک حصہ ہے اور اسے اس کی خامی سے ایک حیوان کے ذریعے متعارف کروایا گیا ہے۔ جہاں یہ جملہ " سن تو احمق " کہا گیا ہے وہیں انسان کی بڑے پن اور سمجھدار ہونے کی خصلت دکھائی دیتی ہے۔ اسے اس چیز کی خوش فہمی ہے کہ وہ ساری مخلوقات سے افضل ہے اس لیے اسے یہ حق حاصل ہے وہ کسی کو بھی اپنے سے نیچا، کم تر اور احمق سمجھ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک حیوان اس کی ایک خامی کا ذکر کرتے ہوئے اسی کو ایک تگڑا جواب دے جاتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ انسانی دنیا میں گدھے کو ایک بیوقوف جانور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس متعلق مختلف حکایتیں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن دوسری جانب اسے شاعر نے اس نظم کی شکل میں اسے جو زبان عطا کی ہے وہ یہ پیغام دیتی ہے کہ کوئی بھی چیز ہو چاہے انسان یا حیوان کسی نہ کسی کمی کا یا خامی کا شکار ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف ماحولیاتی ادب بھی بشر مرکزیت کے تصور کو توڑتے ہوئے حیات مرکز/ارض مرکز کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے۔ اس سوچ یا نظریے کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان اور فطرت ایک دوسرے سے الگ مظاہر تصور کیے جاتے ہیں۔ اس بارے میں اورنگزیب نیازی لکھتے ہیں کہ:

> انسان اور فطری مظاہر واشیا کے باہم جڑے ہونے کا ماحولیاتی مقدمہ اس تیقن سے پھوٹتا ہے کہ حیاتیاتی معاشرے میں موجود تمام مخلوقات تکلم کی صلاحیت سے متصف ہیں، خاموش معروض نہیں ہیں، ان

> کی اپنی ایک آواز ہے، جو سنائی دیتی ہے، اسے ایک خاص سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے اور اس کا ابلاغ بھی ممکن ہے۔ (۴۰)

اس لیے کسی بھی شے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی طاقت اور برتری کے زعم میں کسی دوسری شے کو حقیر یا ناتواں سمجھے۔ یہ تمام دنیا اور اس میں رہنے والی ہر شے کسی نہ کسی مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اور اپنے امور کی انجام دہی میں مصروف ہے۔" ایک کتا اور اس کی پرچھائیں" اگرچہ اس نظم میں لالچ بری بلا ہے کا پیغام دیا گیا ہے۔ اگر اس کی دوسری تفہیم پیش کی جائے تو ایک سبق یہ بھی سامنے آتا ہے کہ انسان نے اسی ایک لالچ، زیادہ سے زیادہ کے حصول کی جنگ، ایک شے پر قناعت نہ کرنے کے چکر میں اپنی ان نعمتوں کو بھی کھو دیا ہے جو اس کے پاس موجود ہیں۔ یہ وہی نعمتیں ہیں جو ایک پورے قدرتی نظام کی شکل میں، ہرے بھرے ماحول کی شکل میں اس کے پاس موجود ہیں لیکن ہر شے کو مسخر کرنے کے چکر میں وہ اپنے پاس کی قیمتی اشیا کو نقصان پہنچاتا چلا جارہا ہے اور اس لالچ کے چکر میں اور" مزید کے حصول" میں یہ اپنے پاس کی چیزوں کو بھی گنوا دے گا۔

منہ میں ٹکڑا لیے ہوئے کتا/ایک دریا کو تیر کر اترا
پانی آئینہ سا رہا تھا چمک/نظر آتی تھی تہہ کی مٹی تک
اپنی پرچھائیں پر کیا جو غور/اس کو سمجھا کہ ہے یہ کتا اور
منہ میں ٹکڑا دبا رہا ہے یہ /گہرے پانی میں جا رہا ہے یہ
حرص نے ایسا بے قرار کیا/جھٹ سے غرا کے اس پہ وار کیا
جونہی ٹکڑے پہ اس کے منہ مارا/اپنا ٹکڑا بھی کھو دیا سارا
واں نہ ٹکڑا نہ اور کتا تھا/وہم تھا۔ وہم کے سوا کیا تھا
یونہی جتنے ہیں لالچی نادان/کر کے لالچ اٹھاتے ہیں نقصان
باندھتے ہیں کہاں کہاں کے خیال/اور کھو بیٹھتے ہیں اپنا مال (۴۱)

آج کا انسان بھی اس لالچ کے چکر میں اپنا بہت سا نقصان کر بیٹھا ہے۔ انسانی خصائل میں یہ شامل ہے کہ جہاں کہیں وہ اپنی چادر سے پاؤں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا اپنا ہی سر ننگا ہو جاتا ہے یا کہیں اپنی اصل سے ہٹتا ہے تو بدنامی و رسوائی ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ قدرت نے انسان کو جن خصوصیات اور صلاحیتوں سے نوازا ہے اگر انہی کا درست استعمال جاری رکھے تو کامیاب رہتا ہے اس کے برعکس زیادہ حاصل کرنے کی دوڑ اور لالچ میں جب اس حد کو پار کرتا ہے تو قدرت نہ صرف اسے نقصان پہنچاتی ہے بل کہ اس کے پاس جو شے موجود ہوتی ہے اور جن صلاحیتوں سے وہ فیض یاب ہوتا ہے ان میں بھی کمی کر

دیتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ قدرت کے بنائے نظام، اس کے طور طریقوں اور اصولوں کو اپنائے رکھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں ہی اس کا اپنا فائدہ ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس کے عناصر کو اپنے آرام و سکون کے چکر میں تباہی کے دہانے پر لا چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ اپنے ہی ہاتھوں بنایا انسان کا یہ آرام دہ ماحول اس کی ہی تباہی کا نقارہ بجادے گا۔ " ایک گدھا شیر بنا" ایسی نظم ہے جس میں انسانی خصلت کے بارے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ مثال بھی یاد آتی ہے " کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال گنوا بیٹھا" یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ در پیش تھا۔ ایک گدھے کو شیر کی کھال کہیں سے مل گئی اور اس نے سوچا کہ اسے اوڑھ کر اپنی دھونس جماتا ہوں اور وہ کھیتوں میں نکل پڑا۔ لوگ شیر سمجھ کر بہت گھبرائے اور انھیں دیکھ کر گدھا بہت خوش ہوا اور اس چکر میں اپنی آواز میں بولنے لگا۔ یوں سب کو پتا چل گیا کہ اصل میں یہ کون ہے اور اس کی خوب دھلائی کی۔

چھپتی نہیں ہے بات بنائی ہوئی کبھی
آخر کو ہو کے رہتی ہے اصلیت آشکار (۴۲)

جہاں کچھ جانوروں کو اسماعیل میرٹھی نے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ انھیں انسانی زندگی سے جڑے واقعات اور ان کی عادات و خصائل سے جوڑا ہے وہیں ان جانوروں کے آپسی مکالموں سے بھی ایک فضا قائم کی ہے۔ اگرچہ ان کا پیغام ایک سبق پر ختم ہوتا ہے لیکن نظم "کچھوا اور خرگوش" کوئی بھی چیز نکمی نہیں قدرت کے کارخانے میں کی ایک مثال ہے۔ کائنات کی ہر شے ذرے سے لے کر آسماں تک کسی نہ کسی مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے اور کسی شے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی بھی دوسرے کو اس کے دکھاوے سے جانچے یا اس پر سوال اٹھائے۔

ایک کچھوے کے آ گئی جی میں/کیجئے سیر و گشت خشکی کی
جا رہا تھا چلا ہوا خاموش /اس سے ناحق الجھ پڑا خرگوش
میاں کچھوے! تمہاری چال ہے یہ /یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ
یوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو /گویا اتو زمیں پہ دھرتے ہو
تم کو یہ حوصلہ نہ کرنا تھا /چلو پانی میں ڈوب مرنا تھا
یہ تن و توش اور یہ رفتار/ایسی رفتار پر خدا کی مار (۴۳)

یہاں اگرچہ ان جانوروں کی شکل میں ایک مکالمہ دکھایا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ یہ تصویر بھی سامنے لاتا ہے کہ چاہے انسانی دنیا ہو یا حیوانی اپنے اپنے گروہ میں ہر طاقتور اور صاحب اختیار اپنے سے کم تر اور ناتواں کو زیر کرتا آیا ہے۔ اپنی خوراک کے

حصول کے لیے اپنے سے چھوٹے جانوروں کا شکار کر لینا، ان کے گھونسلوں سے بچے اچک لینا، آماجگاہوں پر قبضہ جمالینا وغیرہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ایسا انسانی دنیا میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ اپنی سہولت اور آسائش و آرام کے لیے ہر اس شے پر قبضہ کر لیا جاتا ہے جس کو وہ حاصل کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس مکالمے میں قدرت کے دو حیوان اپنی اپنی خصوصیات اور اہلیت گنوا رہے ہیں ایک برتری کے زعم میں دوسرے کو چھوٹا اور نیچا دکھا رہا ہے اور دوسرا اسے یہ ثابت کر کے دکھاتا ہے کہ صبر اور محنت سے کسی بھی کام کو انجام دیا جا سکتا ہے پھر چاہے کوئی طاقتور ہو یا کمزور۔

بولا کچھوا کہ ہوں خفا نہ حضور/ میں تو ہوں آپ معترف بہ قصور
اگر آہستگی ہے جرم و گناہ /تو میں خود اپنے جرم کا ہوں گواہ
مجھ کو جو سخت سست فرمایا /آپ نے سب درست فرمایا
مجھ کو غافل مگر نہ جانئے گا/ بندہ پرور برا نہ مانئے گا
یوں زبانی جواب تو کیا دوں /شرط بد کر چلو تو دکھلا دوں
تم توہو آفتاب میں ذرہ /پر مٹادوں گا آپ کا غرہ(۴۴)

مندرجہ بالا اشعار میں اس کچھوے کی جگہ اگر اس کمزور اور ناتواں انسان کو تصور کر لیا جائے تو وہ طبقاتی تقسیم سامنے آجاتی ہے جو اس سماج نے قائم کر رکھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فرق پیدا ہونے کی صورت میں کسی کو بڑا مقام مل جاتا ہے اور کوئی وہ اہلیت نہ رکھتے ہوئے ہمیشہ سے بڑے اور طاقت ور طبقے کے ہاتھوں پستا چلا جاتا ہے۔ کئی ایک ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں نچلا طبقہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر محنت، مشقت اور صبر و تحمل سے جب ایک مقام حاصل کر لیتا ہے تو بڑا طبقہ اپنی سستی اور کاہلی کو کوستا رہ جاتا ہے۔ وہ اس دوڑ میں لگ جاتا ہے جس سے وہ اپنا مقام اور برتری قائم رکھ سکے تا کہ اس کی طاقت اور بڑا پن کم نہ ہونے پائے اور اس چکر میں وہ بڑے بڑے نقصان کر بیٹھتا ہے۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

سن کے خرگوش نے یہ تلخ جواب /کہا کچھوے سے یوں زروئے عتاب
تو کرے میری ہم سری کا خیال /تیری یہ تاب یہ سکت یہ مجال
بات کو اب زیادہ کیا دوں طول/ خیر کرتا ہوں تیری شرط قبول
ہے مناسب کہ امتحاں ہو جائے /تاکہ عیب و ہنر عیاں ہو جائے
الغرض اک مقام ٹھہرا کر/ ہوئے دونوں حریف گرم سفر

جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا /سخت شرمندگی نے گھیرا تھا
صبر و محبت میں ہے سرافرازی /ست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصہ یہ دل لگی کے لیے /بلکہ عبرت ہے آدمی کے لیے
ہے سخن اس حجاب میں روپوش /ورنہ کچھوا کہاں کہاں خرگوش(۴۵)

یہاں اگران بیان کردہ اشعار کو ایک اور مفہوم یوں دے لیا جائے کہ کچھوا وہ دیہی معاشرت ہے جو اپنے اصل سے جڑی ہے۔ قدرتی نظام سے کھلواڑ کی بجائے اس کی حفاظت اور اس کے استعمال میں قدرتی ذرائع استعمال کر رہی ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں انہیں وقت لگتا ہے۔ معمول سے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے لیکن انہیں ان کی محنت اور صبر کا پھل قدرت ہمیشہ میٹھی شکل میں دیتی ہے۔ اس کے برعکس خرگوش وہ شہری طبقہ ہے جو جدید سہولیات زندگی سے لیس اس فطرت کو اپنے زیر کرنے کے چکر میں اور اپنی برتری کے زعم میں مشینی دنیا میں کھو کر سو چکا ہے۔ وہ وقت بھی دور نہیں جب اس کی آنکھ کھلنے پر ماحولیاتی بحران اس کی تباہی اور ہار کا نقارہ بجادے گا۔

بیان کردہ شعری مثالیوں میں انسانی خصائل کو حیوانی روپ دے کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ انگلیوں پر گنی جانے والی چند مثالیں ہیں جن میں کسی حیوانی مظہر کو ایک سبق دینے کے لیے تشبیہ یا استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ اسماعیل میرٹھی کے ہاں یہ تمام فطری عناصر چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہیں اپنی اصل، اپنی زبان اور اپنے مکمل وجود کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر چاہے وہ دیہی ماحول کی عکاسی ہو، کھیت کھلیانوں فصلوں کا ذکر ہو، پیڑ، پودے، پرندے، جانور ہوں یا پھر قدرت کے تمام تر فطری مظاہر۔ اسماعیل میرٹھی نے انھیں ان کے اپنے اصل وجود کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جن میں کہیں وہ مکالموں کی صورت میں ایک دوسرے سے مخاطب دکھائی دیتے ہیں تو کبھی انسانی دنیا میں ان کو فائدہ پہنچاتے اور ان کی زندگیاں سہل بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کا نظریہ بھی ایسے ہی ادب کو فروغ دینے اور انھیں تخلیقی تجربے میں شامل کرنے پر زور دیتا ہے۔ اورنگزیب نیازی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ماحولیاتی ادب کی شعریات جانوروں، پرندوں، چوپایوں اور دیگر مظاہر کو کسی ماورائی دنیا کا نشان، کسی دوسرے کا نمائندہ اور افادی شے سمجھنے کے برعکس ان کی اپنی ذاتی حیثیت میں انھیں تخلیقی تجربے میں شریک کرنے کا اصرار کرتا ہے۔(۴۶)

اسماعیل میرٹھی کی شعری مثالوں کو اس ذیل میں دیکھا جائے تو ان کی مکمل عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ سوائے چند شعری مثالوں کے جنھیں نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے بقیہ نظمیں ماحولیاتی تناظر ہی رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں فطرت کی دوسری

قسم مضبوط دکھائی دیتی ہے جس میں قدرتی مظاہر ان کے اپنے اصل اور مقامی وجود کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ ان کا انسانی زندگی میں جو مقام اور کردار ہے وہ تمام تر شعری مثالوں کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱: ایس۔ایم محسن، حیوانی زندگی کی دل چسپ باتیں (آندھراپردیش: انتخاب پریس، ۱۹۶۰ء) ، ص۶-۷۔

۲: ڈاکٹر مبارک علی کی ۲۰۱۸ء میں آنے والی تین کتابیں ہیں جن میں تہذیب کی کہانی بیان کی گئی ہے ۔ راقمہ نے ان کے مطالعے سے اپنی سمجھ کے مطابق یہ مفہوم نکالا ہے جسے ترتیب سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ کتابیں پتھر کا زمانہ ، کانسی کا زمانہ ، لوہے کا زمانہ کے عنوان سے ۲۰۱۸ء میں تاریخ پبلی کیشن لاہور سے شائع ہوئیں، جن کے دوسرے ایڈیشن بھی ۲۰۱۹ء میں آچکے ہیں۔

۳: سلام سندیلوی ، اردو شاعری میں منظر نگاری (لکھنؤ : نسیم بک ڈپو ، ۱۹۶۸ء) ، ص ۳۹ ۔

۴: الیاس بابر (مترجم)، بنیادی تنقیدی تصورات (تھیئری / تناظرات) (لاہور: عکس پبلیشرز، ۲۰۱۸ء)، ص۲۷۱۔

۵: سبط حسن ، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا (کراچی : مکتبہ دانیال ، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۹-۲۱۔

۶: ظفر حسن، "تصورِ فطرت"، مشمولہ: سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۳ء)، ص۱۵۹۔

۷: محمد اسحاق ، " بچوں کی تعلیم اور ماحولیات " mazameen.com، (۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء)۔

۸: اسماعیل میرٹھی ، کلیات اسماعیل ، مرتب : اسلم سیفی (دہلی : دیال پرنٹنگ پریس ، ۱۹۳۹ء)، ص۷۱۔

۹: ایضاً۔

۱۰: ایضاً، ص۹۷۔

۱۱: ایضاً، ص۹۷-۹۸۔

۱۲: مسعود اشعر (مترجم)، دنیا کو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے، روبرٹ ایلن (لاہور: مشعل بکس، ۱۹۹۲ء)، ص۱۰۰۔

۱۳: ایضاً، ص۹۱۔

۱۴: ایضاً۔

۱۵: ایضاً، ص۳۴۴-۳۴۵۔

۱۶: نور محمد، شجر کاری کے فوائد سائنس اور شریعت کے آئینے میں (گوجرانوالہ: ادارہ انیس الکتاب، ۱۹۹۵ء) ، ص۱۱۹-۱۲۰۔

۱۷: کلیات اسماعیل، ص۳۴۵۔

۱۸: ایضاً، ص۹۴۔

۱۹: ایضاً، ص۹۳-۹۴۔

۲۰: ایضاً، ص۸۱۔

۲۱: شیریں زادہ ، رسول اکرم ﷺاور علم حیوانات (لاہور : حرا پبلی کیشنز ، ۲۰۰۱ء) ، ص ۶۹۔

۲۲: کلیات اسماعیل، ص۸۲۔

۲۳: ایضاً۔

۲۴: ایضاً، ص۸۶۔

۲۵: ایضاً، ص۸۶-۸۷۔

۲۶: ایضاً، ص۸۷۔

۲۷: مارک ٹوئن(Mark Twain)، "The Damned Human Race"، https://moodyap.pbworks.com/f/Twain.damned.pdf

۲۸: کرسٹوفر مینز، " فطرت اور خاموشی"، مشمولہ :ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل ،اورنگزیب نیازی (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص ۶۲۔

۲۹: کلیات اسماعیل، ص۸۸۔

۳۰: ایضاً،

۳۱: شیریں زادہ ، رسول اکرم ﷺاور علم حیوانات (لاہور : حرا پبلی کیشنز ، ۲۰۰۱ء) ، ص۱۶۱۔

۳۲: کلیات اسماعیل، ص۸۸-۸۹۔

۳۳: اورنگزیب نیازی ، " ماحولیاتی تنقید : پس منظر ، آغاز اور امتیازات " ، مشمولہ : بنیاد ، ج ۱ (۲۰۱۹ء) ، ص۱۷۔

۳۴: کلیات اسماعیل، ص۱۲۲۔

۳۵: ایضاً،

۳۶: ایضاً، ص۸۵۔

۳۷: ایضاً، ص۹۲۔

۳۸: ایضاً

۳۹: ایضاً، ص ۹۸۔

۴۰: اورنگزیب نیازی، " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ " ، مشمولہ : تاریخ ادب اردو ، ج ۳، ش ۱ (جنوری، مارچ ۲۰۲۱ء) ، ص ۱۲-۱۳۔

۴۱: ایضاً، ص ۹۹۔

۴۲: ایضاً، ص ۲۶۰-۲۶۱۔

۴۳: ایضاً، ص ۴۳۔

۴۴: ایضاً۔

۴۵: ایضاً، ص ۸۳-۸۵۔

۴۶: اورنگزیب نیازی، " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ " ، مشمولہ : تاریخ ادب اردو ، ج ۳، ش ۱ (جنوری، مارچ ۲۰۲۱ء) ، ص ۲۵۔

(باب چہارم)

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور ثقافت کے درمیان تعلق کا تصور

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور ثقافت کے درمیان تعلق کا تصور

پچھلے باب میں انسان کا دیگر حیوانی مخلوقات سے تعلق مثالوں کی صورت میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے غیر شعوری طور پر انسان کا روزمرہ کی زندگی میں ایک تعلق رہتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ہمیں ان کی موجودگی، ان کے ساتھ کی اشد ضرورت رہتی ہے اور ان کے وجود سے ہی انسانی زندگی کی بقا مشروط ہے۔ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی ایک ایسی دنیا موجود ہے جس میں انسان کا رہنا، سہنا، اٹھنا، بیٹھنا یعنی اپنے معمولات زندگی کو جاری و ساری رکھنا شامل ہوتا ہے۔ اسے ہم نے مختلف نام دے رکھے ہیں جنھیں ہم، سماج، تمدن، تہذیب، ثقافت، رسم و رواج وغیرہ کے ناموں سے جانتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں ایک معمولی فرق کے ساتھ انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت کی حامل گردانی جاتی ہیں۔ ہر معاشرے، علاقے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ چیزیں بدلتی رہتی ہیں اور چند جوں کی توں قائم رہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ انھیں شعری مثالوں کی صورت واضح کیا جائے اور انسان سے ان کے تعلق پر بات کی جائے یہ ضروری ہے کہ ان کی مختصر وضاحت پیش کر دی جائے تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔

انسان کا اس دنیا میں سب سے پہلا واسطہ اپنے ہی جیسے ایک انسان سے پڑتا ہے۔ یہی انسان آپس میں مل جل کر رہیں تو ایک سماج کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس سماج میں اپنی زندگیاں گزارنے کے لیے، ایک مہذب طریقے سے جینے کے لیے تہذیب بھی اس سماج کا ایک لازمی جز ہے۔ یعنی اگر یہ کہا جائے کہ انسانوں کے آپس میں مل جل کر رہنے کا نام سماج ہے اور زندگی کو ایک مہذب طریقے سے گزارنے کا نام تہذیب ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا ایک اور جزو ثقافت بھی ہے۔ اس حوالے سے ثقلین سرفراز لکھتے ہیں کہ انسان نے ثقافت کو ابتدا سے ہی تشکیل دینا شروع کر دیا تھا اور ہر دور میں بدلتے وقت کے ساتھ اس میں اپنی ضرورتوں کے تحت تبدیلیاں کرتا آیا ہے اور ارتقا کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ (۱) یہاں اس چیز کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ انسان نے اس سماجی تشکیل کا عمل کسی ایک دن میں سرانجام نہیں دیا تھا بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کے شعور اور مشاہدے میں تبدیلیاں آنے لگیں اور وہ ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنا سماج متشکل کیا۔ جس کے بعد تہذیبوں کا جنم ہوا اور یوں ایک سلسلہ چل نکلا۔ انسان نے ابتدائی ادوار میں اپنے زندہ رہنے کے لیے صرف اور صرف فطرت کا سہارا لیا تھا۔ فطرت کے زیر نگرانی ہی اس کی بقا اور موت طے ہوا کرتی تھی۔ پھر جب اس نے اپنی عقل کا استعمال کرنا شروع کیا تو فطرت کو اپنے فائدے کے لیے استعمال

کرنے لگا۔ تب جا کر ثقافت کا وجود عمل میں آیا۔ اس حوالے سے قاسم یعقوب کرسٹوفر پاٹر کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> انسان کا ثقافتی عمل اس کے سیدھے کھڑے ہونے تک رکا رہا۔ انسان حیاتیاتی طور پر کسی ثقافت کی تشکیل کر ہی نہیں سکتا تھا جب تک وہ اپنے جسم میں تبدیلی نہیں لے آیا۔ سیدھا کھڑے ہوتے ہی اس نے فطرت سے ایک فاصلہ قائم کرنا شروع کر دیا اور ثقافت کی گود میں چلا گیا۔ (۲)

یہ فطری طور پر ہونے والی انسانی تبدیلی تھی اس کے بعد ہی اس کی اپنی الگ پہچان بنی۔ پھر وہ سماج بنانے کے قابل ہوا اور اسی مناسبت سے تہذیبی اور ثقافتی بدلاؤ بھی سامنے آنے لگے۔ اس متعلق نئی ہونے والی تحقیقات اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ انسانی ثقافت کا وجود اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ہے۔ ماہرین ماحولیات کا کہنا ہے کہ ثقافت ہر بدلتے ماحول اور علاقے کے ساتھ اپنا چولا بدل لیتی ہے لیکن اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ انسانی معاشروں کی پہچان کرنا اسی سے مشروط ہے۔ فطرت یا اپنے ارد گرد کے ماحول سے الگ ہونا یا اپنی منفرد شناخت بنانا اسی وجہ سے ہی ممکن ہو پایا۔ انسان کے متعلق ہونے والے مختلف مطالعات اس کی ابتدائی ساخت ، رہن سہن کے طریقوں ،زندہ رہنے کی صلاحیتوں اور دیگر کئی پہلوؤں پر مشتمل ہیں۔ ثقافت سے متعلق یہ مطالعات کچھ ایسی تصویر پیش کرتے ہیں:

> انسانوں کی ارتقائی نشو ونما کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ثقافت ماحولیاتی طاق کا ایک جزو ہے جس میں ہماری نسلیں پروان چڑھتی ہیں، اس طرح ثقافت ایک نسل کی حیاتیاتی نشو ونما کا ایک باب پیش کرتی ہے۔۔۔ یہ ثقافت کا شکر ہے کہ انسانی ذاتیں خود کو ترقی دے سکتی ہیں اور دوسری ذاتوں سے بالاتر ہو سکتی ہیں۔ (۳)

ثقافت کو بحیثیت ایک لفظ کے یا انسانی سماج میں اس کی اہمیت کے دیکھا جائے تو ایک الگ مفہوم سامنے آتا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کے لیے ثقافتی ماحولیات کی اصطلاح کو متعارف کروایا گیا ہے۔ راقمہ نے حال ہی میں اس متعلق لکھے جانے والے کچھ تعارفیہ مضمون دیکھے ہیں۔ جن میں اس پر ابتدائی سطح پر بات کی گئی ہے۔ اس حوالے سے دہرائی جانے والی باتیں یا مفہوم جو سامنے آئے ہیں ان میں اسٹیورڈ کے خیالات کو ہر حوالے میں شامل کیا گیا ہے۔ چوں کہ انسان کے ساتھ ثقافتی تعلق اس باب کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کے مفہوم کو بیان کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ اسٹیورڈ نے استدلال کیا ہے کہ ہر ثقافت کو اس کی قدرتی اور تاریخی ماحول کی تشکیل کی حکمت عملی کے طور پر سمجھنا

چاہیے جس میں یہ ترقی کرتی ہے۔ یعنی، ثقافت قدرتی ماحول کی خصوصیات کا جواب ہے اور اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ (۴) اس حوالے سے جولین اسٹیورڈ نے مختلف نکتہ نظر کو یکجا کر کے ایک ماحولیاتی ثقافت کا نظریہ پیش کیا۔

اس کے مطابق وہ نکات یہ تھے کہ ماحول کی شراکت میں ثقافت کی وضاحت، ایک مسلسل عمل کے طور پر ثقافت اور ماحول کا تعلق، ثقافتی علاقے کے بجائے چھوٹے پیمانے پر ماحول کے بارے میں غور کرنا۔ (۵) اس متعلق کی جانے والی مختلف تعریفیں سامنے آئیں۔ ماحولیاتی ثقافت کے حوالے سے راقمہ کی نظر سے جو معلومات گزری ہیں یا وضاحت سامنے آئی ہے اس کی نوعیت ابتدائی سطح کی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کے ثقافت سے تعلق کو مجموعی حوالے سے دیکھا جائے گا جو ماحولیاتی تنقید کے نظریات میں بھی شامل ہے۔

لغات میں ثقافت کے معنی اس سے ملتے جلتے ہی دکھائی دیتے ہیں کہ کسی انسانی گروہ کے مذہب، اخلاق، علم و ادب اور فنون لطیفہ، طرز زندگی، رہن سہن کے طریقے اور تمدن سے جڑے وہ تمام تصورات جن کا تعلق کسی قوم سے ہوتا ہے، ثقافت کے معنی میں آئے گا۔ نوآبادیاتی عہد میں نوآبادرکار کی جانب سے " وہ سب معاشرے وحشی، غیر مہذب، پسماندہ اور "مجرم" قرار پاتے ہیں، جہاں سائنس اور جدیدیت کے وہ مظاہر موجود نہیں جنھیں مغربی جدیدیت نے تخلیق کیا ہے۔" (۶) (ہندوستانی ثقافت کو اس پس منظر میں انتہائی سطح پر بہت سی اونچ نیچ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔) نثار علی بھٹی نے مختلف ناقدین کی ثقافت سے متعلق آرا کو اپنے مضمون میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس میں ایک نکتہ کلچر اور ثقافت کے فرق کا بھی اٹھایا گیا ہے کہ انگریزی میں یہ لفظ کلچر کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے اس کی جو تعریف سامنے آتی ہے وہ یہ ہے:

> کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے اس کے لیے اردو میں متبادل لفظ ثقافت ہے۔ کلچر کے لیے تہذیب کا معنی بھی استعمال میں لایا جاتا رہا ہے۔ لیکن آج کل تہذیب و سولائزیشن اور کلچر و ثقافت کو ہم معنی و مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہم کلچر کے مفہوم کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلچر کا معنی کاشت کرنا، دیکھ بھال کرنا، جانوروں کو پالنے کا عمل، انسان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ بہتری لانا، مصنوعی طریقے سے خوردبینی جانداروں کی پرورش کرنا، اطوار کی نشوونما اور ترقی، ذہن، ذوق اور آداب کی تربیت اور افزائش بھی کیا جاتا رہا ہے۔ (۷)

یعنی مجموعی حوالے سے اس میں وہ تمام تر سماجی رویے بھی شامل ہیں جو ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں علم، عقائد، فنون، قوانین، رسوم و رواج، اور عادات و اطوار، مذہبی اقدار، تربیت غرض ہر شے جو ایک انسان اور ایک معاشرے کی بہتری اور اس کی پہچان و ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہے وہ سب شامل ہے۔

اس مختصر سے تعارف و وضاحت کے بعد اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے حوالے سے انسان کے ثقافت کے ساتھ اس تعلق کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جن میں تربیت کے ساتھ ساتھ، رسوم و رواج، تہوار، معاشرتی اقدار، تعلیم و تربیت وغیرہ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں انسان کا دیگر حیوانات سے تعلق جانوروں، پرندوں اور چند حشرات کی شکل میں مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہیں ان کے ہاں ایسی بھی چند ایک نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس میں انسان کا انسان کے ساتھ تعلق بچے اور ماں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ پیدائش کے بعد انسان سب سے زیادہ محتاج اپنے ہی جیسے ایک انسان کا ہوتا ہے۔ کھانے، پینے، سونے، جاگنے، بولنے، چلنے، مشکل حالات کا سامنا کرنے، اچھے برے کی تمیز سیکھنے، رہن سہن کے طریقے غرض ہر طرح کی سرگرمی کو انجام دینے کے لیے اسے کسی انسانی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور انسانی دنیا میں وہ ابتدائی سہارا/ ساتھ ماں کی شکل میں موجود ہے۔ انسان کے آپسی تعلق کی یہ ایک بہترین مثال ہے جسے اسماعیل میرٹھی نے بلترتیب مراحل کی شکل میں بیان کیا ہے۔ جس سے ایک پیغام یہ بھی ملتا ہے کہ انسان اس دنیا میں سب سے پہلے اپنے ہی جیسے ایک انسان کا محتاج ہوتا ہے۔ جسے ہم ماں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی کے ہاں "بچہ اور ماں" ، " ماں اور بچہ " اور " ماں کی ممتا" جیسی نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس حوالے سے راقمہ نے کچھ نظموں کو مکمل بیان کرنا س لیے خیال کیا ہے کہ اس سے ایک پورا منظر اور اس تعلق کی نوعیت واضح سامنے آسکے۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

اچھی اماں، مجھے بتا دو ابھی/کیوں ہے بچہ کی مامتا اتنی ؟
تم کو بچہ سے کیوں یہ الفت ہے ؟/کس لیئے اس قدر محبت ہے ؟
ماں نے بچہ کو یوں جواب دیا/حیف، تم جانتے نہیں بیٹا
کیسا لیٹا ہے یہ خوش و خرم/نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی غم
نہ تو روتا نہ بلبلاتا ہے/گود میں کیا ہمک کر آتا ہے
مسکراتا ہے کیا ہی خوش ہو کر/جیسے چڑیا مگن ہو ڈالی پر
جبکہ سونے کا وقت ہے آتا/میرے سینہ سے ہے چمٹ جاتا
جب کہ آنکھوں میں نیند آتی ہے/بسترا اس کا میری چھاتی ہے
نیند لے کر ہنسی خوشی سے اٹھا/پھول گویا کھلا چنبیلی کا
لگ گئی بھوک کہہ نہیں سکتا/پیاری نظروں سے ہے مجھے تکتاپ
یار کا میرے بس یہی ہے سبب/ نہیں آتا بیان میں مطلب (۸)

اگرچہ ابتدائی سطح پر انسان بولنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے لیکن ماں کے ساتھ اس کا ایک ایسا تعلق ہوتا ہے کہ وہ اپنی حرکتوں سے کبھی رو کر، کبھی چلا کر، کبھی ہنس کر اپنا مدعا بیان کر دیتا ہے۔ ماں ان کو سمجھتی ہے اور اس کے ہر عمل کا جواب دیتی ہے۔ جس طرح مذکورہ اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس کے سونے جاگنے، کھانے پینے کے اوقات سے لے کر اس کی ہنسی خوشی کے سب جذبات کو اس تعلق کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ چاہے بچہ کسی بھی حالت سے دوچار ہو یہی ماں ہے جو اس کی ہر تکلیف کو سمجھ سکتی ہے اور اسے دور کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جس طرح بچے کے سوالوں کے جواب ماں دیتی ہے اور اپنے اس بے لوث رشتے کی وضاحت کرتی ہے ویسے ہی ایک تصویر میں بچہ بھی اپنے اس تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں کے اس لمس کو اور گود کی گرماہٹ کو محسوس کرنا اس کے لیے مشکل نہیں۔ آخر وہ ماں کی کوکھ میں نو ماہ گزارتا ہے تو کیسے ماں کی خوشبو کو محسوس نہیں کر سکے گا۔ قدرت نے اس تعلق کو انتہائی انمول بنایا ہے۔ جسے صرف ماں ہی بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس نازک، آفاقی، انمول اور بے لوث رشتے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بچے کی ماں سے محبت ملاحظہ ہو:

بولی بچہ سے ماں میرے پیارے/صدقے اماں، جواب دو بارے
کہ ہے بچہ کو ماں سے الفت کیوں؟/رکھتا ہے اس قدر محبت کیوں؟
دیا بچے نے یوں جواب سنو/اے ہے اماں خبر نہیں تم کو
مجھ کو تکلیف سے بچاتی ہو/پیار سے گود میں بٹھاتی ہو
جی مرا بدمزہ اگر ہو جائے/میرے دکھ کا تمہیں اثر ہو جائے
مجھ کو ہو درد تم کو حیرانی/چپکے چپکے کرو نگہ بانی
اچھے اچھے کھلاتی ہو کھانے/پیار کرتی ہو تم۔ خدا جانے
اور سب سے کہ آ رہے ہیں نظر/تم زیادہ ہو مہربان مجھ پر
جانتا ہوں عزیز سب سے تمہیں/چاہتا ہوں اسی سبب سے تمہیں
پیاری اماں کہا نہیں جاتا/ نہیں مطلب بیان میں آتا(۹)

اس محبت کو یا اس تعلق کو لفظوں کی شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسماعیل میرٹھی نے ان احساسات و جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے۔ جس میں دونوں فریقین کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے کے لیے ہونا کتنا اہم ہے۔ ایک کے بغیر دوسرا اکمل ادھورا ہے۔ اس کردار کو ماں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کی ہر معاشرے، ہر تہذیب، ہر سماج میں ایک ہی حیثیت ہے۔ اس کے لیے کوئی حدود یا پیمانے مقرر نہیں ہیں۔ نہ اس میں کسی مخصوص معاشرے کے

کردار کا دخل شامل ہے۔ انسان کا یہ ابتدائی تعلق ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے اس معاشرے میں اپنا کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ کس طرح اپنی اقدار و روایات کی پاسداری کر سکتا ہے۔ کیسے بحیثیت ایک انسان کے اور پھر ایک شہری کے اپنی اس تربیت کا پاس رکھ سکتا ہے۔ اس مناسبت سے اسماعیل میرٹھی کی ایک اور طویل نظم " ماں کی مامتا " بھی اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ جس میں بلترتیب اس تعلق اور اس کے کردار کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

مامتا ماں کی جانتے ہیں سب/ماں ہے بچے کی پرورش کا سبب
بھوک بچے کو ہے ستاتی جب/ماں سے کرتا ہے رو کے دودھ طلب
دودھ دیتی ہے پیار کرتی ہے/جان اس پہ نثار کرتی ہے
بچہ سینے سے جو رہا ہے چمٹ/نہیں لے سکتی بے دھڑک کروٹ
پانو کی بھی نہ ہو ذرا آہٹ/کبھی ننھے بچے کی نیند جائے اچٹ
اوں اوں کرتی تھپکتی جاتی ہے/ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے
جب رہا وہ نہالچہ پر سو/چھوٹے تکیے لگا دیے دو دو (۱۰)

ماں چاہے جس حال میں بھی ہو۔ بچے سے دور ہو یا اس کے قریب اس کی بھوک اور رونے کی خبر اسے فوراً ہو جاتی ہے۔ وہاں بچے نے رونا شروع نہیں کیا ہوتا کہ ماں کی ممتا تڑپ اٹھتی ہے۔ یہ ماں کا ہی انمول پیار ہے جو اپنے بچے کو تکلیف میں یا روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اور اس کی جانب دوڑ پڑتی ہے۔ دودھ پلاتے وقت یا کھانا کھلاتے ہوئے وہ ذرا سا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتی کہ کہیں میرے بچے کو مشکل نہ ہو، کہیں اس کی نیند میں خلل نہ پڑ جائے۔ چاہے اس دوران ماں کو کیسی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے وہ اسے سہہ لے گی لیکن اپنی اولاد پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔ اسے لوری سناتی ہوئے ہولے ہولے تھپکی دے کر سلاتی ہے۔ اس کے سکون کے لیے اسے نرم جگہ فراہم کرتی ہے۔ ماں ہر وہ چیز کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتی ہے جس سے اس کی اولاد آرام و سکون سے بنا کسی تکلیف کے رہ سکے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی زبان سے کبھی اف تک نہیں نکلتی۔ ایک اور جھلک ملاحظہ ہو:

ماں کو آرام کی فرصت کہاں/سوئی بے ڈھب تو آ گئی شامت
کپڑے لتوں کی ہو گئی کیا گت/ہے بچھونا بھی تر بتر لت پت
صبح اٹھ کر کھنگالتی ہے تمام/جاڑے پالے کا وقت اور یہ کام
بچہ اتنے میں چونک اٹھا سو کے/ناک میں دم کیا ہے رو رو کے
ماں نے پھر لے لیا ہے خوش ہو کے/نیا کرتہ بدل کے منہ ہاتھ دھو

باتیں کرتی ہے پیار سے جوں جوں/بولتا ہے جواب میں آغوں(۱۰)

یہ بچے کا اپنی ماں سے یا ایک انسان کا اپنے ہی جیسے ایک انسان سے بالکل ابتدائی تعلق اور تعارف ہے جب وہ اس دنیا میں آتا ہے۔ یہی ابتدائی تعلق اور اس دوران ہونے والی تربیت ہی اس کی آنے والی مکمل زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتی ہے۔ اس حوالے سے ماہرین کی مختلف رپورٹس، تجربے، مشاہدے اور سرویز بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ جس طرح گزشتہ سال بندروں پر کیے جانے والے مختلف تجربوں سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ چوں کہ ان کی ساخت اور عادات بالکل انسانوں سے ملتی جلتی ہیں تو یہی نتائج انسانوں پر بھی لاگو کیے جا سکتے ہیں۔ اس متعلق جو مطالعات کیے گئے ان میں شامل ییل یونیورسٹی کی امینڈا ڈیٹمر کہتی ہیں کہ "یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس کے مثبت اثرات اگلی نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔"(۱۱)یعنی ماں اور بچے کے ابتدائی تعلق کے فوائد آنے والی نسلوں تک بھی منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس ابتدائی سطح کی تربیت، توجہ اور خیال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ وہ آنے والی نسلوں تک پہنچتا ہے۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

رات کو لوریاں سناتی ہے/گود میں لے کے بیٹھ جاتی ہے
کس قدر زحمتیں اٹھاتی ہے/بچہ ہے اور ماں کی چھاتی ہے
کبھی کنڈی بجا کے بہلایا/کبھی کندھے لگا کے ٹہلایا
اس کا ہپا جدا پکاتی ہے/انگلیوں سے اسے چٹاتی ہے
باتیں کرنا اسے بتاتی ہے/پانوں چلنا اسے سکھاتی ہے
ماں کو بچہ سے جو محبت ہے/درحقیقت خدا کی رحمت ہے
اتفاقا جو ہو گیا بیمار/پھوڑا پھنسی ہے یا زکام بخار
پھر تو ہر وقت ہے گلے کا ہار/ماں کو اس سے زیادہ ہے آزار
اپنے آپے کا کچھ نہیں ہے ہوش/بیٹھی ہے بت بنی ہوئی خاموش
وہم سے دل ہے کانپتا تھر تھر/اڑ رہی ہیں ہوائیاں منہ پر
ہے فقط فضل پر خدا کے نظر/مانگتی ہے دعائیں رو رو
پڑ گئی کان میں کچھ اور بھنک/لگی ہونے کلیجہ میں دھک دھک(۱۲)

پیدائش سے لے کر اس کے آہستہ آہستہ بڑے ہونے تک کے مختلف مراحل کو ان مثالوں کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دوران پیدا ہونے والی مشکلات اور ان کے بچاؤ کو کس طرح ایک ماں دور کرتی ہے اور بچے کے لیے آسانیاں پیدا کرتی

ہے یہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا اور سب سے بڑھ کر بولنا یہ سب بلترتیب انجام پانے والے مراحل ہیں۔ بولنے کی اہلیت انسانی زندگی میں سب سے ضروری ہے اور یہ چیز ابتدائی سطح پر بچے کی غوں غاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس حوالے سے انسانوں کے بیچ بالکل ابتدائی سطح پر ہونے والی گفتگو یا پیغام رسانی پر مختلف تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ یہ انسان کے دوسرے انسان سے ابتدائی تعلق کو بھی واضح کرتے ہیں کہ اپنی بات کا بیان دوسرے تک کیسے پہنچایا جا سکتا ہو گا۔ جس طرح ایک بچے کی غاں سے ماں کئی مطلب اخذ کر لیتی ہے۔ یہی بظاہر غیر اہم اور بے وقعت نظر آنے والی اصوات ہی دراصل باہمی رابطے کی ابتدائی شکل تھیں۔ جن میں جنگلیوں کی وہ کوک بھی شامل ہے جس سے وہ ایک دوسرے کو خطرات سے یا کوئی پیغام دینے سے آگاہ کرتے تھے۔ یونیورسٹی آف کیمبرج کی ماہر لسانیات ڈاکٹر لورا رائٹ کہتی ہیں کہ عام طور پر ہونے والی بات چیت کی اہمیت کو کم یا بے وقعت نہیں کیا جا سکتا۔ گپ شپ، بات چیت، بڑبڑاہٹ روزمرہ کی گفتگو کا بڑا حصہ ہیں۔ (۱۳) اس طرح کی ہر سطح پر ہونے والی گفتگو کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو نئی اصوات کو بھی جنم دیتی ہیں اور نئے الفاظ بنانے میں بھی مدد فراہم کرتی ہے۔

پیدا ہونے سے لے کر اس کے ابتدائی چند سال انسان ایک گھریلو ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت میں اس کا پورا گھرانہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ وقت بھی شروع ہوتا ہے جب انسان کا واسطہ اس پورے معاشرتی نظام سے پڑتا ہے۔ اسے اس ماحول میں رہنے اور جینے کے طور طریقے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اس باہر کی دنیا کے لیے بھی اس کی تربیت کی جاتی ہے جو ہمارے معاشرے کی صورت میں موجود ہے۔ یہاں بحیثیت ایک فرد کے اپنا کردار کیسے ادا کرنا ہے، اچھے برے کی تمیز، صحیح غلط کا فرق، بڑوں کا احترام وغیرہ سب شامل ہے۔ اسی سے متعلق شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

دشمنوں کا نہیں ہے جی اچھا/ماں کو اک ہول ہو گئی پیدا
پھر تو دنیا جہاں کی ہے دوا/ٹوم چھلے کا منہ ذرا نہ کیا
ہوت آن ہوت کا نہیں کچھ غم/رہے بچہ کی خیریت جم جم
چاؤ اور چونچلوں سے پلتا ہے/آخرش پاؤں پاؤں چلتا ہے
گھر سے باہر بھی جا نکلتا ہے/کھیلتا کودتا۔ اچھلتا ہے
ہوئی بچہ پے صدقے اور واری/کون کرتا ہے یوں خبرداری
جھٹ کلیجے سے لگالیا ماں نے/ جھاڑا۔ پونچھا اٹھالیا ماں نے
اب تو اک اور ہو گیا کھٹکا/جا کے اونچی منڈیر پر لٹکا
ماں نے بہتیرا اپنا سر پٹکا/گر پڑا تو نہ کھائے گا پٹکا

پھر دبے پاؤں جا کے لائی اتار/دیا آہستہ ایک طمانچہ مار
خیر سے اب تو کام کرتا ہے/روز مکتب میں شام کرتا ہے
کیا ادب سے کلام کرتا ہے/سب کو جھک کر سلام کرتا ہے
ماں چٹاچٹ بلائیں لیتی ہے/پیار کرتی دعائیں دیتی ہے (۱۴)

اس نظم کی شکل میں انسان کے انسان سے ابتدائی تعلق اور ان کے مختلف مراحل کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ جس میں اس کی پیدائش سے لے کر اس کے معاشرے میں قدم رکھنے تک کے معاملات کو اسماعیل میرٹھی نے ایک ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انسانی تربیت کا یہ ابتدائی ادارہ اس کی گود سے لے کر گور تک اپنی خدمات انجام دیتا رہتا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ انسانی زندگی میں انسان کے باہمی رشتوں و تعلقات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں انسانی زندگی میں رشتوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ پھر چاہے وہ کسی بھی روپ میں موجود ہوں۔ سب سے پہلے بنی نوع انسان کا انسانیت کے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم ہے جس کے باعث ایک انسان دوسرے انسان کے لیے خود میں کشش محسوس کرنے کے ساتھ احساس کے رشتے سے بھی جڑا ہوتا ہے اور یہی کشش اور احساس انسان سے انسان کے مزید رشتے یا تعلقات استوار کرنے کا باعث بنتی ہے یہ قدرت کا نظام بھی ہے اور انسانی زندگی کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے انسان کی فطری ضرورت بھی۔ گھریلو ماحول سے نکلنے کے بعد پورے معاشرے سے ہمارا ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے اور وہاں بھی یہ انسانی تعلق کسی نہ کسی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد ایک ماں ڈالتی ہے جسے اس نظم میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں انسان کے انسان سے ابتدائی تعلق پر بات کی گئی ہے اور اس کی ابتدائی شکل کو نظموں میں بیان کیا گیا ہے وہیں انسان کا ایک اور تعلق بھی جنم لیتا ہے جو اس کے سماج یا معاشرے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ پوری زندگی انسان کا ایک تعلق استوار لیتا ہے۔ اس کے چند اصول و ضوابط اور قوانین یا جنھیں ہم معاشرتی اقدار کہہ سکتے ہیں ان کی پاسداری کرنا بھی بحیثیت ایک فرد کے ہم پر فرض ہوتا ہے۔ جن میں اخلاقیات بھی شامل ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں کہیں طویل تو کہیں مختصر اشعار کی صورت میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں ایک انسان کی اخلاقی تربیت اور معاشرے میں اس کے فرائض کو دکھایا گیا ہے۔ ان میں " سچ کہو" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سچ کہو سچ کہو، ہمیشہ سچ / ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ
سچ کہو گے تو تم رہو کے شاد / فکر سے پاک رنج سے آزاد
سچ کہو گے تو دل رہے گا صاف / سچ کرا دے گا سب قصور معاف
جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو/ جھوٹ ذلت کی بات ہے آخ تھو(۱۵)

یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں ہم امر بلمعروف و نہی عن المنکر کی شکل میں پڑھتے ہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی شعری تصویریں اسماعیل میرٹھی کے ہاں دکھائی دیتی ہیں۔ جن میں کہیں وہ سچ بولنے کی تلقین کرتے ہیں، جھوٹ سے پرہیز کا سبق دیتے ہیں، بڑوں کا احترام کرنا سکھاتے ہیں مختصر یہ کہ ایک شخص کے لیے چاہے وہ کسی بھی عمر سے تعلق رکھتا ہو معاشرے میں کیسے رہنا ہے اور خود کو کیسے پیش رکھنا ہے وہ سب ان میں موجود ہے۔ کہیں کہانی کی شکل میں تو کہیں دو مصرعوں میں ہی پوری کہانی۔ سچ بولنے کی ایک کہانی کو انھوں نے " ایک لڑکا اور بیر " کی شکل میں بیان کیا ہے۔

ایک لڑکا ہے بڑا ایمان دار/آزمائش ہو چکی ہے چند بار
ایک دن وہ نیک دل اور با حیا/اپنے ہمسایہ کے گھر میں تھا گیا
آدمی بالکل نہیں واں نام کو/کیونکہ ہمسایہ گیا ہے کام کو
تازہ تازہ بیر ڈلیا میں بھرے/بے حفاظت ہیں گھر میں دھرے
لیکن اس نے بیر کو چھیڑا نہیں/ہو نہ جائے شبہ چوری کا کہیں(۱۶)

بچوں کی پوری زندگی کی تربیت کی بنیاد بچپن میں رکھی جاتی ہے۔ اس کے اثرات نہ صرف اس کی موجود زندگی پر بل کہ آنے والی نسلوں تک جاتے ہیں۔ مذکورہ مصرعوں میں ایک سبق دینے کے لیے جس طرح ایک پورا پس منظر بیان کیا گیا ہے وہ اخلاقی تربیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کا اطلاق کسی بھی حوالے سے زندگی کے کسی بھی کام پر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ایمانداری کی مثال ہے وہیں اسے یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ کون سے امور انجام دیے جائیں تو وہ ہماری اخلاقیات میں شمار نہیں کیے جاتے ہیں جنھیں ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرتا اور جس کے بدلے میں ہمیں سزا دی جاتی ہے جیسے چوری۔ بقیہ مصرعے ملاحظہ ہوں جن میں سچ بولنے کی تربیت دکھائی جا رہی ہے:

آ گیا اتنے میں ہمسایہ وہاں/کھیل میں مصروف ہے لڑکا جہاں
اپنے بیروں میں نہ پائی کچھ کمی/ہو کے خوش لڑکے سے بولا آدمی
بیر یہ تم نے چرائے کیوں نہیں ؟/کیوں چراتا ؟ چور تھا کیا میں کہیں ؟
چور جب بنتے کہ کوئی دیکھتا/دیکھنے کو میں ہی خود موجود تھا
کچھ برائی آپ میں گر پاؤں میں/پانی پانی شرم سے ہو جاؤں میں
واہ وا، شاباش، لڑکے واہ واہ/تو جواں مردوں سے بازی لے گیا(۱۷)

یہ وہ تربیت ہے جو بچپن سے ماں اور گھر کا ادارہ سر انجام دیتا ہے۔ ہمسائیوں کے حقوق کیا ہیں۔ کسی سے کوئی چیز لینی ہے یا کچھ استعمال کرنا ہے تو پوچھ کر کرنا ہے۔ سچ، جھوٹ، اچھے، برے کی تمیز کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ یا ہماری ثقافت کس چیز کو برا جانتی

ہے اور کن چیزوں کو اچھا۔ " کچھ برائی آپ میں گر پاؤں / پانی پانی شرم سے ہو جاؤں " یہ مصرعے بتا رہے ہیں کہ انسان کی تربیت اسے کیا کچھ سکھا دیتی ہے۔ یہ شے خدا کے نام، اس کی پہچان سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے وجود اور اس کے مالک ہونے کا بتایا جاتا ہے بچپن میں یہ چیزیں سکھائی جاتی ہیں کہ اگر غلط کام کرو گے تو اللہ میاں سزا دیں گے۔ اچھا کام کرو گے تو صلے میں انعام دیا جائے گا۔ وہ ہر جگہ موجود ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ اس طرح کی نظمیں بھی اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا حصہ ہیں۔ " بچپن میں خدا کی یاد " سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اے زمین آسماں کے مالک / ساری دنیا جہاں کے مالک
تن بدن اور جان کے مالک / میں نہیں جانتا کہاں ہے تو
روز سنتا ہوں سب سے تیرا نام / تو بناتا ہے سب کے بگڑے کام
تو ہی دیتا ہے رات دن آرام / جانتا ہوں کہ مہرباں ہے تو
ندی نالے، پہاڑ اور میدان / پھول پتے درخت اور حیواں
تیری کاریگری کے ہیں نشاں / ہم نے مانا کہ بے نشاں ہے تو(۱۸)

بچپن میں خدا کی یہ تصویر ہمیں سمجھانے سکھانے کے لیے پیش کی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کلمے، دعائیں، چار کتابوں کے نام، آخری رسولؐ کی شان اور ایسی کئی دیگر چھوٹی چھوٹی چیزیں یاد کروائی جاتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہماری تربیت اور اخلاقیات کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو ایک معاشرے کی ضرورت اور اس کے چند مذہبی اصول و ضوابط کے تحت ابتدائی سطح پر سکھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد عمر کا وہ حصہ بھی آتا ہے جس میں ہم سمجھداری سے کام لیتے ہوئے اپنے اصل سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہر فعل کی انجام دہی میں یہ بات غیر شعوری طور پر ہمارے اذہان میں موجود ہوتی ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ اچھائی برائی، نیکی، بدی ہر شے میں اس کا ایک خوف موجود رہتا ہے لیکن ہم اسے کچھ ایسا سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ " میرا خدا میرے ساتھ ہے " کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

ہے ہمیشہ میری خدا پہ نظر / رات ہو دن ہو شام ہو کہ سحر
نہ اجالے میں ہے کسی کا ڈر / نہ اندھیرے میں کوئی خوف و خطر
کیوں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے(۱۹)

معاشرتی سطح پر ہماری ایک اور طرح کی جانے والی اخلاقی تربیت بھی ہمارے کام آتی ہے۔ غصہ نہ کرنا جو تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ کسی کی خطا کو معاف کر دینا اچھا عمل ہے، بڑوں کا ادب لازم ہے، فضول خرچی بری شے ہے، اچھے برے کی تمیز کیا

ہے۔ سچ، جھوٹ، چغل خوری، نیکی بدی، کوشش کیے جانا، محنت سے جی نہ چرانا وغیرہ یہ سب چیزیں اور ان کی پاسداری کرنا مہذب معاشروں کی پہچان میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ معاشرے انسانوں سے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ " غصہ کا ضبط" " ادب" اور " چغلخوری" سے اشعار دیکھیے:

دل میں جب کوند جائے برق غضب / اور طبیعت ہو انتقام طلب
اس خطرناک راہ میں جو مرد / کر سکے آتش غضب کو سرد
ڈانٹ کر دیو نفس کو لے تھام / اور نہ لائے زباں پہ سخت کلام
مشورت عقل کی سنے اس دم / ہے وہی اپنے وقت کا رستم (۲۰)

انسانی تربیت میں اس شے کو بھی شامل کیا جاتا ہے کہ اپنے اندر کتنا صبر اور حوصلہ رکھنا ہے۔ وہ کون سے مراحل و مواقع ہیں جہاں تحمل و برداشت سے کام لینا ہے۔ یہ سیکھ ہمیں کسی بھی بڑے نقصان سے بچا سکتی ہے۔ خصوصاً ایسے موقعوں پر جب ہم حق پر ہوں لیکن کوئی ہماری بات نہ سمجھ پائے یا ہمارا غلط استعمال کرے تو غصے پر قابو رکھنا چاہیے۔ کسی سے بدلہ لینے کی آگ میں ہم بعض اوقات اپنا آپا کھو بیٹھتے ہیں۔ ایسے نازک موقعوں کے لیے ہمیں صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ایسے شخص کو نہ صرف اچھا مانا جاتا ہے بل کہ معاشرے میں اس کی عزت بھی کی جاتی ہے جو ایسے موقعوں پر نفس پر قابو رکھتا ہے۔ اس کی مثال مندرجہ بالا نظم کی شکل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ وقت کا رستم کہلاتا ہے۔ ذیل میں ایک اور سیکھ " ادب" کی شکل میں ملاحظہ ہو:

ادب ہی سے انسان انسان ہے / نہ سیکھے ادب جو وہ حیوان ہے
جہاں میں ہو نہ پیارا کیوں کر ادب / کہ ہے آدمیت کا زیور ادب
نہ ہو جس کو اچھے برے کی تمیز / نہ وہ گھر میں پیارا نہ باہر عزیز
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب / یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب (۲۱)

اسماعیل میرٹھی کی یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں ان سیکھیوں کی یاددہانی کرواتی ہیں جو ہمیں بچپن میں دی جاتی ہیں۔ بڑوں کا ادب کرتے ہیں، چھوٹوں سے پیار کرتے ہیں، بزرگوں سے تمیز و تہذیب سے پیش آتے ہیں۔ یہی ابتدائی وقت میں کی جانے والی تربیت ہمارے آنے والے وقت میں کام آتی ہے۔ ایسی ہی اخلاقی و تہذیبی باتیں ہمیں اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرتی ہیں۔ وہی انسان نہ صرف گھریلو سطح پر بل کہ معاشرتی و سماجی سطح پر بھی افضل مانا جاتا ہے۔ سب اس کی عزت کرتے ہیں

جو باادب ہو، جسے اچھے برے کی تمیز ہو، سچ، جھوٹ میں فرق کرنا جانتا ہو۔ وہ معاشرے کا بہترین فرد کہلانے کے لائق ہوتا ہے اس کے برعکس اسے کسی بھی جگہ پر کوئی عزت و مقام نہیں مل سکتا اور وہ ہر جگہ بے ادب جانا جاتا ہے۔

" چغلخوری" کے اشعار بھی کچھ ایسا ہی پیغام لیے ہوئے ہیں جو کسی بھی معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت ایک فرد کے ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہ مثبت و منفی تمام رویوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ہماری تربیت پر منحصر ہے کہ ہم نے اس سے کیسے اثر قبول کرنا ہے اور اس پر اپنے کیسے اثرات ڈالنے ہیں۔ اپنے ارد گرد کے ماحول کو کیسے بہتر بنانا ہے اور وہاں رہنے والوں سے کیسا اچھا میل جول رکھنا ہے۔ اس کے لیے ہماری تربیت کی جاتی ہے اور ہمیں سماج میں رہنے کے قابل بنایا جاتا ہے تاکہ ہم اپنی روایات اپنے رسم و رواج سے واقف ہو سکیں۔ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا ایک خاصا یہ بھی ہے کہ انسان کے ابتدائی ایام میں ہی اسے ایسی چیزوں سے آگاہی دلاتی ہیں جو اس کے لیے ٹھیک ہیں اور کون سی ایسی چیزیں یا رویے ہیں جو اس کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم میں چغلی جیسی بری عادت سے بچنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ یہ نظم ہمیں چغلخور والی کہانی کی بھی یاد دہانی کرواتی ہے جو ایک محلے کے لوگوں کو لڑوا کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ ہمارے ارد گرد ایسے بہت سے کردار ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے نہ صرف بچنا چاہیے انھیں سیدھے رستے پر آنے کی تلقین کرنی چاہیے کیوں کہ اس کا انجام سوائے ذلت و رسوائی کے اور کچھ نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چغلی ہے برا کام بچو اس سے ہمیشہ / جو لوگ ہیں بے شرم انھی کا ہے پیشہ
یہ لت بری ہے اس سے نہیں ہاتھ کچھ آتا / اکثر تو چغلخور ہی ذلت ہے اٹھاتا(۲۲)

یہ اور اس جیسی دیگر مثالیں جن میں محنت کرو، محنت سے راحت ہے، ہمت، اپنے فعل پر پشیمانی، خطا کو خطا نہ جاننا ہلاکت ہے، بدی کے عوض میں نیکی کرنا، قول و فعل میں مطابقت چاہیے، کوشش کیے جاؤ، جہد طلب، استقلال، اسلاف پر فخر بے جا، وقت رائیگاں نہیں کرنا چاہیے، اتفاق میں کامیابی ہے، خواب غفلت سے ہوشیار رہو، اسراف باعث بربادی ہے وغیرہ شامل ہیں اس حوالے سے دیکھی جا سکتی ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح کی تربیت اور اخلاقی پیغام چھپا ہوا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کے ہاں چند ایسی شعری مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں مقامیت اور ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ اخلاقی اقدار اور تہوار جو ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ ہیں ان کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مختلف تہواروں کا ذکر جو ایک اسلامی معاشرے کی پہچان کے طور پر پوری دنیا میں جانے جاتے ہیں ان کی ایک پوری تصویر اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے ایک حصے پر مشتمل ہے۔ جس میں عیدین، محرم، شب برات وغیرہ جیسی مثالوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو اپنے طور طریقوں

کے ساتھ موجود ہیں۔ ساتھ ہی اخلاقی تربیت پر مشتمل چھوٹی چھوٹی ابیات کی شعری مثالوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ذیل میں شب برات کی آمد کی ایک تصویر ملاحظہ ہو۔ اسے " عالم شہود " کے عنوان سے بھی لکھا گیا ہے اور یہ عید شب برات کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔

بگڑی ہے کیا انار پٹاخوں کی اب کے بات/ساون میں اتفاق سے آئی شب برات
بارود ہے خراب پٹاخے ہیں پھسپھسے/کم زور ہیں انار چھچھوندر ہے واہیات
پیسے گئے فضول تو خیر اس کا غم نہیں/ہے سال بھر کے کھیل کی یہی زکواۃ
بس چھوڑو کھیل کود کہ حلوا ہے گرم گرم/شامل ہے جس میں ذائقہ قند اور نبات
شیریں ہے خوش قوام ہے چٹ کیجئے اسے/حلوہ کی چاشنی سے ہے مصری بھی آج مات
بچوں کے واسطے ہے خورد و نوش کھیل کود/اصحاب اتقا کے لیے صوم اور صلوات (۲۳)

شب برات جسے اسلامی تہذیب میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ شب بیداری، شب قدر، شب نجات اس کے مختلف نام ہیں۔ شعبان کی مختلف تاریخوں میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں نوافل اور دیگر عبادات کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں اس کا آغاز آج سے کئی سو سال قبل ہوا اور آج تک اسے مذہبی عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ ان ابتدائی اشعار میں ان کے آغاز کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان موقعوں پر بچوں کی کیا سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ کیسے کھانے پکتے ہیں اور ماحول کی کیا صورت حال ہوتی ہے۔ ان کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مسلمان گھرانوں میں ایسے موقعوں کو بچپن سے ہی دیکھا جاتا رہا ہے اور انھیں منانے کا جوش جذبہ بھی ابتدائی عمر میں زیادہ ہوتا ہے۔ مزید مثالیں اس کی اصل کی عکاسی کرتی ہیں:

جاگیں گے آج اہل عبادت تمام شب/درگاہ کبریا سے کریں گے طلب نجات
سرکار حق میں پیش حساب و کتاب ہے/تقسیم رزق اور رقم موت اور حیات
اس واسطے دعا و طلب میں مبالغہ/کرتے ہیں تا کہ ان پہ ہو زیادہ التفات
اہل نظر ہیں وہ کہ جنھیں یہ خیال ہے/کیا مانگئے کہ ہیچ ہے یہ جملہ کائنات (۲۴)

والدین بچپن سے ہی ہماری تربیت میں ان چیزوں کی آگاہی، عقیدت و احترام شامل کرتے ہیں۔ اسلامی مہینوں کے نام اور ان کی مناسبت سے ان کی عبادات بھی یاد کروائی جاتی ہیں۔ یہ اسلامی معاشرے کی ایک خوبصورتی ہے جس کا بیان ان نظموں میں ملتا ہے۔ ایسی چیزیں ہمیں ہماری الگ پہچان سے روشناس کرواتی ہیں۔ ایسے اسلامی دن اور ان کا منایا جانا ہماری ہی

اسلامی ثقافت اور تہذیب کا حصہ ہیں جن سے ہم پوری دنیا میں ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ شب برات ایسی رات ہے کہ اس میں پروردگار سے جو کچھ طلب کیا جائے اور جس گناہ کی معافی مانگی جائے وہ اپنے در سے خالی نہیں لوٹاتا ہے۔ اس میں انسان کی زندگی و موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کے نصیب میں کیا لکھا جانا ہے اور کیا مٹانا ہے یہ طے کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اس شب کو جاگ کر عبادت کی جاتی ہے۔ نوافل ادا کیے جاتے ہیں اور رب کے حضور بخشش طلب کی جاتی ہے۔ کچھ اسی پس و پیش میں مبتلا رہتے ہیں کہ کیسے اور کیا مانگا جائے۔ کچھ کے نزدیک بے بہا مانگنا ہی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک تو جب بھی، جس وقت خدا سے چاہو مانگ لو والا یقین موجود رہتا ہے۔ جس کی کچھ تصویر ان مثالوں میں دیکھی جاسکتی ہے:

صاحب نظر کو فرق شب و روز کچھ نہیں /ہر روز عید ہے ہر شب شب برات
جو کچھ کہ ہے خیال میں خواب و خیال ہے /لے کر ازل سے تابہ ابد کل معاملات
سرکار کے بنائے ہوئے ہیں یہ سب عدد/اور عالم شہود ہے گویا شب برات
شانیں جدا جدا ہیں تجلی تو ایک ہے /کعبہ ہو ہر دوار ہو یا دیر سومنات (۲۵)

آج کے دور میں جس طرح شب برات اور اس جیسی دیگر راتیں منائی جاتی ہیں۔ ان کی بھی ایک تصویر اسماعیل میرٹھی نے "مراسم بیہودہ" کے نام سے رقم کی ہے۔ جس میں ان چند رسومات کا ذکر کیا ہے جو ایک فیشن کے طور پر اب رواج پا چکی ہیں۔ جنھیں ان دنوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے سے لے کر فضول خرچی کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ ایسے مواقع ہر تفریق کو ختم کرتے ہیں لیکن آج بھی ہم نے اس کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح مختلف معاشرے ایک دوسرے سے اثر لینے لگے ہیں۔ بہت سے ممالک نے دوسرے ممالک کو زیر کیا تو اپنی تہذیب و ثقافت کے اثرات چھوڑے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مختلف ثقافتوں کے لوگ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے رسم و رواج سے عادات و اطوار سے اثر قبول کرتے ہیں۔ ہماری سرزمین پر بھی کئی نوآبادیات قائم ہوئیں اور ہم نے ان سے اثر قبول کیا۔ وقت کے ساتھ ان میں تبدیلیاں رونما ہوئیں جنھیں آج دیکھا جاسکتا ہے۔ شعری جھلک ملاحظہ ہو:

اے شب برات عمر ہے تیری بہت بڑی /میں سن و سال تیرے کہاں تک کروں شمار
ہے ہجرت رسولؐ کو یہ تیرہویں صدی /اور تو ہر ایک سال میں آتی ہے ایک بار
دیکھا ہے تو نے آنکھ سے اسلام کا عروج / تجھ کو تو خوب یاد ہے تاریخ روزگار
کرتا ہوں اک سوال مجھے تو جواب دے / پہلے بھی تھا یہ فرقہ اسلام کا شعار ؟
کیا امت نبیؐ کی یہی رسم و راہ تھی / جو فی زمانہ ہے مروج بہر دیار
بول اٹھ جو تو نے دیکھی ہو اگلے زمانہ میں /حلوے کی چاٹ اور اناروں کی یہ بہار

ہے فرض عین آج پٹاخوں کا چھوڑنا /یہ مشغلہ نہ ہوے تو بچے ہیں بے قرار
حلوانہ کھائے جو وہ مسلمان ہی نہیں/ چھوڑے نہ جوانار وہ کاہے کا دین دار (۲۶)

موجودہ حالات کے مطابق یہ وہ سوالات ہیں جو آج سے کئی عرصہ پہلے اٹھائے گئے تھے لیکن ان کا اطلاق آج پر بالکل ویسے ہی کیا جاسکتا ہے جس کی تصویر اسماعیل میرٹھی نے اپنے زمانے کے اعتبار سے کھینچی ہے۔ ہماری ثقافتی اقدار میں ایسے دنوں کو انتہائی عقیدت واحترام سے منایا جاتا تھا۔ جس میں دکھاوے اور فضول خرچی جیسی رسومات شامل نہ تھیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ ہم نے خود سے ہی ان میں ایسے کئی اضافے کر لیے ہیں کہ اب ان کے بغیر ان دنوں کا منایا جانا بالکل معیوب معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں بے جا فضولیات زور پکڑ گئی ہیں۔ دکھاوے اور ایک دوسرے بہتر اور آگے بڑھنے کی دوڑ میں ہم نے ان دنوں کی اصل کو کھو دیا ہے۔ ان برکات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو ان کے طفیل ہمیں ملا کرتی تھیں۔ آج کی جدید دور کی نسل میں اس تڑپ اور جستجو کا فقدان پایا جاتا ہے اسماعیل میرٹھی نے ان کی وجوہات کو بھی اشعار کی شکل میں پیش کیا ہے۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

بولی شب برات کہ میں کیا دوں جواب / لوگوں کے سر پہ جب سے جہالت ہوئی سوار
اسلام کے طریق سے بس ہو کے منحرف / کر بیٹھے ہیں مراسم بیہودہ اختیار
یہ قوم آج اہل جہاں کی نگاہ میں / بدرسمیوں سے آپ ہے اپنی ذلیل و خوار
اسلام میں پتا بھی نہیں جن رسوم کا/ اصلِ اصول دیں انھیں کرنے لگے شمار (۲۷)

ان اشعار میں ان وجوہات کی جامع انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔ جن کی وجہ سے ایسے کئی اسلامی تہواروں اور دنوں میں خود سے اضافے کیے گئے ہیں اور انھیں پہلے سے زیادہ مشکل بنا دیا گیا ہے۔ ایک طبقہ تو باآسانی ان کی انجام دہی میں تمام لوازمات کے ساتھ مگن دکھائی دیتا ہے لیکن بہت سے احساس کمتری کا شکار ہو کر اس کی اصل سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جب کہ یہ دن اور مہینے، رسوم ورواج اور تہوار تو اپنی اصل اور سادگی کے ساتھ ہی بڑے بھرپور طریقے سے منائے جاتے تھے اور ان کی ادائیگی میں معاشرے کا ہر فرد حصہ لیتا تھا۔ ماہ رمضان کو ہی دیکھ لیا جائے تو سب کے لیے برابری کا پیغام لے کر آتا ہے۔ تمام مسلمان ممالک میں اسے مذہبی عقیدت واحترام سے منایا جاتا ہے۔ رمضان اور روزوں کی ایک تصویر "شکر نعمت" کی صورت میں ملاحظہ ہو۔ جس کی ادائیگی کے صلے میں عید کا تحفہ ملتا ہے۔

تیس دن بھوک پیاس کو روکو / یہ ریاضت ہے آدمی کو مفید
روزہ کیا چیز ہے بتائیں تمھیں / حرص کی قید نفس کی تہدید

سب کو بھولو خدا کو کرو یاد / سب کو چھوڑو بجز خدائے وحید
عید کرتے ہیں اس وتیرہ پر / جو خدا کے ہیں بندگان رشید
رمضان کا مہینہ یوں گزرا / ختم ہوئے روزے تو آئی عید
عید کے دن پڑھو نماز و دعا / عذرِ تقصیر کی کرو تمہید
کہ خدایا نہ ہو سکی طاعت / نہ ہوا ہم سے کوئی کار سعید (۲۸)

ایسے ہی ہمارے اسلامی معاشرے کے دیگر بھی کئی دن ہیں جنھیں نہ صرف اسلامی حیثیت حاصل ہے بل کہ کئی ثقافتی رنگ بھی لیے ہوئے ہیں۔ جس طرح رمضان کے بعد ہمیں عید الفطر کا تحفہ ملتا ہے اسی طرح ذی القعدہ کے مہینے میں زکواۃ ادا کرتے ہیں اور حج کی ادائیگی کے بعد ہم قربانی کرتے ہیں۔ جسے عید الاضحیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایسے اسلامی دن اور ساتھ ہی ان کے صلے میں ملنے والے تہوار جنھیں عیدین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ہمارے اسلامی معاشرے کی ثقافت کا ایک حصہ ہے۔ جو اپنی مذہبی حیثیت کے ساتھ قائم و دائم ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے مخصوص دنوں کے طور پر منائے جانے سے مشروط ہے" طواف بیت اللہ" میں اسماعیل میرٹھی نے حج کے حوالے سے اشعار رقم کیے ہیں۔ جن میں قربانی کا بھی ذکر شامل ہے۔ ان رسوم کی تصویر بھی پیش کی گئی ہے جو حج کی ادائیگی کے دوران ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہر رنگ، نسل طبقے سے تعلق رکھنے والے جب ایک ہی لباس پہنے یک زباں ہو کر ایک ہی جیسے ارکان کی ادائیگی میں حصہ لیتے ہیں تو باہمی یگانگت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہم بحیثیت مسلمان کے اس ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے اس نظم میں انتہائی مختصر اور جامع پیرائیہ اختیار کرتے ہوئے اس مذہبی فریضے کا ایک تعارف کروایا ہے۔ دنیا بھر سے مسلمان اس فریضے کی ادائیگی کے لیے جوق در جوق جمع ہوتے ہیں۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

عازمان طواف بیت اللہ / ساکنان نواح دور دراز
کارواں کارواں روانہ ہوئے / شوق حج میں کیا سفر آغاز
کر چکے طے محیط اعظم کو / جا لگے ساحل عرب پہ جہاز
سارباں نے بٹھا دیا ناقہ / ہو گئے داخل حدود حجاز
اشتیاق حریم میں سب نے / باندھا احرام یا کھلے کچھ راز
پھرتے ہیں خانہ خدا کے گرد / با خضوع و خشوع و عجز و نیاز
کر کے نام خدا پہ قربانی / ہوئے قربان عاشق جانباز (۲۹)

حج کی ادائیگی کے لیے ایک پورا طریقہ موجود ہے۔ اس کے مختلف مراحل ہیں جن میں سے اگر ایک کی ادائیگی بھی چھوٹ جائے تو اسے پورا تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ جس میں صفا و مروہ کے گرد چکر لگانا ایک پورا پس منظر لیے ہوئے ہے۔ پھر قربانی کے لیے چند ادائیگیاں مشروط ہیں جنھیں اسلامی طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو قبولیت کا درجہ ملتا ہے۔ قربانی کے دن سے متعلق" مقام محترم" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں حج و قربانی دونوں کی جھلک موجود ہے:

عید قرباں یادگار دین ابراہیمؑ ہے / کیا خوشی کا دن ہے یہ بھی رب کعبہ کی قسم
شوق میں اطراف عالم سے چلی آتی ہے خلق / روبسوئے کعبہ —دل مشتاق آثار حرم
ساکنان ربع مسکوں جمع ہیں مکہ میں آج /روسی و جاوی و ہندی ترکی و مصری بہم
مختلف سب کی زبانیں اور جدا شکل و لباس / پر طواف کعبہ سب ہم خیال و ہم قدم(۳۰)

یہ وہ اقدار و اطوار ہیں جو بحیثیت ایک مسلمان کے ہر شخص ادا کرتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کا علاقہ جو بھی ہو۔ اس کی زبان، لباس، طور طریقے اپنے ماحول اور ثقافت کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں لیکن ایک مقام پر آکر وہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے اور سب ایک جگہ، ایک چھت تلے اپنی رسوم کی ادائیگی کو جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر تفریق مٹ جاتی ہے۔ یہی کسی قوم کی مذہب کی اور ان کے لوگوں کی خوبصورتی ہے کہ ایسے رواج یا روایات ہمیں آپس میں ایک تعلق سے جوڑے رکھتی ہیں۔ عید قرباں کا ذکر اور اس دن کے حوالے سے دیگر نظموں میں اس کا ذکر شامل ہے جن میں (" علم و حکمت اسلام کا ورثہ ہے" ، " جہل و افلاس" ، " ترقی تدریس" ، "فتح عظیم"، فیض عام" ، " قوم کے بچوں کی اعانت")(۳۱) وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں عید کی آمد کی خوشی، اس روز کے پہناوے، رسم و رواج، بچوں اور بڑوں کا عید منانا، عیدی کا دیا جانا ان جیسی دیگر رسموں کا بھی ذکر دہرایا گیا ہے۔ جس طرح رمضان/ روزوں کا ذکر، شب برات، عیدین وغیرہ کی مثالیں مختلف نظموں میں جا بجا ملتی ہیں وہیں محرم کے مہینے کی بھی مثالیں موجود ہیں۔" سلام" کے عنوان سے محرم کی آمد کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

محرم کا چاند آسماں پر جو چمکا /تو یاد آگیا واقعہ رنج و غم کا
مصیبت کا بیداد کا بے کسی کا / غضب کا جفا کا بلا کا ستم کا
وطن سے جدا دشت غربت میں جا کر / ہوا قتل کنبہ شفیع الاممؐ کا
تڑپتی ہے بجلی تو روتے ہیں بادل/ کہ ہے آج کا دن شہیدوں کے غم کا(۳۲)

اسلامی مہینوں میں سے محرم سب سے پہلا مہینہ ہے جو اس دور کی اس دن کی یاد دلاتا ہے جب نواسہ رسول ﷺ نے اسلام کا پرچم بلند رکھنے کی خاطر اپنے اہل وعیال کو قربان کر دیا تھا۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ آج اگر اسلام کا پرچم بلند ہے تو وہ صرف اسی قربانی کی دین ہے۔ تبھی کہا جاتا ہے کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ اس ماہ کے آتے ہی مسلمان گھرانوں میں چاہے وہ اس فرقے سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ ہوں ایک سوگ کا سا ماحول چھا جاتا ہے۔ ہماری اسلامی تاریخ کا یہ ایک نہ مٹنے والا واقعہ ہے۔ جو ہر مسلمان کے دل عقیدت واحترام اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ "سادات کی امداد" کے اشعار ملاحظہ ہوں جس میں محرم کے مہینے کا ایک پورا احوال دکھائی دیتا ہے۔ جس میں اس ماہ کے رسوم ورواج بھی شامل ہیں:

مانا کہ بہت شوق سے کی تعزیہ داری / مانا کے عَلم دھوم سے یاروں نے اٹھائے
مانا کہ ہوا مرثیہ خوانی میں توغل /مانا کہ مجالس میں بہت روئے رلائے
لیکن کبھی سادات کا احوال بھی پوچھا/ غم خواری میں ان کی کبھی دو اشک بہائے
اولاد امامین تو ہے زندہ و موجود / صد حیف جو رحم ان کی مصیبت پر نہ آئے
ان میں بھی تو ہے خون اسی شیر خدا کا / ہیں یہ بھی اسی فاطمہ کی نسل کے جائے
ہے کوئی جواں مرد کہ ازراہ محبت/ سادات کی تعلیم میں دے اور دلائے (۳۳)

شب بیداری جیسی عبادات، روزہ، حج، عید الفطر، عید الاضحیٰ، محرم جیسے دنوں اور تہواروں کا جہاں ذکر نظمیہ پیرائے میں کیا گیا ہے وہیں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں حضور اکرمؐ کی شان میں، ان کی اس دنیا میں آمد پر اور اس کائنات کے وجود میں آنے کی وجہ تلاش کرنا بھی شامل ہے۔ اس حوالے ماہ ربیع الاول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اور ایسے بھی کئی رسوم ورواج اور اسلامی معاشرے کی روایات ہیں جو برسوں سے ایک طریقے کے مطابق چلتی آرہی ہیں۔ جنھیں ہر مسلمان مذہبی عقیدت اور جوش وجذبے سے مناتا ہے۔ جہاں وقت بدلنے کے ساتھ ان کی ادائیگی میں بہت سی تبدیلیاں بھی کرلی گئی ہیں وہیں ابھی بھی ایسے گھرانے موجود ہیں جو انھیں ان کی اصل کے ساتھ آج بھی قائم ودائم رکھے ہوئے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے انھیں اپنی شاعری میں، اپنے رسم ورواج، روایات اور ثقافتی اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ جس میں بچوں سے لے کر بڑوں تک کی شمولیت، ان کے آپسی میل جول کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ رمضان کا چاند دیکھنے کا موقع ہو یا عید کا چاند مسلمانوں میں ایک الگ ہی جوش وجذبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر آج کے دور میں چند اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو چاند دیکھنے سے متعلق ہیں۔ وہ دن بھی تجسس بھرا ہوتا ہے جس روز چاند کا اعلان

کیا جانا ہوتا ہے۔ مختلف صوبوں اور شہروں سے ملنے والی شہادتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے باقاعدہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو ان دنوں کی آمد کے چاند کا باقاعدہ اعلان کرتی ہے اور اسی مناسبت سے ہم یہ دن مناتے ہیں۔ ایک عرصے سے یہ دیکھنے میں آیا کہ چاند دیکھنے کی شہادتوں میں اتفاق نہ ہونا کہیں ان دنوں کو آگے لے جاتا ہے تو کہیں ان میں کمی کر دیتا ہے۔ اس کی ایک بھرپور مثال اسماعیل میرٹھی نے" اختلاف رائے" کے عنوان سے کھینچی ہے۔ جس کا مکمل اطلاق آج کے دور جدید پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

اب کے رویت میں آگیا ہے خلل / رمضان ایک اور عید ڈبل
یعنی انیتس ، تیس ، اٹھائیس / کیا تواریخ میں پڑا ہے بل
آج چکھی کسی نے افطاری / کوئی روزہ کو ہی گیا ہے نگل
دی کسی نے شہادت کامل / کوئی سمجھا اسے کہ یہ ہے زٹل
کوئی سمجھا رہا ہے ملا جی / کس لیے کر رہے ہو جنگ و جدل
بست و ہفتم کو چاند دیکھ لیا / خود غلط تھی شہادت اول
چاند کے اختلاف نے اب کے / میری عیدی کو کر دیا مہمل (۳۴)

آج کے پاکستانی معاشرے میں اس اختلاف کو بڑے پیمانے پر دیکھا جاتا ہے۔ جہاں آج ہم اس چیز پر متفق ہی نہیں ہو پاتے ہیں کہ چاند نظر آیا یا نہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے ان ثقافتی روایات اور شروع سے چلی آنے والی اقدار کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ جن میں سب جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔ یہی ان کی خوبی مانی جاتی ہے کہ انھیں ان کی جزئیات اور ان کی اصل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

> کسی معاشرے کی ثقافت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قدر موثر ہو کہ اقدار کا دائرہ کار متعین کرے اور انھیں مضبوط بنائے۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے میں اقدار ہی وہ معیار ہیں جو معاشرے کو مضبوط بناتی ہیں اور اسے زندہ رکھتی ہیں۔ اقدار ہی معاشرے میں اچھی روایات کو فروغ دیتی ہیں۔ اس طرح معاشرہ مستقبل کی ایک ایسی مثالی تصویر پیش کرتا ہے جس کی بنیاد دیرپا اور آفاقی انسانی اقدار پر مبنی ہوتی ہے۔ (۳۵)

اسماعیل میرٹھی کے ہاں ایسی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں مقامیت اور ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند متفرق مثالیں بیان کرنے کا مقصد ایک ایسی تصویر بھی سامنے لانا ہے جس میں ایک چیز کے بننے کے کچھ مراحل کا ذکر

کیا گیا ہے۔ ان مراحل میں ہماری فطری نظام اور ارد گرد کا ماحول کس طرح کردار ادا کرتا ہے اور اس کا ہونا کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ پھر اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہر شے کس طرح ایک مقصد کے تحت دوسری سے جڑی ہے۔ جس طرح نظم "ایک گنوار اور قوس قزاح" میں مینہ برسنے کی خبر کس طرح گاؤں کے لوگ اندازے سے لگاتے تھے کا ذکر شامل ہے۔ یہ ہماری دیہی ثقافت کا ایک رنگ ہے۔ اس کے پس منظر میں اگرچہ کوئی اور ہی سبق چھپا ہے لیکن ماحولیاتی نظام میں بھی اس کے کچھ معنی موجود ہیں:

تھی شام قریب اور دہقاں
میداں میں تھا گلہ کا نگہباں
دیکھی اس نے کمان ناگاہ
جو کرتی ہے مینہ سے ہم کو آگاہ(۳۶)

دیہی علاقوں میں جہاں دیگر نظام زندگی چلانے کو قدرتی چیزوں کا سہارا لیا جاتا اور انھی کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ وہیں آج بھی کچھ علاقے ہیں جو جدید سہولیات سے محروم ہیں اور اپنے قدرتی ماحول کے ساتھ جڑے ہیں۔ جس طرح ایک آٹے پیسنے والی چکی کا نظام کچھ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ جس سے ایک طرف روئی بھی سینچی جاتی ہے، تیل بھی نکالا جاتا ہے کئی جگہوں پر تو جہاں چکی چلتی ہے وہیں ساتھ نہر بھی جاری ہوتی ہے اور کہیں ٹیوب ویل چل رہا ہوتا ہے۔ دانوں کو آٹے کی شکل ملتی ہے۔ گہیوں سے بھوسا الگ ہو جاتا ہے جو چارے کے کام آتا ہے۔ بیک وقت ہونے والے یہ تمام کام کسی ایک شے کے جڑنے سے جھٹ پٹ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بنیاد کی کمی ہو تو کوئی بھی کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے۔ قدرت کا یہ نظام انسانی زندگی میں کیسے آسانیاں پیدا کرتا ہے اس کا مشاہدہ کسی ایسے شخص کا خاصا ہو سکتا ہے جو انھیں بہت قریب سے دیکھتا ہو۔ جسے اس نظام کو جاننے اور ان کی انسانی زندگی میں اہمیت کو ماننے سے دل چسپی ہو۔ اسماعیل میرٹھی کی نظمیں ان پر پورا اترتی دکھائی دیتی ہیں ایک اور مثال " پَن چکی" کی صورت میں ملاحظہ ہوں:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی /دھن کی پوری ہے کام کی پکی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر/تیرے پہیے کو ہے سدا چکر
پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر/تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
لوگ لے جائیں گے سمیٹ سمیٹ/تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ
پانی ہر وقت بہتا ہے ڈھل ڈھل/جو گھماتا ہے آ کے تیری کل
تو بڑے کام کی ہے اے چکی (۳۷)

قدرت کے کارخانے میں کوئی بھی شے بے کار یا فضول پیدا نہیں کی گئی ہے۔ اس نظام میں موجود ہر شے کسی نہ کسی مقام پر ایک ان دیکھے طریقے سے اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہے۔ ماحولیاتی مطالعات یا اس نظریے کے تحت ہونے والے کاموں میں ان چیزوں کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ انسان کو متوجہ کروایا جاتا ہے کہ جس نظام سے وہ جڑا ہے صرف وہی اس کا مالک نہیں ہے بل کہ وہ تو اس نظام کا محتاج ہے۔ اگر اس سے کٹ جائے گا تو ادھورا رہ جائے گا۔ اسماعیل میرٹھی کی نظمیں بارہا ایسے نظام کی جھلک پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بظاہر معمولی سی نظر آنے والی اشیا کس طرح ایک نظام سے جڑ کر اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

اس کی ایک اور مثال " دال کی فریاد " کی صورت میں ملتی ہے۔ جس کی تخلیق میں کس طرح ایک پورا قدرتی نظام کردار ادا کرتا ہے اس کو اسماعیل میرٹھی نے مرحلہ وار بیان کیا ہے جو ایک مکالمے کی شکل میں ہے۔ جس میں دال ایک لڑکی سے فریاد کرتی ہے کہ تم نے مجھے خواہ مخواہ اپنی جگہ سے جدا کیا۔ جب کہ میں اپنے اس قدرتی نظام کے ساتھ بہت خوش تھی۔ جس پر لڑکی اسے اس چیز کی یاد دہانی کراتی ہے کہ اگر میں تمہیں اتنی تمیز اور سلیقے سے نہ بناتی تو اس وقت تم کسی مویشی کے چارے کے طور پر کام آ رہی ہوتی یا کوئی جانور تمہیں کھا چکا ہوتا۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال/دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں/ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ/وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے تھی میں لہراتی/دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جھوکے آتے تھے/گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے
یہی سورج زمین تھے ماں باوا/مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھے کو پال پوس بڑا/آہ۔۔۔ ظالم کسان آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ/کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ
خوب لوٹا دھڑی دھڑی کر کے/مجھ کو گونوں میں لے گئے بھر کے
ہو گئی دم کی دم میں بربادی/چھن گئی ہائے میری آزادی (۳۸)

مندرجہ بالا اشعار میں فطرت جیسے انسان سے مخاطب ہو کر اپنا دکھڑا سنا رہی ہے۔ شاعر نے دال کو زبان دے کر اس کی کہانی اس کی اپنی زبانی سنائی ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک بے ضرر اور معمولی سی شے دکھائی دیتی ہے لیکن بغور مطالعہ اس کا ایک الگ ہی روپ سامنے لے کر آتا ہے۔ اس ایک چیز کا تعلق کس طرح اس قدرتی نظام سے جڑا ہے اور اس کا بویا جانا اور پھلنا پھولنا

ارد گرد کے ماحول کا محتاج ہے۔ بظاہر معمولی سی ایک دال انسانی دنیا میں کن مراحل سے دوچار ہوتی ہے اس کی بھی ایک الگ کہانی پیش کی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا بتاؤں کہاں کہاں کھینچا/دال منڈی میں مجھ کو جا بینچا
ایک ظالم سے واں پالا پڑا/جس نے چکی مجھ کو دل ڈالا
ہوا تقدیر کا لکھا پورا/دونوں پاٹوں نے کر دیا چورا
نہ سنی میری آہ اور زاری/خوب بنیئے نے کی خریداری
چھانا چھلنی میں چھاج میں پھٹکا/قید خانہ میرا بنا مٹکا(۳۹)

یہ اشعار نہ صرف ان مراحل کو بیان کر رہے ہیں جن سے دال کی فصل گزر کر ہم تک پہنچتی ہے بل کہ ہمارے سماج کے اس ادارے کو جو زراعت سے یا پیداواری صلاحیتوں سے جڑا ہوا ہے اس کی بھی ایک تصویر سامنے لاتی ہے۔ جہاں ایک طرف وہ وقت تھا جب ڈنڈوں سے فصلوں کو پیٹا جاتا تھا تاکہ دانوں کو الگ کر لیا جائے پھر انھیں چھان کر اناج الگ کر لیا جاتا تھا۔ بدلتے وقت کے ساتھ یہ ذمہ داری مشینوں نے لے لی اور انسانی ہاتھ صرف انھیں چلانے میں استعمال ہونے لگے۔ آج بھی چند علاقے ایسے ہیں جہاں اسی پرانی روایت سے کام لیا جاتا ہے۔ جس کی ایک وجہ وہ نچلہ طبقہ ہے جو جدید ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ جسے جاگیرداروں کے قرضے چکانے سے فرصت نہیں ہے۔ دال کی یہ کہانی ایسا ہی پس منظر اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مزید مثالوں میں دال کا انسانی ہاتھوں میں اس کا آجانا ایک الگ ہی منظر پیش کرتا ہے۔ جس میں اس کو چھلکوں سے جدا کرنا۔ اس کی چھان پھٹک کرنا، غیر ضروری مواد کو اس میں سے الگ کرنا اور پھر جب سالن بنانے کے لیے دیگچی کی زینت بنتی ہے تو اسے مزید الگ ہی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا رونا دھونا سن کر انسان اس پر الٹا احسان جتاتا ہے اور کہتا ہے:

کہا لڑکی نے میری پیاری دال مجھ کو معلوم ہے ترا سب حال
تو اگر کھیت سے نہیں آتی/خاک میں مل کے خاک ہو جاتی
یا کوئی گائے بھینس چر لیتی/پیٹ میں اپنے تجھ کو بھر لیتی
میں تو رتبہ ترا بڑھاتی ہوں/اب چپاتی سے تجھ کو کھاتی ہوں
نہ ستانا نہ جی جلانا تھا/یوں تجھے آدمی بنانا تھا
اگلی بیتی کا تو نہ کر کچھ غم/مہربانی تھی سب نہ تھا یہ ستم(۴۰)

اس پوری نظم کو بیان کرنے کا مقصد ان مراحل کی نظر ثانی کروانا تھا جو ایک پورے قدرتی نظام سے جڑے ہیں۔ کچھ چیزوں کے پیدا ہونے میں کس طرح ماحولیاتی نظام اپنا ایک کردار ادا کرتا ہے یہ سب ڈھکے چھپے طریقے سے انجام پاتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک چیز مکمل تیار شدہ صورت میں موجود ہوتی ہے لیکن اس کے بننے کی کارروائی سے ہم بے خبر ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک اور مثال " دال چپاتی " کی شکل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ نظم اپنے اندر مقامیت لیے ہوئے ہے۔ بظاہر اس میں دال اور چپاتی کا ایک مکالمہ ہی دکھائی دیتا ہے جس میں دونوں اپنے اپنے کردار سے متعلق خصوصیات گنوا رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں زمین آسمان کے قلابے ملا چکی ہیں اور چاہتی ہیں کہ اپنی اپنی جگہ پر ان کی برتری کو، اہمیت کو، ان کے فوائد کو مانا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کون زیادہ کس سے زیادہ بہتر ہے۔ کس کی اہمیت دوسرے سے زیادہ ہے اور اس چکر میں انسان ان کا قصہ تمام کر دیتا ہے۔

اور سنو ایک حکایت نئی/دال چپاتی میں جھڑپ ہو گئی
دل لگی کہنے کہ میرا مزہ/کرتا چپاتی کو بھی ہے با مزہ
میرے بدوں اس کو بھلا کھائے کون/روکھی چپاتی میں مزہ پائے کون
بلکہ نری دال اگر کھایئے/ہونٹ ہی بس چاٹتے رہ جایئے
کرتا ہے درویش جو روٹی طلب/دال چپاتی اسے دیتے ہیں سب
دیکھ لو اس وقت میری برتری/نیچے ہے وہ اور میں اوپر دھری
بیٹھتی ہوں چڑھ کے چپاتی پہ میں/مونگ دلا کرتی ہوں چھاتی پہ میں
اس کے سوا دیکھیے میرا سنگار/پہلے مصالح ہے پھر اس سے بگھار
مجھ کو پکاتے ہیں سبھی اد بدا/کھاتے ہیں سب شاہ سے لے تا گدا
میری فضیلت میں نہیں کوئی شک/واہ رے میں اور مرا آب و نمک
ذائقہ خوشبو پے مری لوٹ ہے/دل پہ چپاتی کے یہ ہی چوٹ ہے (۴۱)

پہلے پہل دال اپنا مدعا بیان کرتی ہے۔ اس چیز پر روشنی ڈالتی ہے کہ کس طرح میں چپاتی پر حکومت کرتی ہوں۔ میرے بنا اس کا کوئی مزہ نہیں لیا جا سکتا ہے۔ دال ایک ایسی غذا ہے جسے دیہی علاقوں میں من پسند خوراک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی فصلیں اگائی جاتی ہیں اور کئی مراحل طے کرنے کے بعد یہ اپنی اصل شکل میں واپس آتی ہے۔ کہیں بھی مہمان خانوں یا ہوٹلوں میں دیکھ لیا جائے کوئی ڈش موجود ہو یا نہ ہو دال کا ہونا طے ہوتا ہے۔ جسے امیر غریب بنا کسی چوں چرا ں کے آرام سے کھا لیتا ہے۔ بیماری میں مریضوں کو ہلکی خوراک کھانے کا کہا جاتا ہے جس میں دال کھچڑی بنا کر دی جاتی ہے۔ یوں

کہا جائے کہ یہ دیہی علاقے میں بسنے والے غریب کی خوراک ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ ساتھ ہی اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ ہمارے ثقافتی کھانوں میں اسے مختلف چیزوں کے ساتھ ملا کر بھی بڑے بڑے پکوان بنائے جاتے ہیں۔ جہاں دال نے اپنی کہانی سنائی وہیں چپاتی بھی پیچھے نہ رہ سکی اور بول اٹھی:

دال نے شیخی جو بگھاری بڑی/سن کے چپاتی بھی اچھل ہی پڑی
بے ادبی کر نہ میری شان میں/میری طفیلی ہے تو ہر خوان میں
دال ہو سالن ہو کہ چٹنی اچار/سب ہیں میرے ساتھ کے خدمت گذار
کوفتہ ہو قورمہ ہو یا کباب/تھام کے چلتے ہیں سب میری رکاب
چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ/دال کو پھر کون لگاتا ہے ہاتھ
دال کا دانہ بھی نہ چھکے کوئی/بلکہ رکابی میں نہ رکھے کوئی
دال تو اک ہارے کا ہتیار ہے/کھائے وہی اس کو جو بیمار ہے
دال میسر نہیں ہوتی جنھیں/صرف چپاتی کو غنیمت گنیں
جس کی فقط دال پہ گزران ہے/آدمی کاہے کو وہ حیوان ہے
یوں تو سبھی کھانوں میں افضل ہوں میں/دال سے سو مرتبہ اول ہوں میں
دونوں میں القصہ بہت بڑھ گئی/ایک پے ایک آن کے پھر چڑھ گئی
لقمہ بنا دونوں کو میں کھا گیا/قصہ ہوا فیصلہ جھگڑا گیا(۴۲)

جس طرح چپاتی نے اپنی شان میں قصیدے پڑھے ہیں اور ان پکوانوں کا ذکر کیا ہے جن کو چپاتی کے بغیر نہیں کھایا جا سکتا تو گویا اپنا رتبہ بڑھا گئی ہے۔ لیکن دال کھانے والے کو حیوان ہی کہہ ڈالنا یہ ٹھیک نہیں اگرچہ بہت سے جانور دال چنے بھی چارے کے طور پر کھا جاتے ہیں۔ مختلف پکوان اور ان کے کھانے کا طریقہ ہر ثقافت میں قدرے فرق کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ چٹ پٹے کھانے، تیز مصالحہ جات کا استعمال ہر علاقے/خطے میں ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کی ایک جھلک تھی جو ان اشعار کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسی چیزوں کا بیان اپنے اندر مقامیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان کی بوائی سے لے کر ان کی کٹائی اور صفائی مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ہی اپنی اصل تک پہنچتا ہے۔ فصلوں کے اگانے میں جہاں بارش، زمیں، پانی، دھوپ، سردی سب کا عمل دخل ہوتا ہے وہیں سب سے پہلے اس بیج کو اگانے اور کو سینچنے میں کسان ایک بنیادی کردار ہے جس کے بغیر زراعت کا شعبہ کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ ابتدائی سطح پر زراعت کے میدان میں کسان کے جس کردار کو ہندوستانی معاشرہ جانتا ہے اور اس کے ہاتھوں خون پسینے، محنت و مشقت سے اگنے والی فصلوں کی کٹائی و بوائی کے

مراحل سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا ہے وہیں نو آبادیاتی دور اس کی تصویر کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا ہے جب انگریزوں نے ہر شعبہ زندگی سے پر اپنے مفاد کی خاطر کوئی نہ کوئی اصلاحات نافذ کر کے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اس میں زراعت کا شعبہ بھی شامل تھا۔ ابتدائی سطح پر ہونے والی نصابی تبدیلیوں میں جو پہلی زراعت کے متعلق کتاب سامنے آئی تھی اس بارے میں ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تیاری میں کسی ہندوستانی سے مدد نہیں لی گئی تھی۔ اس میں اس زمانے کی جدید کاشت کاری کے اوزاروں کا تعارف کرایا گیا اور اس زمانے کی جدید معلومات پیش کی گئیں۔ (۴۳) یعنی جو بھی طریقہ کار سمجھائے بجھائے گئے وہ انگریزوں کے بنائے جدید زرعی آلات کا تعارف اور اس کے استعمال پر مشتمل تھے جو تجربے سے سیکھے سمجھے جا سکتے تھے جس سے ہمارا طالب علم بالکل واقف نہیں تھا۔ ہمارا کسان ہاتھ سے اور بیلوں کی مدد سے فصلوں کی کاشت اور کٹائی جانتا اور سمجھتا تھا اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم " کاشتکاری" اسی کسان کی ایک تصویر کھینچتی ہے اور اسے مزید محنت کرنے اور دل لگا کر کام کرنے پر اکساتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

گنجِ زر خاک سے اگلوایا/کیمیا شغل کاشتکاری ہے
کر چکا جب کسان اپنا کام/پھر خدا سے امیدواری ہے
وقت ضائع نہ کر اگیتی بو / سینچ لے کھیت نہر جاری ہے
نہیں حاصل پہ دسترس نہ سہی /بیج بونا تو اختیاری ہے
بیل سے پڑھ جفاکشی کا سبق/کچھ اگر تجھ میں ہوشیاری ہے (۴۴)

انسانی زندگی کا سب سے اہم جزو یہی زراعت کا میدان ہے اور اس کو چلانے کے لیے کسان، بیل اور اس کے ساتھ جڑے دیگر کرداروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جدید طریقہ کاشت کاری میں زیادہ فصل اگانے اور جدید مشینری کے استعمال سے جو کسان ہاتھ سے کام کر رہا تھا اس میں کچھ سہولت میسر ہونے کے مواقع زیادہ تھے۔ اس طرح کی چیزوں سے محنت مزدوری میں سستی شعوری طور پر در آتی ہے۔ اس حوالے سے یہ نظم کسان کو جگائے رکھنے اور اسے اپنی محنت کے بل بوتے پر کام کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے جس طرح محنت مشقت سے کام کیا اور اپنے اس ہنر کو اگلی نسلوں کو دیا اس کی قدر کرو۔ بیل کی مثال تمھارے سامنے ہے جو قدرتی طور پر اپنی محنت جاری رکھے ہوئے ہے۔ سوائے کسان تم بھی اسے جاری رکھو اور ان جدید طور طریقوں میں اگرچہ آسانی چھپی ہے لیکن یہ نہ صرف تمھیں قدرتی نظام سے دور کر رہی ہیں بل کہ زرعی پیداواری صلاحیتوں اور اناج میں مصنوعی پن، ملاوٹ سے کھوٹ پیدا ہو رہی ہے اس سے بچو اور قدرتی چیزوں سے جڑے رہو۔

اس نظام کائنات میں ہر دکھائی دینے والی چیز ایک ایسے نظام کی محتاج ہوتی ہے جسے ہم ماحولیاتی نظام کہتے ہیں۔ آج کے دور میں انسان یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہی اس دنیا کا حاکم ہے اور کائنات کی ہر شے اس کی آسائش اور آرام کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس لیے وہ اس قدرتی نظام کو اپنی سہولت کے مطابق نقصان پہنچاتا جارہا ہے۔ جس کی چند مثالیں اس باب میں بیان کی گئی ہیں کہ کس طرح ہم ہر چیز کے ساتھ جڑے ہیں چاہے وہ چرند پرند ہوں یا دیگر حیوانی دنیا سے تعلق رکھنے والی چیزیں۔ اسماعیل میرٹھی نے مثالیں دیتے ہوئے ان کی ہماری زندگی میں اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ساتھ ہی انسان کے اس زعم کو بھی توڑنے کی کوشش کی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ خود کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے لیکن اب خود کو دنیا کا حاکم سمجھ بیٹھا ہے۔ اس حاکمیت کو نظم " انسان" کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے:

میں بھی کیا خوب ہوں مجھ پر نہ کھلا راز اپنا / نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا
شاید اس بزم میں ہے مرتبہ ممتاز اپنا / لیکن اوروں سے نرالا ہے کچھ انداز اپنا
ہوں تو بےقدر پہ مجموعہ کل عالم ہوں / میں ہی مسجود ملائک ہوں اگر آدم ہوں
ابرو بادو مہ و خورشید میرے کام میں ہیں / مرغ و ماہی و درو دام میرے دام میں ہیں
آب و آتش میری خدمت کے سر انجام میں ہیں /کل جمادی و نباتی مرے خدام میں ہیں
مجھ میں قدرت نے عجب فضل وشرف رکھا ہے/ میں نے فردوس کے میووں کا مزہ چکھا ہے(۴۵)

انسان کا مسجود ملائک ہونا اسے کل عالم میں سب سے جدا بنا گیا۔ اسی سب سے جدا ہونے کے چکر میں اس نے ہر شے پر اپنا قبضہ جمالیا۔ جس طرح بیان کردہ مصرعوں میں عالم فطرت کے مختلف مظاہر پر اپنی دھونس جمانے کا ذکر دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے کام میں ہیں، میرے دام میں ہیں، خدمت کے انجام میں ہیں، مرے خدام میں ہیں وغیرہ جیسے جملے بشر مرکزیت کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ اس چیز کو بھلا بیٹھا ہے اپنی اس برتری کے چکر میں وہ خود اپنا نقصان کر رہا ہے۔ اسے یہ چیز سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ خدا کے بنائے اس قدرتی نظام کو نقصان پہنچائے گا تو سب سے پہلے وہ اپنی زندگی کا گلا گھونٹنے کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرے گا۔ یہ سراسر اس کی خام خیالی کہی جاسکتی ہے کیوں کہ وہ اپنی ثقافت کو اپنے ماحول اور اپنی اصل کو زیر کرتا رہے گا تو خود بھی ایک دن اپنا آپ اور اپنے زندہ رہنے کا سامان گنوا بیٹھے گا۔ ذیل میں ایک اور نظم ملاحظہ ہو جس میں انسان کو مخاطب کیا جارہا ہے۔ اس سے سوالات کیے جارہے ہیں اور اس کی نادانیوں کو گنوایا جارہا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

انسان کی خام خیالی

اے دیدہ وران دانش آثار/دنیا میں ہیں کیسے کیسے جاندار
ہاتھی چیونٹی عقاب مکھی/قدرت نے ہے سب میں بات رکھی
ایسا تو بتاؤ کوئی حیوان/جیسا نادان ہے یہ انساں
ہر ایک ہے اپنی راہ چلتا/جس راہ سے ہے مدعا نکلتا
آرام و خورش جو چاہتے ہیں/قدرت کی روش نباہتے ہیں
جس چیز سے ہے گزند ان کو/آتی ہی نہیں پسند ان کو
انساں ہے اگرچہ سب پہ فائق/مشہور ہے اشرف الخلائق (۴۶)

خدا کے بنائے اس نظام کو نقصان پہنچا کر کس طرح انسان اندرونی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی اوپر بیان کردہ تمام شعری مثالیں ان کی ماہر ماحول ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ جس میں مناظر قدرت کو بیان کر دینا ہی ایک کمال نہیں ہے بل کہ اس نظام کائنات کی چیزوں کے آپسی تعلق کو جوڑ کر بیان کرنا، ان کی انسانی زندگی میں اہمیت کو اجاگر کرنا اور ان کی حفاظت کی تلقین کرنا بھی ماحولیاتی نظام سے واقفیت رکھنے والے کا ہی خاصا ہے۔ ان نظموں انسان کو اس کی اصل، اس کی مقامیت، ثقافت، معاشرتی اقدار، قدرت سے کھلواڑ کرنے کے نقصانات سے بارہا باخبر کیا جا رہا ہے لیکن وہ کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ایسی ہی صورت حال کی منظر کشی نوم چومسکی کے خطبات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اس ماحولیاتی بحران پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عالمی ریاستوں کو اس معاملے پر سنجیدگی سے سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ ہم عالمی حدت کی اس سطح تک پہنچنے والے ہیں جو آج سے قریباً ۱۲۵۰۰۰ برس پہلے تھی۔ (۴۷) ہم بجائے غور کرنے کے جو کر رہے اس کی تصویر اسماعیل میرٹھی کی ان نظمیہ مثالوں میں دیکھی جا سکتی ہیں:

اڑتا ہے مگر اسی کا خاکا/پتلا ہے یہ سہو اور خطا کا
ممکن ہی نہیں خیال پرواز/کرنے لگے بیل صورت باز
یا چھوڑ کے عرصہ چراگاہ/غواص ہو مچھلیوں کے ہمراہ
انسان بخلاف حکم قدرت/کرتا ہے خیال ترک فطرت
ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن (۴۸)

یہ پورا نظام کائنات اور ان سے منسلکہ تمام عناصر کس طرح اس قدرتی ماحول کو قائم و دائم رکھنے اور اس کی بقا میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اس چیز کو بظاہر نہیں دیکھا جا سکتا ہے لیکن ان کا باریک بیں مطالعہ ہر عنصر کی اہمیت کو اور اس کی ضرورت

اپنی جگہ پر واضح کرتا ہے۔ انسانی زندگی بھی انھی سے چل رہی ہے اور اس کی بقا کا راز بھی ان سے اچھے تعلقات قائم رکھنے میں ہی پنہاں ہے۔ اس ماحولیاتی نظام کی اہمیت اور سلامتی ان جملوں سے بھی واضح ہوتی ہے:

> ماحولیات کی سلامتی کا مطلب زمین، ہوا، پانی، مٹی، صحرا، پہاڑ، ریگستان، نباتات، حیوانات تمام موجودات کے حقوق کا خیال رکھنا اور ان ماحولیاتی امور کی پاسداری ہے جن کا معاشرہ کی زندگی سے رابطہ ہے۔۔۔ لیکن انسانی معاشروں میں جو چیز عملی طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے منافع کے حصول کے لیے تمام ماحولیاتی فرائض سے پہلو تہی اور کسی قانون کی پاسداری کرتے نظر نہیں آتے۔ (۴۹)

بحیثیت ایک انسان کے اس نظام کو قائم رکھنے اور اس کی بہتری کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ ہے تو ہم ہیں۔ اس کے کسی ایک بھی حصے کا بگاڑ اس پورے ماحولیاتی نظام کے بگاڑ کا سبب ہے۔ کیوں کہ یہ پورا نظام ایک آپسی تعلق سے جڑا ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن ایک دوسرے پر انحصار کرتا ہے۔ جس کی کچھ مثالیں ہم نے اس باب میں ثقافتی حوالوں سے دیکھی ہیں۔ اس حوالے سے اورنگزیب نیازی لکھتے ہیں کہ ماحولیاتی ادب ایک ایسے معاشرے یا سماج پر انحصار کرتا ہے جس میں صرف انسانوں کو ہی موضوع نہ بنایا جائے بل کہ اس سے جڑے ارد گرد کے ماحول جس میں تمام عناصر شامل ہوں کو شامل کیا جائے۔ کیوں انسانوں کے ساتھ ساتھ دیگر مخلوقات بھی وہی مقام و حیثیت رکھتی ہیں جتنا کہ انسان۔ ماحولیاتی ادب "انسان اور انسانی سماج و ثقافت کے ساتھ فطرت اور اس کے مظاہر کو براہ راست موضوع و معروض بناتا ہے۔"(۵۰) اس میں چاہے انسان کا کسی بھی شے کے ساتھ تعلق بیان کیا جائے۔ انسان کی زندگی میں یہ پورا ماحولیاتی نظام ایک مددگار کے طور پر ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ جس کا اندازہ انسانی دنیا کو شاید تب ہو سکے جب وہ دوبارہ اس وقت میں جا پہنچے جس کی تباہی کا نقارہ بجایا جا چکا ہے۔

اس پس منظر کو لیتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ہمیں وہ تمام تر موضوعات ان کی اپنی اصل کے ساتھ ایک تعلق کے طور پر موجود دکھائی دیتے ہیں جو ماحولیاتی ادب کا موضوع ہیں۔ زیر نظر باب میں انسان کے تعلق کی سماجی و ثقافتی تعلق کو ڈھونڈنے کی ایک سعی کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کی چند مثالیں ہی زیر بحث آ سکی ہیں لیکن ان میں بھی اس تعلق کو اس کی اصل شکل کے ساتھ ہی پیش کیا گیا ہے پھر چاہے اس میں تربیت شامل ہے، مذہبی امور شامل ہیں یا ہمارا دیہی معاشرت اور ثقافت سے رشتہ شامل ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱: ثقلین سرفراز، " ثقافت و تہذیب کیا ہے " ، http//aikrozan.com، تاریخ ملاحظہ: ۲۶ جنوری ۲۰۲۰ء۔

۲: قاسم یعقوب، " ارض و سما کے دو پہیے اور مجید امجد " ، مشمولہ: بنیاد، ج ۱۲ (۲۰۲۱ء)، ص ۲۸۳۔

۳: " فطرت، ثقافت، تقسیم " ، http//ur.kyaaml.org، تاریخ ملاحظہ: ۲۵ جون ۲۰۲۱ء۔

۴: " ثقافتی ماحولیات، یہ کیا ہے، کیا اس کا مطالعہ ہوتا ہے اور تحقیق کے طریقے " ، http//Ur.nsp-ie.org/ecologia-cultural، تاریخ ملاحظہ: جون ۲۰۲۱ء۔

۵: کرس ہابر، "ثقافتی ماحولیات، ماحولیات اور انسانوں سے منسلک " ، http//ur.efferrit.com، تاریخ ملاحظہ: مئی ۲۰۲۱ء۔

۶: ناصر عباس نیر، " مقدمہ " مشمولہ: جدیدیت اور نو آبادیات (اوکسفرڈ: یونیورسٹی پریس، ۲۰۲۱ء)، ص ف۔

۷: نثار علی بھٹی، " ثقافت اور تہذیب کے مفاہیم کا معنوی و صوری جائزہ " ، http//humsub.com.pk، تاریخ ملاحظہ: ۲۸ اپریل ۲۰۲۱ء۔

۸: اسماعیل میرٹھی، کلیات اسماعیل، مرتب: اسلم سیفی (دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء) ، ص ۸۹۔

۹: ایضاً، ص ۹۰۔

۱۰: ایضاً، ص ۱۲۵۔

۱۱: ایضاً، ص ۱۲۵-۱۲۶۔

۱۲: " ماں اور بچے کے ابتدائی تعلق کے فوائد اگلی نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں " ، http//express.pk.story، تاریخ ملاحظہ: ۱۸ اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

۱۳: کلیات اسماعیل، ص ۱۲۶-۱۲۷۔

۱۴: "انسان نے کیسے اور کیوں بولنا سیکھا"، http//bbc.com/urdu/vert-cap، تاریخ ملاحظہ: ۲ جون ۲۰۱۹ء۔

۱۵: کلیات اسماعیل، ص ۱۲۷-۱۲۹۔

۱۶: ایضاً، ص ۶۴۔

۱۷: ایضاً، ص ۹۵۔

۱۸: ایضاً۔

۱۹: ایضاً، ص ۱۱۳-۱۱۴۔

۲۰: ایضاً، ص ۱۱۵-۱۱۶۔

۲۱: ایضاً، ص۱۰۶۔

۲۲: ایضاً، ص۱۰۶۔

۲۳: ایضاً، ص۱۰۶۔

۲۴: ایضاً، ص۲۰۲-۲۰۳۔

۲۵: ایضاً، ص۲۰۳۔

۲۶: ایضاً، ص۲۰۳-۲۰۴۔

۲۷: ایضاً، ص۲۳۹۔

۲۸: ایضاً، ص۲۳۹-۲۴۰۔

۲۹: ایضاً، ص۲۴۰-۲۴۱۔

۳۰: ایضاً، ص۲۴۲۔

۳۱: ایضاً، ص۲۴۱۔

۳۲: ایضاً، ص۲۴۲-۲۴۶۔ ان صفحات پر ان نظموں کی شعری مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۳۳: ایضاً، ص۲۸۵-۲۸۶۔

۳۴: ایضاً، ص۲۳۶-۲۳۷۔

۳۵: ایضاً، ص۲۰۰-۲۰۲۔

۳۶: " ثقافت اور معاشرتی اقدار و ثقافت اور تہذیب کا باہمی تعلق"، http//minhajbooks.com، تاریخ ملاحظہ: مئی ۲۰۲۱ء۔

۳۷: کلیات اسماعیل، ص۶۳۔

۳۸: ایضاً، ص۱۰۰-۱۰۱۔

۳۹: ایضاً، ص۱۰۱-۱۰۲۔

۴۰: ایضاً، ص۱۰۲۔

۴۱: ایضاً، ص۱۰۳۔

۴۲: ایضاً، ص۱۰۳-۱۰۴۔

۴۲: ایضاً، ص۱۰۴۔

۴۳: ناصر عباس نیر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری (لاہور: سنگ میل پبلی شرز، ۲۰۱۴ء)، ص۷۱۔

۴۴: ایضاً، ص۲۵۷-۲۵۸۔

۴۵: ایضاً، ص۱۳۲-۱۳۳۔

۴۶: ایضاً، ص۷۷۔

۴۷: اعزاز باقر(مترجم)، نوم چومسکی کے خطبات (ماحولیاتی بحران) (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۲۱ء)، ص۹۸۔

۴۸: کلیات اسماعیل ، ص۷۷-۷۸۔

۴۹: آیتہ اللہ جوادی، اسلام اور ماحولیات، مترجم: شیخ محمد حسنین(اسلام آباد: ثقافتی قونسلٹ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۱۷ء)، ص۴۹۔

۵۰: اورنگزیب نیازی، " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ" ، مشمولہ: تاریخ ادب اردو، ج۳، ش۱ (جنوری، مارچ ۲۰۲۱ء) ، ص۱۲۔

(باب پنجم)

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور عالم فطرت کے درمیان تعلق کا تجزیہ

اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان اور عالم فطرت کے درمیان تعلق کا تجزیہ

آج کے اس افرا تفری کے دور میں جہاں انسان کو جدید ٹیکنالوجی نے بے شمار آسائشوں اور فوائد سے نوازا ہے وہیں یہ جدید دور کا انسان ایک انجانے خوف میں مبتلا ہے۔ خود کو محفوظ رکھنے اور زندہ رہنے کی دوڑ کا خوف اسے دن بہ دن کھائے جا رہا ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں انسان ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گیا ہے اور اس بات کو سمجھنے سے قاصر دکھائی دیتا ہے کہ کرہ ارض میں کوئی بھی تنہا زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ کائنات کے تمام تر مظاہر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ انسان کی آپسی جڑت کا تعلق بھی صرف فرد سے نہیں بل کہ اس کے پورے گرد و پیش سے ہے۔ جس میں اس کے ارد گرد کا پورا ماحول شامل ہے۔ انسان کا یہ باہمی تعلق مختلف صورتیں لیے ہوئے ہے۔ جس میں انسان کا انسان سے تعلق، انسان کا حیوانی مخلوقات سے تعلق اور عالم فطرت سے تعلق سر فہرست ہیں۔ غرض دیگر بھی ایسی کئی صورتیں ہیں جن سے انسان ایک تعلق سے جڑا ہے۔ اس تعلق میں سے کوئی ایک بھی زنجیر کسی نقصان کا شکار ہو تو سب اس کی زد میں آتے ہیں۔ جہاں انسان کے حیوانی مخلوقات سے تعلق اور انسان و ثقافت کے تعلق کو پچھلے ابواب میں بیان کیا گیا ہے وہیں زیر نظر باب میں انسان کے عالم فطرت سے تعلق کو ماحولیاتی تنقید کی روشنی میں بیان کریں گے۔

فلسفہ ماحولیات سے تعلق رکھنے والے ماہرین و ناقدین نے اس تحریک / نظریے کے ذریعے جسے ماحولیاتی ادبی تنقید (Ecocriticism) کا نام دیا گیا ہے بشر مرکزیت کے فلسفے کو چوٹ کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف انسان ہی اس کائنات کا مرکز نہیں ہے بل کہ اس کے ساتھ دیگر مخلوقات بھی شامل ہیں۔ اس حوالے سے ماحولیات سے تعلق رکھنے والے آرنی نائس کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کی تمام تر صورتوں کا زندہ رہنا ان کا آفاقی حق ہے جس سے ہم انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ نظریہ اس بات کو مانتا ہے کہ اس فطری / قدرتی دنیا کی تمام مخلوقات ایک باہمی ڈور سے بندھی ہوئی ہیں۔ اسی ڈور کا آپسی انحصار اس کائناتی نظام کا توازن برقرار رکھے ہوئے ہے۔ انسان کی طرح دیگر مخلوقات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک کا نقصان گویا پوری انسانیت کا نقصان ہے۔ (۱) ماحولیات کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ انسان کی طرح دیگر تمام مخلوقات اور مظاہر فطرت سب برابر ہیں اور ان کا آپس میں رشتہ /ایک فطری تعلق ہے جس سے وہ جڑے ہیں۔ ولیم روئیکریٹ (William Rueckert ۱۹۲۶۔پ) اس حوالے سے ماحولیات کے ایک بنیادی اصول کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> فطرت ایک ایسا جال ہے جس میں کہیں الجھاؤ نہیں۔ یہ کچھ ضابطوں کا پابند ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرتی نظام تشکیل دیتا ہے جس میں انسانی تصرفات کے لیے فطری طور پر کچھ مواقع بھی موجود ہوتے ہیں اور کچھ رکاوٹیں بھی۔ (۲)

انسانی دنیا نے قدرتی نظام کی طرف سے دیے جانے والے تصرفات کے کچھ استعمال کی بجائے اس کا بے دھڑک اور بے جا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اپنی سہولت اور آسانی کے چکر میں دوسری دنیا کو غیر شعوری طور پر اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا تخمینہ لگانا بھی مشکل ہوتا چلا جارہا ہے۔ انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی وجہ سے ضروریات زندگی کی بڑھتی ہوئی مانگ نے دنیا کی ماحولیاتی شکل کو ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کسی بھی عمارت یا سڑک کی تعمیر کے لیے کوئی جنگل یا دلدل صاف کی جاتی ہے تو پودوں اور جانداروں کی پناہ گاہیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ذرا سی بھی معمولی تبدیلی ایک بڑے نقصان کی وجہ بن جاتی ہے جس سے ہم دور دور تک آشنا نہیں ہوتے۔ جیسے صاف پانی میں گندے پانی یا کھادوں کا شامل ہو جانا، ساحلوں، چٹانوں، ریت کے ٹیلوں پر انسانوں کی بے جا مداخلت اس قدرتی نظام کے بگاڑ کی وجہ بنتی ہے۔ (۳) ماحولیاتی تنقید ہمیں ایسے ہی خطرات سے آگاہی دلاتی ہے کہ انسانی دنیا کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس فطری دنیا کو جس قدر نقصان پہنچائے گا وہ دراصل اس کا اپنا نقصان ہے کیوں کہ انسانی زندگی کا یہ پورا نظام آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ کسی بھی ایک حصے کی تباہی اس پورے نظام کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسری جانب اس عالم فطرت کی نگہبانی اس کی دیکھ بھال ہماری اپنی ہی زندگیوں کی ضمانت پیش کرتی ہے۔

اس نظریے کی ذیل میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جو اس کائناتی نظام کو چلائے رکھنے کے حوالے سے ایک ترتیبی نظام پیش کرتی ہیں۔ انسان اگر اس پر غور کرے تو پتا چلتا ہے کہ صرف انسان ہی انسان کی بقا کا ضامن نہیں ہے بل کہ ایک پورا قدرتی / ماحولیاتی نظام موجود ہے جو انسانی زندگی کو چلائے رکھنے میں پس پردہ ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ جو بظاہر روزمرہ زندگی میں ایک قدرتی نظام کے طور پر موجود ہے جس پر اس طرح غور نہیں کیا جاتا جس طرح کیا جانا چاہیے۔ صبح کی آمد ایک انتہائی خوبصورت اور قدرتی عمل ہے جس سے انسان ایک ان دیکھی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔ سورج کے نکلتے ہی جہاں ہر سو اجالا پھیل جاتا ہے وہیں صبح ٹھنڈی ہوا اسے تر و تازہ اور ہشاش بشاش کرتی ہے اور انسان کو نئے دن کے آغاز کے لیے ایک بار پھر سے سرگرم کر دیتی ہے۔ قدرت کے یہ پر کیف نظارے انسانی دنیا سے کوئی

پردہ نہیں رکھتے۔ وہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ اس کائناتی نظام سے ہمیں جوڑ کر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک ان دیکھی ڈور سے بندھا یہ قدرتی اور انسانی نظام کیسے کام کرتا ہے ذیل میں اس کی ایک مثال " خدا کی صنعت " ملاحظہ ہو:

خدا کی صنعت

تاروں بھری رات کیا بنائی/دن کو بخشی عجب صفائی
موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں/ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں
کیا دودھ سی چاندنی ہے چھٹکی/حیران ہو کر نگاہ ٹھٹکی
تارے رہے صبح تک نہ وہ چاند/آگے سورج کے ہو گئے ماند
نیلا نیلا اب آسماں ہے/وہ رات کی انجمن کہاں ہے
شام آئی تو اس نے پردہ ڈالا/پھر صبح نے کر دیا اجالا
جاڑا، گرمی، بہار، برسات/ہر رت میں نیا سماں نئی بات (۴)

دن اور رات کا آنا جانا، سورج اور چاند کا اپنے اپنے وقت پر طلوع و غروب ہونا، موسموں کا اپنے اپنے اوقات میں رنگ بکھیرنا اس سارے کائناتی نظام کا ہی ایک حصہ ہے۔ انسانی دنیا اور اس کے ارد گرد کا پورا ماحولیاتی نظام ہر جغرافیے کے حوالے سے مختلف رنگ اور اثرات لیے ہوئے ہے۔ کسی ایک جگہ چاند اپنی چمک بکھیر رہا ہے تو دور کہیں اسی وقت میں سورج اپنی روشنی سے اس سرزمین کو منور کر رہا ہے۔ جب کہ ان کے اوقات کار ایک جیسے ہیں۔ آب و ہوا کے اعتبار سے بھی موسم ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں پر الگ الگ صورتوں میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ قدرت کی ان نعمتوں سے ایک ہی وقت میں انسان جانے کس کس شکل میں جڑ کر استفادہ حاصل کر رہا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شے کا ہونا دوسری کے ہونے کا پتا دیتا ہے۔ اندھیرا روشنی کا پیغام لے کر آتا ہے جو چاند اور سورج سے جڑا ہے۔ گرمی سردی کا پتا دیتی ہے۔ خزاں بہار کی خبر لاتی ہے۔ پھولوں کا کھلنا، پتوں کا مرجھا جانا، پرندوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوک، مینڈک کی ٹرٹراہٹ، پہناوں کا بدل جانا، کھانوں میں تبدیلیاں آنا، سونے جاگنے کے اوقات میں تبدیلیاں رونما ہونا، برف کا جمنا اور پگھلنا یہ سب کسی خاص وقت، خاص موسم کا بھی پتا دیتے ہیں تو کہیں ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر اپنا اپنا کردار ایک سا بھی نبھا رہے ہوتے ہیں۔ یہی قدرت کے کھیل ہیں۔ مزید مثالیں دیکھیے:

جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا/ہر شخص ہے دن میں دھوپ کھاتا
سردی سے ہیں ہاتھ پاؤں ٹھرتے/سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے

جاڑے کی جو رت پلٹ گئی ہے/دن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے
گرمی نے زمین کو تپایا/بھانے لگا ہر کسی کو سایہ (۵)

اسماعیل میرٹھی نے جہاں انسانی زندگی کو چلانے والی ہر بنیادی چیز کے تعلق کو الگ الگ بیان کیا ہے وہیں خدا کی صنعت میں ایک ماحولیاتی نظام کی ایک چین کو بھی بیان کیا ہے۔ کس طرح ایک چیز کے ہونے سے دوسری کی آمد کا پتا چلتا ہے۔ سورج کے آتے ہی اندھیرا، چاند اور تارے کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ جو آسمان سیاہی رنگ کا تھا اب نیلا ہو چکا ہے۔ پھر ایسے ہی دن کے اجالے پر جب شام کا وقت آتا ہے تو رات کے ہونے کا نقارہ بج جاتا ہے۔ یہی قدرت کا ایک نظام ہے جس کے تحت دن اور رات کا سلسلہ روز اول سے جاری ہے۔ اسی اعتبار سے انسانی زندگی کے کاموں کی ترتیب بھی چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح ہم مختلف موسموں سے بھی اسی اعتبار سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ پھل، سبزیاں ایک موسم میں ہیں تو دوسری میں نہیں ہیں۔ یہ ایک ماحولیاتی اثر ہے جس میں مختلف چیزیں ایک وقت میں اپنی بھرپور آب وتاب کے ساتھ میسر آتی ہیں جن سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سردی کا آنا ہمیں دھوپ سے ملواتا ہے۔ جب کہ گرمیوں میں ہم سائے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اسی طرح ہر موسم مختلف تہوار بھی ساتھ لاتا ہے۔ پھول، پھل، سبزیاں ان جیسی نعمتوں سے ہم فوائد حاصل کرتے ہیں۔

میوے سے لدی ہوئی ہے ڈالی/دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی
سبزے سے ہرا بھرا ہے میدان/اونچے اونچے درخت ذی شاں
گائے بھینسیں عجب بنائیں/کیا دودھ کی ندیاں بہائیں
پیدا کیے اونٹ بیل گھوڑے/ہر شے کے بنا دیے ہیں جوڑے (۶)

مناظر فطرت کی شکل میں ہمارے سامنے جتنی چیزیں موجود ہیں ہر ایک کا اپنے آپ میں ایک مکمل وجود ہے، جو اپنے فرض کی ادائیگی میں ہمہ وقت جٹا ہوا ہے۔ ہوا، پانی، روشنی ان سب کی بنیاد ہیں۔ مٹی سے زرخیزی، اس سے زمین فصلیں اگانے کے قابل ہوتی ہے۔ بارش ہے تو ان کی بڑھوتری ہے۔ پھول، پھل، سبزیاں، میوے غرض انسانی زندگی کی ضروریات کے اعتبار سے ایک مکمل نظام موجود ہے۔ جس کی ایک مختصر تصویر اس نظم کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ اس تعلق اور اس ماحولیاتی نظام سے انسانی تعلق کی جڑت کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ فطرت اور انسان کے درمیان باہمی رشتہ، ہم آہنگی اور ایک دوسرے پر دارومدار پایا جاتا ہے۔ جو فطرت سے بے وفائی کرتے ہوئے اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو فطرت اسے سزا دیتی ہے۔ فطرت ایک زندہ اور باشعور وجود ہے۔ راب نکسن اپنے

مضمون میں کن کیڈ کی ایک کتاب A small place کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے ایک جزیرے Antigua کے پانی سے محروم ہو جانے کی داستان بیان کی ہے۔ اس علاقے کو سیاحت کے حوالے سے بھی جانا جاتا تھا۔ کن کیڈ کا کہنا ہے کہ برطانوی نو آباد کاروں نے یہاں کے مقامی باشندوں کو قتل کر کے اپنے ساتھ لائے ہوئے غلاموں کو آباد کیا تھا اور اس دوران انھوں نے اس جنگلی جزیرے کو ایک صحرا میں بدل دیا۔ غلاموں کی رہائش اور گنے اور کپاس کے کھیتوں کے لیے زمین ہموار کی اور جنگلی درخت کاٹ دیے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا یہ جگہ کچھ ہی عرصے میں پانی جیسی نعمت سے محروم ہو گئی اور آج بھی یہاں پانی باہر سے لایا جاتا ہے۔ (۷) ماحولیاتی تنقید کے نظریے کا پرچار کرنے والے اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ مظاہر قدرت سے کھلواڑ یا کسی ایک شے کو بسانے کے لیے دوسری کا نقصان کسی تیسری صورت میں تباہی کی شکل اختیار کر جاتا ہے، کیوں کہ یہ پورا نظام ایک آپسی تعلق سے جڑا ہے۔ ایک کی تکلیف پورے نظام کی تکلیف ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی مثنوی" آبِ زُلال" پانی کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

مثنوی آبِ زُلال

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز/ذرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز
دکھاؤ کچھ طبیعت کی روانی/جو دانا ہو تو سمجھو کیا ہے پانی
یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے/گرہ کھل جائے تو فورا ہوا ہے
نظر ڈھونڈے مگر کچھ بھی نہ پائے/زبان چکھے مزہ ہر گز نہ آئے
ہواؤں میں لگایا خوب پھندا/انوکھا ہے تیری قدرت کا دھندا
نہیں مشکل اگر تیری رضا ہو/ہوا پانی ہو اور پانی ہوا ہو
مزاج اس کو دیا ہے نرم کیسا/جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا
نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت/طبیعت میں رسائی ہے نہایت
نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ/ہر اک سانچہ میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ (۸)

جس طرح پانی جیسی نعمت کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے شاعر نے ایک مرحلہ وار ترتیب بیان کی ہے یہ کسی ماحول دوست کا ہی خاصا لگتا ہے۔ قدرتی نظام سے باریک بینی سے واقف ہونا ہی اس کی پرتیں کھولنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ پانی کی شکل، اس کا ذائقہ، اس کے بننے کا عمل، اس سے بننے والی ہوا جو دیگر ماحولیاتی نظام کو چلانے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس ایک عنصر کو جس طرح اس کی اصل اور جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے وہ انھی کا ہی

کارنامہ ہے۔ ان کی یہ نظم اس کے مکمل وجود کو اس کی خصوصیات سمیت بیان کرتی ہے۔ چند مزید شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

جو ہلکا ہو اسے سر پر اٹھائے/جو بھاری ہو اسے غوطا کھلائے
نہ جلتا ہے نہ گلتا ہے نہ سڑتا/نرا پانی نہیں ہر گز بگڑتا
کسی عنوان سے ہو گا نہ نابود/وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ
لگے گرمی تو اڑ جائے ہوا پر/پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھر (۹)

پانی جسے زندگی کا دوسرا نام دے دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس کی بدولت انسانی زندگی کا پہیہ رواں دواں ہے۔ چاہے وہ انسان ہوں، حیوان ہوں، چرند پرند یا دیگر ایسی چیزیں جو زندگی کا وجود رکھتی ہیں اس بنیادی ضرورت کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی ہیں۔ پھر چاہے یہ کسی بھی شکل میں ہو۔ اس کا ہونا ہی زندگی کے وجود کا زندہ رہنا اور اس کی بقا سے مشروط ہے۔ یہ بظاہر بے رنگ اور بے ذائقہ نظر آنے والی شے اپنی مختلف صورتوں میں اس پورے کرہ ارض کو سیراب کیے ہوئے ہے۔ انسان مزید شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے/کبھی اوپر سے بادل بن کر برسے
ہوا پر چڑھ کے پہونچے سیکڑوں کوس/کبھی اولا کبھی پالا کبھی اوس
کہر ہے بھاپ ہے پانی ہے یا برف/کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف
اسی کے دم سے دنیا میں تری ہے/اسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے (۱۰)

زمین و آسماں پر موجود ہر شے چاہے وہ کسی بھی شکل میں موجود ہے اسی کے دم سے پھل پھول رہی ہے۔ اسی کی بدولت ہی ہر شے کے وجود میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ یہ ایک عنصر اپنی شکلیں بدلتے ہوئے کہاں سے کہاں تک کا سفر طے کر لیتا ہے اس کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ ہوا میں مل کر غائب ہو جانا، بادل کی شکل میں برس پڑنا، ہر شے میں اس کی موجودگی کو دیکھا جا سکتا ہے پھر چاہے پھول، پھل، کھیتیاں، ندی نالے ہوں، پہاڑ ہوں، پتھریلے علاقے یا پھر صحرا میں کسی زندگی کا وجود۔ انسانی و حیوانی زندگی اور اس کے ارد گرد کے ماحول کا ہونا اسی سے مشروط ہے:

پھلوں میں پھول میں ہر پنکھڑی میں/ہر اک ٹہنی میں ہر جڑی بوٹی میں
ہر اک ریشہ میں ہے اس کی رسائی/غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی

پھلوں کا ہے اسی سے تازہ چہرہ/اسی کے سر پے ہے پھولوں کا سہرہ
اسی کو پی کے جیتے ہیں سب انسان/اسی سے تازہ دم ہیں سارے حیوان
عمارت کا بسایا اس نے کھیڑا/تجارت کا کیا ہے پار پار بیڑا
زراعت اس کی موروثی اسامی/صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی
کہیں ساگر کہیں کھاڑی کہیں جھیل/کہیں جمنا کہیں گنگا کہیں نیل (۱۱)

اس ایک قدرتی نعمت کی ہزاروں شکلیں اور کردار ہیں۔ کس طرح قدرت کا یہ شاہکار مکمل صورتوں میں ڈھل کر کئی نعمتوں اور ضروریات زندگی کو چلانے کا باعث بنتا ہے۔ اس حوالے سے سیفی پریمی لکھتے ہیں اس مثنوی میں اسماعیل میرٹھی کی فکر ان کا مشاہدہ ایک سائنسی نقطہ نظر کو سامنے لاتا ہے اور ان سب کے آپس میں مل جانے جو فن سامنے آیا ہے وہ انوکھا روپ لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اپنی اس نظم میں پانی کی دس شکلوں کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ (۱۲) جس کی مثالیں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ذیل میں اس کے وجود کی ایک اور داستان ملاحظہ ہو کہ جب اس دنیا پر صرف اور صرف پانی کا ڈیرہ تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب انسان اس قدرتی/ فطری شاہکار کو جانتا تو تھا مگر اس کے مختلف کرداروں سے ناواقف تھا اور اسے محفوظ کرنے کے طریقوں سے ناآشنا تھا تبھی تو یہ اپنی ایسی شکلیں بدلتا رہتا:

یہی پہلے زمیں پر موجزن تھا/نہ میدان تھا نہ پربت تھا نہ بن تھا
زمین سب غرق تھی پانی کے اندر/جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر
نہ افریقہ نہ امریکہ نہ یورپ/رہی تھی ایشیا او شنیا چھپ
ہمالہ نے بھی تھی ڈبکی لگائی/نہ دیتی تھی کہیں چوٹی دکھائی (۱۳)

اسے پانی کی آزادی کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اوپر بیان کردہ آخری مصرعے قابل توجہ ہیں کہ پانی کی سطح ابتدائی دور میں کتنی ہوا کرتی تھی۔ ہر سو سمندر دکھائی دیتا تھا۔ نہ کوئی بستی اور نہ ہی کوئی خشکی کا چھوٹا سا حصہ۔ ہمالہ جیسی بلند و بالا چوٹی میں اس میں چھپی ہوئی تھی۔ پھر اس کہانی کا ذکر آتا ہے کہ جب انسان اپنے اس فطری/ قدرتی نظام سے آہستہ آہستہ واقفیت حاصل کرنے لگا۔ جاننے لگا کہ کیا چیز کس کام آتی ہے اور اسے کس کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی حکمرانی کے دور کا آغاز تھا۔ یہ اپنی آسائشوں اور سہولیات کے لیے اس قدرتی/ فطری نظام کو زیر کرنے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ جہاں اس نعمت کی وجہ سے جل تھل تھا وہیں زمیں گویا پلٹ گئی ہو اور انسانی زندگی نے اسے چوس لیا ہو۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

مگر دنیا میں یکسانی کہاں ہے/جو اب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے
یہاں ہر چیز ہے کروٹ بدلتی/ہر ایک حالت ہے چڑھتی اور ڈھلتی
کوئی شے ہو ہوا ہو یا ہو پانی/سبھی کو ہے بڑھاپا اور جوانی
رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا/اسے خشکی نے پستی میں دھکیلا
زمین آہستہ آہستہ گئی چوس/چھپائے مال کو جس طرح کنجوس
تری کا جب کہ دامن ہو گیا چاک/تو خشکی نے اڑائی جا بجا خاک (۱۴)

خلا سے کھڑے ہو کر یا خلائی جہازوں سے موصول ہونے والی کرہ ارض کی تصاویر کو دیکھا جائے تو ابتدائی شکل اور آج کا نظارہ زمین آسمان کے فرق کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جہاں ایک وقت میں اس دھرتی کے نیلے رنگ کو دور سے دیکھا جا سکتا تھا آج آنکھ کو باریک کر کے اسے بڑی مشکل سے تلاش کر کے دیکھا جاتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے اپنی اس بنیادی نعمت کے بے جا استعمال اور غیر ضروری چیزوں کی پیداوار میں اضافے کر کے اس کی قدرتی سطح کو انتہائی کم کر دیا ہے۔ یہاں اس وقت کو دہرایا نہیں جا سکتا جو برف سے پانی کے پگھلنے تک کے ادوار پر مشتمل ہے۔ آج کے اس جدید ترقی یافتہ دور میں بظاہر نظر نہ آنے والی اس نعمت سے انسان شاید اس وقت واقف ہو کہ جب اسے اس نعمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس حوالے سے محمد اسحاق یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ:

> انسانی فطرت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم گنگا کنارے بستے ہو اسی لیے تمھارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے۔ (۱۵)

پچھلے صفحات میں جس جزیرے کا ذکر کیا گیا ہے وہ انسانی ہاتھوں سے ہونے والی قدرتی نقصان کی نشان دہی کرتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام میں جہاں حکمرانی کرنے والوں نے انسانی نظام کو اپنے زیر کیا وہیں قدرتی نظام کو بھی اپنے مطابق ڈھالنے کی کوششوں میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ بند باندھ کر، کھیتوں میں اپنی مرضی کے اناج اور جڑی بوٹیاں اگا کر اسے بنجر کرنا، دیہی علاقوں میں صنعتوں کی تعمیر کے لیے درختوں کا کٹاؤ وغیرہ ایسی مثالیں ہیں جنھیں قدرت سے کھلواڑ کرنا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں حکومت کرنے والا طبقہ کمزور طبقے کی املاک کے ساتھ ساتھ اپنے ماحولیاتی نظام پر بھی حکمرانی کرتا آیا ہے۔ اسی حوالے سے آیتہ اللہ جوادی اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> استعمار گروں کا ایک مہم ترین حربہ وہ اقتصادی پابندیاں ہیں جن کے ذریعے وہ مختلف معاشروں کی ریڈھ کی ہڈیوں کے مہروں کو توڑ ڈالتے اور کئی اقوام پر تسلط حاصل کرتے ہیں۔ لہذا اگر یہ طاقتیں کسی علاقے کی آبادکاری کے درپے ہوں بھی تو زیادہ تر اپنا مفاد اٹھانے اور دوسری قوموں کو محروم کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ یعنی وہ زمین کی آبادکاری سے فقط اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں کیوں کہ وہ اولاً زمین کا ایک حصہ اپنے منافع کے حصول کے لیے آباد کرتے ہیں اور ثانیاً دیگر حصوں کو تنہا آباد نہیں کرتے بل کہ ممکن ہو تو اس کی آبادکاری میں موانع کھڑے کرتے ہیں اور ثالثاً اس علاقے کے لوگوں کو اپنا غلام بنا کر ان کے مفادات کو لوٹتے ہیں۔ (۱۶)

یہی وجہ کہ بہت سے علاقے بنجر ہو کر کئی قدرتی نعمتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہاں نوآبادیاتی نظام کے تحت برطانوی حکومت کی ان چالاکیوں کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا ہے کہ جن کے ذریعے انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے زراعت کے شعبے سے تعلق رکھنے والے زمینداروں اور ساہوکاروں کو لالچ دے کر انھیں اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ ذیل میں پانی کے ہی ایک اور روپ کی مثال دوسری نظم میں ملاحظہ ہو:

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی/پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ/ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا/میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس/اپنا ہی کروں گا ستیاناس
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت/پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری/میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم/سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی/کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی (۱۷)

جب خدا کا بنایا قدرتی نظام کہیں پر اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر دکھائی دیتا ہے تو اس سے جڑے دیگر قدرتی /ماحولیاتی عناصر ان کی مدد میں پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ اس نظام کا چلنا بھی ان کی آپسی جڑت اور باہمی اتفاق سے کام کرنے سے مشروط ہے۔ بظاہر نظر آنے والا ایک کردار پس منظر میں دیگر کئی نظاموں اور عناصر سے جڑا ہوتا ہے اور اس ایک کا کردار ادا کرنا گویا پورے نظام کی محنت اور ہم آہنگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور/ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت/بھڑکی اس کی رگ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ!/میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان/ڈالو مردہ زمین میں جان
بارش لگی ہونے موسلا دھار/انی پانی ہوا بیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت/اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت (۱۸)

اگرچہ اس نظم کا شمار اخلاقی نظموں میں کیا جاتا ہے اور اس کے آخر میں باہمی یک جہتی کا ایک پیغام چھپا ہے، لیکن اس نظم کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہ بارش کے قطرے کس طرح ایک بنجر زمین میں جان ڈال کر کھیتوں کو ہرا ابھرا کرتے ہیں اس کی بھی ایک تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ " تھی قحط سے پائمال خلقت " اگرچہ ایک مصرع ہے لیکن اسی قحط سے جہاں انسان اناج سے محروم ہو جاتا ہے، مال مویشی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، رہن سہن کے طور طریقے بدل جاتے ہیں غرض یہ کہ انسانی زندگی کا ایک پورا چکر متاثر ہوتا ہے وہیں صرف بارش کے ہو جانے سے کس طرح ایک پورا نظام چل پڑتا ہے۔ گویا زندگی اپنی آب وتاب کے ساتھ چمک اٹھتی ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی پانی کی ایک اور مثال نظم " برسات " کی شکل میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے:

برسات

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا/ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی/تو بے جان مٹی میں جان آگئی
زمیں سبزے سے لہلہانے لگی/کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل/عجب بیل پتے عجب پھول پھل
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا/کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا/وہاں آج ہے گھاس کا بن پڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور/نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر (۱۹)

برسات کا موسم بھی مختلف تبدیلیاں لے کر آتا ہے۔ ہر طرف چھائی خاموشی اور سناٹا یک دم بدل جاتا ہے۔ سوکھی دھرتی اور پھیکی کھیتی سر سبز و تروتازہ ہو جاتی ہے۔ نئے پیڑ پودے، پھل پھول اپنے رنگ بکھیرتے ہیں۔ جہاں زندگی بے جان سی

معلوم ہوتی تھی اور بہت سے جانور اور چرند پرند بلوں اور گھونسلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ برسات کی آمد کے بعد ہر جگہ چہل پہل دیکھنے کو مل رہی ہے۔ کسانوں نے دن رات محنت کر کے جو بیج بوئے تھے اس برسات سے ان کی کونپلیں پھوٹیں گی۔ یہ سب تبدیلیاں صرف ایک برسات کی آمد کے ساتھ ہی جڑی تھیں اور اس کے آنے سے جیسے انسان، حیوان، چرند پرند سب کی دنیا ہی بدل گئی ہو۔ یہی تصویر جہاں برسات کی شکل میں ہے وہیں اسے اگر" ساون کی جھڑی" میں دیکھا جائے تو منظر کچھ یوں دکھائی دیتا ہے:

ساون کی جھڑی

گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ/بجایا رعد نے نقار خانہ
گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے/برس آخر تو ساون کی جھڑی ہے
بھنبیری اڑ کہ ساون آ گیا اب/ گھٹا امڈی ہے ساون چھا گیا اب
کہو کوئل سے امرویوں میں بولے/پھدک ٹہنی پہ تو بھی او مولے
کٹورا سا ہوا تالاب لبریز/کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز
زباں اپنی بھگولے او ٹیری/بجادے تو بھی او جھینگر نفیری(۲۰)

یہ پانی کی ہی مختلف صورتیں ہیں جو موسموں کی تبدیلیوں کے باعث مختلف ناموں سے جانی جاتی ہیں۔ کبھی انھیں برسات تو کبھی ساون کہا جاتا ہے۔ ان کی آمد پر ہر طرف ہریالی، چہل پہل اور نئی زندگیوں کا پیغام لاتی ہے۔ کوئل سر بکھیرتی ہے۔ مولے خوشی سے اچھلتے ہیں۔ تتلیاں پھولوں کی سیر کو نکلتی ہیں۔ مینڈک جو زمین سے باہر سر نکالتے ہیں تو ٹرٹراہٹ سے ماحول گونج اٹھتا ہے۔ سوکھے تالاب پانی سے بھر جاتے ہیں۔ غرض ہر طرف زندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ذیل میں اسماعیل میرٹھی کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو جس میں ایک اور قدرتی شاہکار کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جہاں اوپر بیان کردہ مثالوں میں پانی کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں، اس کی انسانی زندگی میں اہمیت اور انسان کا اس نعمت پر انحصار دکھایا گیا ہے وہیں ہوا بھی ان ماحولیاتی عناصر میں سے ایک ایسا عنصر ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔" مثنوی بادِ مراد" میں شاعر ہوا سے مخاطب ہے اور اس کے کام و کردار پر روشنی ڈالتا ہے:

مثنوی باد مراد

چل اے باد بہاری سمت گلزار/تمنائی ہے تیرا ہر گل و خار
نہال و نخل و سبزہ سب ہیں سنسان/گیاہ مردہ میں تو ڈال دے جان

نہیں گلشن میں پتے کا بھی کھڑکا/ذرا شاخیں ہلا۔ طائر کو بھڑکا
لہک تیزی سے اے باد بہاری/کہ ہو جائے چمن پر وجد طاری
جو تو لہکے تو سبزہ لہلہائے/چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے
لچک جائے کمر نازک شجر کی/زمیں پہ جھک پڑے ڈالی ثمر کی
ٹپک جائے جو ہو پکا ہوا پھل/کہ شاخیں ہو رہی ہیں سخت بوجھل
ذرا کر دامن صحرا میں راحت/بہت کی تو نے دریا کی سیاحت
اٹھایا ہے سمندر تو نے سر پر/ گھٹا کو لاد کر لائی کمر پر (۲۱)

ہوا کی خاموشی سے ہر طرف سکوت چھایا ہے۔ چرند پرند سب خاموش ہیں۔ گل و گلزار لہکنا، مہکنا بھول چکے ہیں۔ ہرے بھرے کھیت اداس منظر پیش کر رہے ہیں۔ اس کے چلنے کی دیر ہے کہ ہر طرف کا منظر بدل جائے گا۔ اے باد بہاری چل کہ پرندے چہکنے لگیں۔ سبزہ لہلہانے لگے۔ پیڑ پودے، پھول پھل اپنا آپ دکھانے لگیں۔ درختوں کی شاخیں جو پھلوں سے لدی، زمیں کو چھو رہی ہیں اپنے بوجھ سے کچھ آزاد ہوں گی۔ سمندروں، دریاؤں اور صحراؤں کی سیر کرتی ہوا کہیں سے بادلوں کو لائی ہے تو کہیں بارش برسانے کا سبب بنی ہے۔ ہوا کا ہونا انسانی زندگی میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک سانس ہے تب تک زندگی کی نوید اور سانس کا آنا جانا اسی ہوا سے مشروط ہے۔ پودے، کھیت، درخت، پرندے، جانور، سبزہ غرض ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ انسان تو انسان اس قدرتی/ فطری ماحول کی ہر شے اسی کی وجہ سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے جس میں سے کچھ کا ذکر اوپر شعری مثالوں میں کیا گیا ہے۔ نوتک بلوچ اس کی اہمیت سے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بولنے، سانس لینے، سننے سے لے کر پودوں کا بڑھنا، پھلوں پھولوں کا پکنا، درختوں کا سرسبز رہنا اور ہمارے لیے آکسیجن فراہم کرنا غرض ہماری ضرورت کی ہر شے ہوا کی محتاج ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا نظام رک سکتا ہے۔ یہی ہوا مختلف درجہ حرارت بدل کر ہمیں چار موسموں سے لطف اندوز کرواتی ہے۔ یہی ہوا ہمیں بارشوں کی فراہمی میں مدد دیتی ہے جو سمندروں کا پانی بھاپ کی صورت اڑا لے جا کر بادل بناتی ہے۔ اس ماحول اور فضا کی وجہ سے ہم کبھی پانی زمینی سطح تک نہیں لا سکتے۔ یہی ہمارے ماحولیاتی نظام کی خوبی ہے کہ ایک چیز دوسری سے کس طرح جڑی ہے۔ اپنے ہونے اور اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے دوسری کی محتاج ہے۔ (۲۲) اسی طرح ہوا کے کچھ مزید رنگ " ہوا چلی" میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔ صبح ہونے کو آئی تو ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ہوا کے چلنے سے کھیت لہلہانے لگے، پیڑ پودے، ڈالیاں اور پتے ہوا کے چلنے سے جھومنے لگے ہیں پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلاتی ہے یہ ہوا تو کبھی سوئے ہوئے سبزے کو جگانے کا سامان پیدا کرتی ہے۔ ہوا نہ چلے تو باغوں میں پھول نہیں کھل سکتے، درخت تروتازہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی باغ کی سیر کا مزہ لیا جا سکے۔ جہاں کہیں یہ

تھم جائے اور اس کا ہماری زندگی سے وجود مٹا دیا جائے تو چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی چڑیوں کو چلنے پھرنے اور اڑنے کی طاقت مل سکے۔ گویا زندگی کا نظام رک جائے۔ (۲۳) انسانی زندگیوں میں اس کا کردار سانس کا سا ہے۔ یہی تو آکسیجن کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ تو سانس کے بغیر کبھی کوئی جی پایا ہے۔ ایسے ہی ہوا کے بغیر ہمارا وجود نہیں رہ سکتا۔

جہاں انسان اور دیگر ماحولیاتی اشیا ایک دوسرے کی محتاج ہیں وہیں یہ فطری نظام بھی ایک دوسرے سے جڑا ہے اور اپنے زندہ رہنے کے لیے اور اپنی اہمیت منوانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے ہوا اور سورج کے درمیان کا ایک مناقشہ بیان کیا ہے۔ جس میں ان کی گفتگو سے ایک تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو دوسرے پر بھاری سمجھتے ہیں اور اپنی اپنی خصوصیات بیان کرتے ہیں اور دوسرا ان کی کارکردگی بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔ دونوں عناصر آپئے زور آزمائی کیجیے سے شروع ہوتے ہیں اور اپنا بڑا پن بیان کرنے کے لیے انسانی زندگی سے لے کر پورے ماحولیاتی نظام کی چیزوں سے ثابت کرنے میں جٹ جاتے ہیں۔ ہوا کبھی اپنی دہشت دکھاتی ہے۔ آندھی طوفاں بن کر چھاتی ہے۔

مناقشہ ہوا و آفتاب

پھر تو آندھی بن کر چل نکلی ہوا/ایسی بپھری کر دیا طوفان بپا
اونچے اونچے پیڑ تھرانے لگے/جھوک سے جھوکوں کی چرانے لگے
نونہالوں کی کمر بل کھا گئی/پھول پتوں پر قیامت آ گئی
کانپ اٹھے اس دشت کے کل وحش و طیر/مانگتے تھے اپنے اپنے دم کی خیر
ہو گیا دامان صحرا گرد برد/گھر گیا آفت میں وہ صحرا نورد (۲۴)

گویا ایک جھکڑ نما آندھی ارد گرد کی ہر چیز کو تہس نہس کرتی ہے اور ایک مسافر کو بھی جھٹکے دینے سے باز نہیں آتی کہ وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے لیکن وہ مسافر بھی ہار نہیں مانتا اور اپنا لبادہ سمیٹے چلتا رہتا ہے۔ جب آفتاب یہ سب دیکھتا ہے تو وہ اپنا آپ ثابت کرنے کو سامنے آتا ہے۔ جوں ہی ہوا اپنی دہشت کو سمیٹتی ہے تو سورج اپنا منہ نکالتا ہے اور آہستہ آہستہ ہر چیز پر اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے۔ جہاں یہ مکالمہ ان کے کرداروں کو واضح کر رہا ہے دوسری جانب ماحولیاتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور دیگر قدرتی عناصر کے بگاڑ یا ان پر ہونے والے اثرات کو بھی بیان کر رہا ہے :

اب تھما جھکڑ تو نکلا آفتاب/روئے نورانی سے سرکائی نقاب
وہ ہوا کی سی نہ تھی دھوم دھام/کر رہا تھا چپکے چپکے اپنا کام
دھیمی دھیمی کرنیں چمکانے لگا/رفتہ رفتہ سب کو گرمانے لگا

اس مسافر کو پسینا آگیا/کھول ڈالے بند جی گھبرا گیا
اور آگے کو بڑھا تو دھوپ سے/تن بدن میں کچھ پتنگے سے لگے
اب لبادہ کو لیا کاندھے پہ ڈال/بدلی یوں نوبت بہ نوبت چال ڈھال
جب چڑھا خورشید سمت الراس پر/بیٹھ کر سایہ میں پھر تو گھاس پر
دور پھینکا اس لبادہ کو اتار/واہ رے سورج، لیا میدان مار(۲۵)

یہی آپسی رسہ کشی یا کسی بھی ایک ماحولیاتی عنصر کا قدرتی بگاڑ پورے ماحولیاتی نظام کے بگاڑ کا بھی موجب بنتا ہے۔ جس کی ایک مثال عبدالرؤف نوشہری بیان کرتے ہیں کہ جہاں انسان ماحول کو اپنے ہاتھوں نقصان پہنچا رہا ہے وہیں قدرت خود بھی ہوا کو تھوڑا بہت آلودہ کرتی رہتی ہے جیسے آتش فشاں مادے نباتات وغیرہ کے گلنے سڑنے اور جنگل کی آگ سے ہوا میں سلفر ڈائی آکسائیڈ، ہیڈروجن سلفائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ شامل ہو کر اسے آلودہ کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی قدرتی نظام کے ذریعے ہی انھیں ٹھیک کرنے کا نظام بھی فطرت خود ہی کر لیا کرتی ہے۔(۲۶) یعنی یہ قدرتی مظاہر ایک دوسرے کے فائدے اور نقصان سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ سورج کے بھی کئی نام اور رنگ ہیں۔ جب طلوع ہوتا ہے تو زندگی کی نوید لے کر آتا ہے۔ انسانی نظام چلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب مغرب کی جانب آہستہ آہستہ غروب ہونے کے لیے بڑھتا ہے تو الگ ہی سماں باندھتا ہے جس کا ذکر اس نظم "شفق" میں بیان کیا گیا ہے:

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار/ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار
ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ/جنھیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
نیا رنگ ہے اور نیا روپ ہے/ہر اک روپ میں یہ وہی دھوپ ہے
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ/سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی/بنفشی و نارنجی و چنپئی(۲۷)

سورج کی مشرق سے آنکھ کھلتے ہی زندگی گویا اپنے رنگ بکھیرنے لگتی ہے۔ صبح سے لے کر شام تک اس کے بدلتے رنگ وقت کے گزرنے، دن کے چڑھنے اور ڈھلنے کا بھی پتا دیتے ہیں۔ اگر یہی سورج اپنے وقت پر نکلنا چھوڑ دے تو پورا کائناتی نظام یکسر بدل جائے گا اور اپنا کردار ادا کرنا بھول بیٹھے گا۔ اس کی ایک مثال صرف اس کا غروب ہونا ہی دیکھ لیا جائے تو کافی ہے کیوں کہ نظام زندگی آہستہ ہوتا سو جاتا ہے زندگی کا متحرک نظام رک جاتا ہے۔ جیسے اس کی حرکت میں وقفہ آ جائے۔ رات کے آنے کے آثار کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ مغربی حصہ کس طرح مختلف رنگوں سے سج جاتا ہے۔ بادلوں پہ کبھی سرخی چھا جاتی ہے تو کبھی پانی میں اس کی چمک آگ کا سا منظر پیش کرتی ہے۔ آسمان میں خوبصورت رنگوں کا بکھر جانا

سورج کی کرنوں کی کرامات ہیں۔ قدرت کا نظام ایسے بنا ہے کہ جب تک سورج غروب نہیں ہوتا رات نہیں آسکتی اور جب تک وہ طلوع نہیں ہوتا صبح کی آمد کا پیغام کوئی نہیں لا سکتا۔ شفق کے غروب ہونے کے بعد کا منظر اس نظم " رات " کی صورت میں ملاحظہ ہو:

رات

گیا دن ہوئی شام آئی ہے رات/خدا نے عجب شے بنائی ہے رات
نہ ہو رات تو دن کی پہچان کیا/اٹھائے مزہ دن کا انسان کیا
ہوئی رات خلقت چھٹی کام سے/خموشی سی چھائی سر شام سے
لگے ہونے اب ہاٹ بازار بند/زمانے کے سب کار بہوار بند
مسافر نے دن بھر کیا ہے سفر/سر شام منزل پہ کھولی کمر
درختوں کے پتے بھی چپ ہوگئے/ہوا تھم گئی پیڑ بھی سوگئے (۲۸)

جس طرح صبح سویرے ایک سورج کی آمد سے پورے ماحول کا نقشہ بدل جاتا ہے اور زندگی گویا اپنی آنکھیں کھول لیتی ہے ۔ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے اپنے اپنے کاموں میں جٹ جاتے ہیں۔ چرند، پرند، پیڑ پودے، انسان حیوان غرض پورا ماحولیاتی نظام ہی حرکت میں آجاتا ہے۔ پھر جوں جوں سورج مغرب کی جانب آہستہ آہستہ سفر طے کرنے لگتا ہے وہیں رات کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور زندگی اپنی آنکھیں موندنے کا سامان پیدا کرنے لگتی ہے۔ صبح سے اب تک جو زندگی رواں دواں تھی اب اس میں بھی کمی واقع ہونے لگی ہے :

اندھیرا اجالے پہ غالب ہوا/ہر اک شخص راحت کا طالب ہوا
ہوئے روشن آبادیوں میں چراغ/ہوا سب کو محنت سے حاصل فراغ
کسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر/کہ گھر میں کرے چین سے شب بسر
غریب آدمی جو کہ مزدور ہیں/مشقت سے جن کے بدن چور ہیں
وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے/وہ ماندے تھکے اور ہارے ہوئے
نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر/ہوئے بال بچے بھی خوش دیکھ کر
گئے بھول سب کام دھندے کا غم/سویرے کو اٹھیں گے اب تازہ دم (۲۹)

رات کا انسانی زندگی میں اس کے روزمرہ کے کاموں میں ایک اہم کردار ہے۔ سکوں کے چند لمحات اسی وقت ہی میسر آتے ہیں۔ تھک ہار کر انسان اپنے کاموں سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور ہر ذی روح چاہے وہ انسان ہیں، چرند پرند یا پھر پیڑ پودے سبھی اس کی آمد پر سکھ کا سانس لیتے ہیں اور نیند کا مزہ چکھتے ہیں۔ رات کی آمد پر کس طرح ایک پورا ماحولیاتی نظام تھم سا جاتا ہے اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ نظم دائرہ فطرت سے نکل کر سماج سے رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ ایسی شاعری کو صرف نیچرل شاعری کہہ پانا مشکل ہے اسے فطرت سے جوڑا جائے یا نظام حقیقت سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ علی احمد فاطمی اسماعیل میرٹھی کی ایسی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں :

> فطرت سے انسان کا لگاؤ فطری ہے۔ شاعری کے یہاں یہ فطرت مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ کثیر سرمایہ ہے مگر بغور ملاحظہ کیجیے تو کسی نے محض تصویر کشی کر دی۔ کسی نے نیچرل انداز میں سچی کیفیت پیدا کر دی تو کسی نے فطرت اور فلسفے کو ہم آہنگ کر کے اس کا رشتہ حیات و کائنات سے جوڑ دیا۔ اسماعیل میرٹھی نے فطرت، موسم، شاعر، رات، شفق، افق غرض کہ سبھی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا انداز و اسلوب دیگر شاعروں سے مختلف و منفرد ہے۔(۳۰)

فطرت انسانی زندگیوں میں مختلف کردار ادا کرتی آئی ہے۔ اس ماحولیاتی نظام کا ایک ایک عنصر انسانی زندگی میں بیک وقت کئی کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس قدرتی نظام کا انسانی زندگی سے تعلق کسی بھی قیمت پر نہ ہی خراب ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے کسی بھی حوالے سے ٹوٹنا چاہیے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کا پرچار کرنے والے اسی آپسی تعلق کی یاد دہانی اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں پیش پیش ہیں۔ جہاں اوپر بیان کردہ نظم میں رات کی آمد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہیں ایک اور نظم "تاروں بھری رات" ایک ایسے انمول رشتے کی طرف نشان دہی کراتی ہے کہ جس سے انسان کا تعلق پتھر کے دور سے لے آج تک کے قائم ہونے والے جدید ترقی یافتہ دور تک قائم و دائم ہے۔ کس طرح یہ ننھے ننھے تارے ایک سائنسی نظام سے جڑ کر انسانی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

تاروں بھری رات

جوں ہی آفتاب تاباں/نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم/یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں/بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی/نہ میسر آتی ان کو

تو غریب جنگلوں میں/یونہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی/نہ طرف کی ہوتی اٹکل (۳۱)

پرانے زمانے میں جب انسان نے اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ سائنسی دنیا بھی ابھی اپنے شاہکار بنانے میں اتنی تیز نہیں ہوئی تھی۔ گھڑیاں، قطب نما، دوربین، کیلنڈر وغیرہ جیسی چیزوں کا وجود نہیں تھا۔ اس وقت کے لوگ ستاروں کے ذریعے وقت کا تعین، سمتوں اور موسموں کی تبدیلیوں کا پتا، راستوں کی نشان دہی کے لیے ستاروں کا سہارا لیا کرتے تھے۔ رات کو چاند اور ستارے اور دن کو سورج اپنی جگہ سے سرکتے ہیں اور وقت کا پتا دیتے ہیں۔ کوئی عام انسان کس طرح یہ جان سکتا ہے کہ اس کے ارد گرد پھیلی اس وسیع و عریض کائنات میں زمین سے نظر آنے والے یہ چھوٹے چھوٹے ستارے کس طرح ان کی زندگیوں میں ایک ترتیب اور توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نہ نشان راہ پاتے/وہ غریب کھیت والے
وہ امیدوار دہقاں/کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی
کہیں کھیت کٹ رہا ہے/کہیں گہہ رہا ہے خرمن
نہیں آنکھ ان کی جھپکی/یونہی شام سے سحر تک
ہیں تمام رات جاگے/نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ
نہ شمار وقت و ساعت/مگر اے چمکنے والو
ہو تمہیں انھیں سجھاتے/کہ گئی ہے رات اتنی (۳۲)

یہ کائناتی نظام اور اس کی اشیا، مظاہر قدرت کی شکل میں ان گنت روپ لیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک شاہکار کا ہی انسانی زندگی میں کام اور کردار اس کی اہمیت بیان کرنے کو کافی ہے۔ عابد ندوی لکھتے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی بقاء اور اس کی منفعت کے پیش نظر چاند سورج دو اہم سیارے ہیں جن کی گردش سے لیل و نہار اور سال کے موسموں کی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ سورج اور چاند کے علاوہ اس آسمانِ دنیا کو اللہ نے بے شمار ٹمٹماتے ستاروں سے مزین کر دیا ہے جو نہ صرف آسمانِ دنیا کی زینت ہیں بلکہ وہ رات کی تاریکی میں راہ چلتے مسافروں کو راستہ دکھاتے اور صحیح سمت متعین کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ایک جگہ بیاں ہوا ہے: "اور ستاروں سے وہ (لوگ) راہ پاتے ہیں۔" (النحل ۱۶) ۔ (۳۳)

اسماعیل میرٹھی کی اس نظم میں بھی ستاروں کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسافروں کو رات کے وقت راستہ دکھانے میں یہ کس طرح اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ آج بھی دیہی علاقوں میں بسنے والے ایسے لوگ موجود ہیں جو انھی سے وقت اور سمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں کہ جن میں یہ ننھے ستارے ایک وسیع و عریض جہاز کو راستہ دکھارہے ہیں تو کبھی سمتوں کا پتا دے رہے ہیں:

وہ جہاز جن کے آگے/ہے وسیع بحر اعظم
انھیں ہولناک موجوں/سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن/کوئی آ رہا ہے واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہے/کہ کدھر ہے ان کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی/نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل رہبر/مگر اے فلک کے تارو
تمھیں ان کے رہنما ہو(۳۴)

اس راہنمائی کو سمجھنا اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالنا فطری مظاہر کو سمجھنے اور انتہائی قریب سے دیکھنے والا شاعر ہی بیان کر سکتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کو اس حوالے سے اس کائناتی نظام اور اس کے مظاہر کی مکمل سمجھ معلوم ہوتی ہے جو انسانی زندگی سے جڑی اس نظام کی ہر شے اور اس کی اہمیت کو بخوبی جانتا ہے۔ اسے کس طرح آپسی تعلق کی صورت میں بیان کرنا ہے انھیں اس میں بھی کمال حاصل ہے۔ جس کی ایک مثال یہ نظم ہے۔ جہاں رات کی اور ستاروں کی اہمیت بیان ہوئی وہیں "صبح کی آمد" بھی انسانی زندگی میں اپنے کردار کو کچھ یوں بیان کرتی ہے:

صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں/اجالا زمانہ میں پھیلا رہی ہوں
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی/میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں/اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے
یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی/ادھر سے ادھر اڑ کے ہیں آتی جاتی
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں/جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی
تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی/اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی
میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی/اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں(۳۵)

انسانی زندگی کا پورا نظام کس قدر اس قدرتی ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی کی نوید سورج لے کر آتا ہے اور دن کے ہونے کی خبر دیتا ہے۔ اسے صبح کی آمد کا نقارہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی آمد کی اطلاع بیان کردہ مصرعوں سے ہی عیاں ہے۔ اجالے کا پھیلاؤ، چڑیوں کا، جانوروں کا خوراک کے لیے نکل پڑنا، غرض ہر شے اس کی آمد کا پتا دیتی ہے کہ اب صبح ہو گئی ہے اور کائنات کا نظام حرکت میں آنے والا ہے۔ رات کا اندھیرا سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ گھٹا چلا جاتا ہے۔ جو سکوت رات کے وقت چھایا تھا صبح کی آمد نے اسے توڑ دیا ہے۔ اب ہر طرف اجالا چھانے لگا ہے۔ اذانیں گونج رہی ہیں۔ پرندے حمد و ثنا بیان کر رہے ہیں۔ شبنم کے قطرے جو پودوں پر پڑے تھے چمکنے لگے ہیں۔ چڑیا، طوطے، بلبل، کوئل جیسے پرندے ہر طرف چہک رہے ہیں۔ باغوں میں پھول کھل اٹھے ہیں۔ کچھ پھول جو شام کے بعد اپنی پتیاں بند کر لیتے ہیں سورج کی روشنی سے پھر سے کھل اٹھے ہیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے جو انسانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے/نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے/اگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں/کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں
بجھاتی چلی شمع کو انجمن میں/اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں
ہرن چونک اٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں/کلولیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر ہیں/غرض میرے جلوے پہ سب مر رہے ہیں (۳۶)

صبح کی آمد پر ہم انسانوں سے پہلے چرند، پرند اپنے گھونسلوں میں چہکنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھول اپنے رنگوں سمیت کھل اٹھتے ہیں۔ جانور اپنی آماجگاہوں سے خوراک کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسانوں سے پہلے حیوانی و نباتاتی دنیا کی صبح ہو جاتی ہے۔ اور انھی کی چہل پہل اور آوازوں سے ہم اپنی صبح کی آمد کا اندازہ لگاتے اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں جگانے والوں میں کچھ ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ صبح جگاتی ہے۔ ان کرداروں کے جاگنے سے یوں لگتا ہے جیسے زندگی کی حرکت کا اعلان ہو چکا ہو۔ اور اس کا بیان وہ کچھ یوں دیتی ہے :

پجاری کو مندر کے میں نے جگایا/مؤذن کو مسجد کے میں نے اٹھایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا/اندھیرا گھٹایا اجالا بڑھایا
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں/لدے قافلوں کے بھی منزل میں ڈیرے

کسانوں کے ہل چل پڑے منہ اندھیرے/چلے جال کندھے پہ لے کر مچھیرے
ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری/دکھائی دیے باغ اور کھیت کیاری (۳۷)

صرف ایک صبح کے ہونے سے ہی دنیا کا پورا نظام بدل جاتا ہے۔ ہر طرف جیسے زندگی نے نیا جنم لیا ہو۔ رات کو جہاں مسافروں، کسانوں، چرند پرند، پیڑ پودوں نے آنکھیں موندے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب ان کے کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ قدرت کا یہ نظام برسوں سے چل رہا ہے اور اپنے مقررہ اوقات میں سارے امور کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ انسانی زندگی میں اس کا کردار بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ فطرت کس کس طرح انسانی زندگی کے ساتھ جڑی اسے فائدہ پہنچاتی ہے اس کا اندازہ انھی مظاہر فطرت کے باریک بیں مطالعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے غلام حسین ورڈزورتھ کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ورڈزورتھ بار بار انسان کی ذہنی و روحانی ترقی کے لیے فطرت پر زور دیتا ہے۔ فطرت کے ساتھ اچھا تعلق انسان کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی بالیدگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فطرت سے فاصلہ اور دوری انسان کو خود غرض، بے اخلاق اور بے سکون کر دیتی ہے جیسا کہ بڑے شہروں کے باسیوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کی نظروں کو جدید تہذیب کی چکاچوند نے خیرہ کر دیا ہے اور فطرت سے ان کا تعلق کمزور ہو گیا ہے۔ (۳۸)

شہری اور دیہاتی زندگیوں کے حوالے سے بھی اگر انسان کا عالم فطرت سے تعلق بیان کیا جائے تو ایک الگ ہی باب جنم لیتا ہے جس کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں مگر ان افتراقات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کی وجہ سے انسانی زندگیوں پر الگ الگ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں فطرت جس طرح اس کی اصل روح کے ساتھ موجود نظر آتی ہے وہ ان کی دیہی شاعری کی وجہ سے ہے کہ جہاں ہر قدرتی مظہر اپنے اصلی وجود کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتے دکھایا گیا ہے اور جس کی اہمیت کو یکسر نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں ایک مکمل منظر کشی کی گئی ہے کہ جب آرام کا وقت ہوتا ہے تو پورے ماحول پر کس طرح تبدیلی آجاتی ہے۔ پھر چاہے وہ دیہی علاقوں میں دوپہر کا وقت ہو یا پھر دن بھر کے کام کاج نمٹانے کے بعد، سورج کے سونے اور چاند کے جاگنے کا ہی وقت کیوں نہ آجائے۔ اسماعیل میرٹھی نے اسے " اب وقت ہے آرام کا" میں بیان کیا ہے:

جھٹ پٹا سا ہو گیا ہے شام کا/اب کہاں باقی ہے موقع کام کا
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا/قصد چڑیوں نے بسیرے کا کیا
ڈھونڈتی ہیں اپنا اپنا گھونسلہ/صاحبو یہ وقت ہے آرام کا
دیکھنا سورج ہے چھپنے کے قریب/تھم گئے چلتے مسافر بھی غریب
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا/لو، کبوتر بھی گر پڑے پر جوڑ کر
لیں گے اپنے چھوٹے بچوں کی خبر/صاحبو یہ وقت ہے آرام کا
شام کو بستی سے باغوں کی طرف/اڑ چلے کوے بھی مل کر صف بہ صف
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا(۳۹)

صبح سے چلنے والا کاروبار زندگی اب آہستہ آہستہ تھم رہا ہے۔ انسانوں سے لے کر چرند پرند اور دیگر مخلوقات اپنے اپنے گھروں کی جانب رواں دواں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نظام کائنات سے جڑے قدرتی مظاہر بھی اپنے اپنے اوقات کار سرانجام دے کر کچھ تو سو چلے ہیں اور جن کے جاگنے کا وقت ہو چلا ہے وہ اپنے کاموں کی ادائیگی کو تیاری پکڑنے لگے ہیں۔ جیسے چاند، ستارے، اندھیرا اور خاموشی ان کی آمد کے بعد منظر کچھ یوں ہو جاتا ہے:

کھلبلی جو دن میں تھی مدھم پڑی/بھنبھناہٹ مکھیوں کی کم پڑی
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا/جانور دن بھر قلانچیں بھر چکے
اپنا اپنا کام پورا کر چکے/صاحبو یہ وقت ہے آرام کا
یہ جو کٹ کٹ کر رہی ہیں مرغیاں/ڈھونڈتی ہیں اپنے دڑبے کا نشاں
صاحبو یہ وقت ہے آرام کا (۴۰)

انسانی زندگی کا پورا نظام کس طرح ایک قدرتی نظام کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے جڑا ہوتا ہے۔ اس میں ہونے والی تبدیلی پورے فطری ماحول کو بدل دیتی ہے۔ زمین کے ایک حصے پر جہاں سورج غروب ہوتا ہے وہیں دوسرے حصے پر صبح کی نوید سناتا ہے۔ یہی تبدیلیاں ہر ہر سطح پر اس ماحولیاتی نظام کو متاثر کرتی ہیں۔ بہت سے شاعروں کے ہاں صرف ان مناظر کو بحیثیت مناظر فطرت کے بیان کر دیا گیا ہے جب کہ اسماعیل میرٹھی نے مناظر فطرت کا بیان صرف منظر کو بیان کرنے کے طور پر یا اس کی ایک تصویر پیش کرنے کے حوالے سے نہیں کیا ہے۔ نہ ہی ان کے ہاں لفظوں سے منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کا تعلق جذبات سے لے کر ان کے آپسی تعلق کے ساتھ مربوط ہے جو ایک دوسرے سے باہم منسلک ہیں۔ ان کا

آپسی تعلق کس طرح ایک پورے نظام کو چلانے میں معاون ثابت ہوتا ہے اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ہوا، پانی، روشنی/ شفق، دن ورات کے آنے جانے اور ان کے انسانی زندگی میں کردار کو مختلف شعری مثالوں سے بیان کیا گیا ہے وہیں کچھ موسموں کا احوال بھی پیش خدمت ہے۔ " گرمی کا موسم " نظم ملاحظہ ہو:

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ/بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینا
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا/ہوا پیروں تلے پوشیدہ سایا
چلی لو اور تڑاقے کی پڑی دھوپ/لپٹ ہے آگ کی گویا کڑی دھوپ
زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے/کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے
در و دیوار ہیں گرمی سے تپتے/بنی آدم ہیں مچھلی سے تڑپتے(۴۱)

عالمی سطح پر ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیاں ایک بڑے پیانے پر موسمیاتی تبدیلیوں کی بھی بنیادی وجہ بن رہی ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں بڑھتی ہوئی آبادی اور ماحولیاتی آلودگی کے باعث اوزون کی حفاظتی تہہ میں خاتمہ دیکھا گیا ہے۔ یہی وہ تہہ ہے جو سورج کی خطرناک شعاعوں کو زمین تک آنے سے روکنے میں ایک حفاظتی شیلڈ فراہم کرتی تھی۔ اس میں ہونے والی تبدیلی سے گزرتے وقت کے ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس حوالے سے ہونے والے مختلف سرویز خطرے کی گھنٹی بجاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں دیے جانے والے انٹرویو میں نوم چومسکی نے دل دہلا دینے والے انکشافات کیے ہیں۔ جن میں ۲۰۱۶ء کو اب تک کا گرم ترین سال قرار دیا گیا ہے۔ ایٹمی اسلحے کی ایک نئی خاموش دوڑ جو امریکہ، روس اور چین کے بیچ چھوٹے ایٹمی اسلحے کے ذخائر کی تعمیر کی شکل میں چھڑ چکی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ ہر حوالے سے سب ممالک سے آگے ہے۔ یہ واحد ملک ہے جس کے پاس پوری دنیا میں سینکڑوں ہزاروں فوجی اڈے ہیں۔ ٹیکنالوجی، معیشت اور سرمایہ داری کے حوالے سے اس کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ ایٹمی خطرے کے حوالے سے کچھ سائنسدانوں نے " یوم حشر کی ساعت " کی ایک اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس کے مطابق ہم تباہی سے بس چند ساعتوں کی دوری پر ہیں اور یہ خطرہ ولیم پیری جو کہ ایٹمی ماہر اور سابق ڈیفنس سیکرٹری بھی ہیں نے " تخمینہ لگایا ہے کہ اب کی بار خطرہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کی نسبت زیادہ ہے۔ " دوسرا خطرہ ماحولیاتی بحران کا ہے۔ برفانی تودے پگھل رہے ہیں، زیر زمین پانی کی سطح گرتی جا رہی ہے، سطح سمندر میں اضافہ ہو رہا ہے، قحط سالی شدت اختیار کر رہی ہے، جنوبی ایشیا کے لوگوں کو پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا، نقل مکانی کے خدشات حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ایسی صورت

حال پر حکومتی سطح پر ڈیموکریٹس کی جانب سے ایک دو تبصرہ دیکھنے کو مل جاتا ہے لیکن ری پبلیکن اول تو اس عالمی حدت کے خطرے کو یا بحران کو سرے سے مانتے ہی نہیں یا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جی ایسا مسلہ ہے لیکن ابھی اتنا نہیں ہے کہ اس سے خوف کھایا جائے۔ " موسمیاتی تبدیلی اور ایٹمی پھیلاؤ کی بدولت انسانوں کو پہلی مرتبہ بد ترین خطرے کا سامنا ہے" ایسے مسائل کو یا عوامی سطح پر اول تو ٹھیک طرح پیش نہیں کیا جاتا ہے اور اگرچند باشعور افراد اس پر آواز بلند کر بھی لیں تو انھیں مذہب میں الجھا دیا جاتا ہے۔ جس طرح ماحولیاتی بحران، حدت اور مسائل کے حوالے سے کیا جارہا ہے جس متعلق نوم چومسکی کا کہنا ہے کہ اس حوالے سے عوامی سطح پر اس تاثر کو ابھارا جارہا ہے کہ " عالمی حدت میں انسانوں کا کوئی کردار نہیں اگر یہ واقعی ہو رہی ہے تو۔"(۴۲) حدت / گرمی کی ایک تصویر تو اسماعیل میرٹھی نے ہمارے سامنے اس کے انسانی و حیوانی زندگی پر اثرات کے ساتھ کھینچی ہے۔ جانے آنے والا وقت ہمیں اس کی کیا صورت دکھائے:

پرندے اڑ کے ہیں پانی پہ گرتے/چرندے بھی ہیں گھبرائے سے پھرتے
درندے چھپ گئے ہیں جھاڑیوں میں/مگر ڈوبے پڑے ہیں کھاڑیوں میں
نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی/زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
نہ پنکھا ہے نہ ٹٹی ہے نہ کمرہ/ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ
امیروں کو مبارک ہو حویلی/غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی (۴۳)

جہاں پچھلے صفحات میں برسات کے موسم کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔ جس میں زندگی اپنے تمام رنگوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی دکھائی دیتی ہے وہیں دوسری طرف اگر گرمی کے موسم کی بات کی جائے تو ایک الگ ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ ہر موسم کا اپنے ارد گرد کے موحول کے مطابق ایک الگ ہی اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کو اگر دیہی اور شہری زندگیوں سے ہی کیوں نہ جوڑ کر دیکھ لیا جائے تب بھی ایک منفرد تصویر سامنے آتی ہے۔ اوپر بیان کردہ نظم کو دیکھا جائے تو ہر طرف دھوپ، پسینہ اور پیاس دکھائی دیتی ہے۔ ہر ذی روح اس سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ پورا ماحولیاتی نظام کس طرح ایک بڑی تبدیلی لے کر آتا ہے کہ ہر وہ چیز جو ہمیں عام دنوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرواتی ایسے دنوں میں ہمیں مختلف چیزوں کی اہمیت و نقصانات سے واقفیت دلواتی ہیں۔ کہاں انسان، کہاں جانور، چرند پرند اور پیڑ پودے وغیرہ ایسے موسم میں ہر چیز کا رہن سہن مکمل تبدیل ہو جاتا ہے۔ " جاڑا اور گرمی" بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں دو مختلف موسموں کے بیچ کا مکالمہ ان کی الگ الگ اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

جاڑااور گرمی

ایک دن جاڑے نے گرمی سے کہا/میں بھی ہوں کیاخوب موسم واہ وا!
میں جہاں میں ہوں زبس ہر دل عزیز/مانگتے ہیں میرے آنے کی دعا
رات گرمی کی تو کچھ ہوتی نہ تھی/دن کی محنت سب کو دیتی تھی تھکا
میری آمدنے کیاشب کودراز/میرے آنے نے دیادن کو گھٹا(۴۴)

ایک موسم کی تبدیلی پورے نظام زندگی کو بدل دیتی ہے۔ دن رات کا آنا جانا، ہواؤں کا چلنا، بارشوں کا ہونا، فصلوں کا پکنا، پھولوں کا کھلنا مرجھانا، نئی زندگیوں کا جنم لینا، انسانی زندگی پر اس کے اثرات، دن بھر کے کاموں کی ترتیب کا بدل جانااور ایسے ہی کئی دیگر امور صرف ایک موسم کی تبدیلی کی وجہ سے بدلاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جن کی مثبت و منفی دونوں صورتوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں کا ہونا ہی انسانی و حیوانی زندگیوں کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ قدرتی ماحول کی وہ بناوٹ ہے جو تبدیلی ہونے کی صورت میں ہی اپنا نظام چلا سکتی ہے۔ اگر سال بھر صرف سردی کا موسم رہے تو کئی اشیائے ضرورت سے لے کر حیوانات و نباتات ایک منجمند زندگی گزاریں۔ ایسے ہی گرمی کا موسم رہے تو کئی انواع موت کے منہ میں چلی جائیں۔ قدرت نے اس نظام کی بناوٹ ہی حرکت اور تبدیلی پر رکھی ہے:

لو مسافر کا جھلس دیتی تھی منہ/اور زمیں تلووں کو دیتی تھی جلا
اب ہوا بھی اور زمیں بھی سرد ہے/کھو دیا میں نے حرارت کا پتا
مل گئی کتنے بکھیڑوں سے نجات/ٹٹیاں موقوف پنکھا چھٹ گیا
دھوپ کا ڈر ہے نہ لو کا خوف ہے/ان دنوں کی دھوپ ہے گویا غذا
سورج اب کترا کے جاتا ہے نکل/مکھیاں بھی رہ گئی ہیں خال خال(۴۵)

جاڑا یعنی سردی کا موسم ایک مکالماتی فضا قائم کرتے ہوئے گرمی کے موسم کو اپنی خصوصیات گنوا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ گرمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی بھی نشان دہی کروا رہا ہے اور پھر اس کی اپنی آمد کس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں کو ان مسائل سے چھٹکارا دلواتی ہے ان پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ گرمیوں میں جہاں ہر طرف اداسی اور بے رونقی چھائی تھی جاڑے کے آنے سے ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کی آمد سے انسانی زندگی میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی وہ بھی جاڑے کے ہی زبانی سنیں:

گرم پوشاکوں نے اب پایا رواج/میں نے بخشا آن کر خلعت نیا
سل گئے تو شک لبادے اور لحاف/درزیوں نے پایا محنت کا صلہ
میرے ہوتے کون پوچھے برف کو/باسی پانی برف کا بھی ہے بچا
ندی نالوں کا گیا پانی نتھر/جھیل اور تالاب نے پائی صفا
سیب۔ نارنگی۔ بہی۔ لیمو۔ انار/ذائقہ ہے جن کی صورت پہ فدا
پستہ و بادام انگور و مویز/میوہ ہر اک قسم کا بکنے لگا
تخم ریزی جنس اعلیٰ کی ہوئی/کھیت میں بویا گیا گیہوں چنا
عید کی سی دھوم ہے دیہات میں/پک گئی ایکھ اور کولھو چل پڑا(۴۶)

اوپر بیان کردہ تمام مثالیں اور تبدیلیاں جو گرمی کی وجہ سے رونما نہیں ہو پا رہی تھیں سردی کے اس ٹھنڈے موسم کی آمد کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا پہیہ چل پڑتا ہے۔ جو پھل، پھول، میوے گرمی کی وجہ سے نہیں پک پاتے ہیں وہ اس موسم میں پک جاتے ہیں۔ جو فصلیں اور سبزیاں اس موسم میں میسر آتی ہیں وہ گرمیوں میں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ گرم پوشاکیں پہنی جا رہی ہیں۔ لحافوں کو جو گرمی کے موسم میں دھوپ لگوائی جاتی ہے وہ اسی موسم کے لیے ہوتی ہے کیوں کہ ہر طرف نمی کی وجہ سے ایک عجیب سی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ گرمی میں جو برف اور ٹھنڈے مشروب کا استعمال کیا جاتا تھا اب ان کی جگہ سادے پانی نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاڑا سینہ تانے گرمی کے موسم کو اپنی خوبیاں گنوائے جاتا ہے۔ یہی صورت حال دیکھتے ہوئے گرمی بھی چپ نہیں رہ پاتی ہے اور وہ بھی جاڑے سے جوابی کارروائی شروع کر دیتی ہے کہ صرف تم ہی اس فطری دنیا میں تبدیلی نہیں لے کر آتے ہو۔ میں بھی اس کائناتی/قدرتی نظام میں اپنا ایک مقام رکھتی ہوں :

سن کے یہ باتیں ہوئی گرمی بھی تیز/اور جل کر یوں جواب اس کو دیا
تیری خود بینی ہوئی تجھ کو حجاب/خوبیوں کو میری سمجھا بدنما
تجھ سے عالم میں خزاں کا ہے ظہور/مجھ سے ہے فصل بہاری کی بنا
تو نے شاخوں کے لئے پتے کھسوٹ/تو نے پیڑوں کو برہنہ کر دیا
میرے آنے سے پھلے پھولے شجر/سبز پوشاک ان کو میں نے عطا کی
میں نے شاخوں میں لگائے برگ و بار/ورنہ تھا کیا ان میں ایندھن کے سوا؟(۴۷)

جہاں جاڑے نے اپنی خوبیاں بیان کی ہیں اور انسانی و حیوانی زندگی پر اس کے اثرات کو مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے وہیں گرمی بھی اپنے لب کھولتی ہے اور اپنا ہونا بتاتی ہے۔ بہار کی آمد، نئے پھول پھلوں کا پیدا ہونا، خزاں اور سردی کی وجہ سے مرجھائے اور پتوں سے محروم ہوئے پیڑ پودوں کا پھر سے ہرا بھرا ہونا غرض بڑے پیمانے پر ہونے والی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو کھیت سردی کی وجہ سے کچے پن کا شکار تھے گرمی کی آمد کے ساتھ ہی وہ پکنے لگ جاتے ہیں۔ بہت سے پیڑ پودوں پر سردیوں میں جو برف جمی تھی گرمی نے انھیں پگھلا کر پھر سے ہرا بھرا کر دیا ہے اب جلد ہی وہ پھلوں اور میوں سے لد جائیں گے۔ جو چشمے جمود کا شکار تھے گرمی نے انھیں پھر سے حرکت بخشی ہے۔ صرف بظاہر ماحولیاتی حوالوں سے ہی موسموں کا آنا اور جانا تبدیلیاں لے کر نہیں آتا ہے بل کہ ان سے انسانی زندگی اور اس کی صحت پر بھی مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دھوپ کی وجہ سے انسانی جسم کی بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ سردی کی وجہ سے گھروں میں مقید ہو جانا بھی انسانی صحت پر برے اثرات مرتب کرتا ہے وہیں گرمی کا موسم ان کو زائل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے:

کر دیا میں رگوں میں خوں روا/ ٹھنڈ سے شل ہو گئے تھے دست و پا
میں نے کھولے آن کے تن کے مسام/ کیوں کہ تھا رکنا پسینہ کا برا
رات بھر رہتی تھی خلقت گھر میں بند/ کر دیا اس بند سے میں نے رہا
لو اٹھا کر لے چلے غلہ کسان/ اب کریں گے قرض بنیوں کا ادا
میں نے حکمت سے چلائیں آندھیاں/ تا بدل جائے مکانوں کی ہوا
میں سمندر سے اٹھاتی ہوں بخار/ جس سے چھا جاتی ہے ملکوں پر گھٹا
ہے ہمیشہ ابتدا میری بہار/ ہے سدا برسات میری انتہا(۴۸)

جب گرمی اپنی خوبیاں گنوانے لگی تو کایا ہی پلٹ دی۔ دونوں موسم اپنی اپنی جگہ بالکل درست تھے۔ جہاں ایک کی آمد سے کچھ چیزوں کی رونق ماند پڑتی ہے تو دوسرا اس میں رنگ بھر دیتا ہے۔ جو چیز ایک موسم میں دستیاب نہیں ہوتی دوسرا اس کی فراہمی یقینی بنا دیتا ہے۔ پورے ماحولیاتی نظام میں ان موسموں کا آنا جانا نہ صرف اس قدرتی نظام کے لیے بل کہ انسانی زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کا آغاز جس طرح ایک ترتیب سے کیا گیا ہے ویسے ہی اس کے آخری اشعار بھی ان کی اہمیت کو مانتے ہوئے بخوبی اختتام پیش کرتے ہیں:

تھیں غرض دونوں کی تقریریں دراز/اور طولانی بیانِ ماجرا
سن کے ان دونوں کی یہ کج بحثیاں/ایک دانا نے کیا یوں فیصلہ
کچھ نہیں ہے اس میں جاڑے کا قصور/کچھ نہیں ہے اس میں گرمی کی خطا
جب حقیقت پر نہیں ہوتی نظر/یوں ہی رہتا ہے بہم شکوہ گلا
ہے حرارت کی کمی بیشی فقط/ورنہ جاڑا کون؟ اور گرمی ہے کیا؟(۴۹)

دونوں موسم اپنی اپنی جگہ مفید اور مضر ہیں اور ساتھ ہی ان کے بنانے والی ذات نے انھیں انسان کے مفاد کے لیے بنایا ہے۔ اس دنیا کی بقا کے لیے دونوں کا ہی وجود لازمی ہے۔ شاعر نے محض ان کو بیان کر دینا ہی کافی نہیں سمجھا ہے بل کہ ایک مکالماتی فضا قائم کر کے ایسی فضا تشکیل دی ہے کہ جس میں کبھی انسان فطرت سے، فطرت انسان سے تو کبھی فطرت اپنے جیسے ہی کسی دوسرے فطری مظہر کے ساتھ ہم کلام ہے اور دونوں کا مکالمہ اپنی اپنی جگہ پر ان کی نہ صرف انسانی زندگی میں اہمیت کو واضح کرتا ہے بل کہ دیگر حیوانی مخلوقات اور چرند پرند بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ماحولیاتی ادبی تنقید نے ابتدائی سطح پر جس طرح کے ادب کو چوٹ کی ان میں انسان کو اس کائنات کا مرکز سمجھا گیا تھا اور ایک ایسے نظریے کو فروغ دیا کہ جس متعلق آیتہ اللہ جوادی لکھتے ہیں:

> ماحولیاتی تنقید کا شعبہ معاصر ادب کے اندر یہ دیکھتا ہے کہ اس میں ماحول کو کتنا وقت اور کتنی جگہ حاصل ہے۔ انسان کائنات سے جدا نہیں ہے بل کہ اسے یہ مقام و منزلت اور رفیع درجہ نظام ہستی نے عطا کیا ہے۔ ماحولیاتی تعریف کے مطابق انسان ایک ایسا جانور ہے جس کا شمار نہ نباتات میں ہوتا ہے اور نہ خداؤں میں کیوں کہ نباتات انسان سے پست تر اور خدا انسان سے برتر ہیں۔(۵۰)

آج کے اس جدید معاشرے نے انسان سے یہ سوچ شاید چھین لی ہے کہ وہ اپنی آسائشوں اور آرام کے لیے جن چیزوں کو نقصان پہنچا رہا ہے وہی اس کی تباہی کا نقارہ بجا رہی ہیں۔ دن بدن ہونے والی ماحولیاتی تبدیلیاں اس کائناتی نظام کے ختم ہونے کا جلد اعلان کر دیں گی۔ جس کی کچھ مثالیں ہمیں قدرتی آفات کی شکل میں بھی دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ جن میں سیلاب، زلزلے، قحط، طاعون وغیرہ شامل ہیں۔ کسی بھی ایک قدرتی عنصر کا بگڑ جانا پورے ماحولیاتی نظام کو متاثر کر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال اسماعیل میرٹھی کی نظم " خشک سالی" کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں پانی کی کمی سے ہونے والے نقصانات، اور اس سے پیدا ہونے والے دیگر مسائل کو بھی بیان کیا گیا ہے:

خشک سالی

نہ آئی۔ پر نہ آئی پر نہ آئی/ گھٹا نے بول دی بالکل صفائی
اگر آئی تو کی لے دے ہوا نے/سواری اور جانب کو بڑھائی
گئے دریا اتر۔ تالاب سوکھے/کجائی ابر دریا دل کجائی ؟
نہ صحرا میں دل آویزی کا انداز/نہ بستاں میں ادائے دل کشائی
نہ صحن باغ میں طوطی کا نغمہ/نہ شاخ گل پہ بلبل چہچہائی
زمین چٹیل ہے کورا آسماں ہے/ہوئی اب کے برس اچھی صفائی
نہ روئے مل کے ساون اور بھادوں/ہوئی ہے ترک باہم آشنائی(۵۱)

جب ایک بڑے پیانے پر موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے کسی ایک شے کی زیادتی یا کسی چیز کی بڑے پیانے پر کمی دیکھنے میں آتی ہے تو انسانی زندگی کا پہیہ بالکل جام ہو جاتا ہے۔ وہ صرف کسی ایک سطح پر نقصان یا تبدیلی کا موجب نہیں بنتا، بل کہ اس سے جڑا ایک پورا نظام متاثر ہوتا ہے۔ خشک سالی جیسی قدرتی آفات کا آنا بڑے پیانے پر تباہی کے ساتھ ساتھ کئی تبدیلیاں بھی لے کر آتا ہے۔ اس کی بڑی اور بنیادی وجہ اس ماحولیاتی/ قدرتی نظام کی آپسی جڑت ہے۔ ایک چیز میں بگاڑ کئی مسائل کو جنم دے سکتا ہے۔ اوپر بیان کردہ شعری مثالوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تالابوں، ندی نالوں کا سوکھ جانا ہی دیکھ لیا جائے تو اس سے کتنے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دریا بھی جب ایسی آفت کا شکار ہو جائیں تو دراڑوں زدہ زمین کی تصویر پیش کرنے لگتے ہیں۔ جس طرح خشک سالی صرف زمینی مسائل پیدا نہیں کرتی ہے بل کہ موسموں کے بدلاؤ میں بھی بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں:

نہ پرنالے چلے اب کے دھڑا دھڑ/نہ گزری کی سڑک رونے بہائی
نہ وہ سن سن نہ وہ جھونکے ہوا کے/نہ بجلی نے چمک اپنی دکھائی
نہ وہ برسات کے کیڑے پتنگے/نہ مینڈک نے زمیں سر پر اٹھائی
کہاں بادل کہاں بجلی کہاں مینہ/پریشانی سی ہے دنیا پہ چھائی
نہ اے بھادوں بھرن برسائی تو نے/نہ اے ساون جھڑی تو نے لگائی(۵۲)

کسی ایک شے کی کمی سے یا اس کے نہ ہونے سے کس قدر ماحولیاتی نظام متاثر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب انسانی زندگی سے جڑے اور بھی دیگر عوامل بھی بری طرح ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حیوانی دنیا کی مخلوق بھی اس کی زد میں آنے سے محفوظ نہیں رہتی ہے بل کہ ان کی زندگیوں پر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

بہت رو کر دعائیں سب نے مانگیں/ گھٹا روئی نہ بجلی مسکرائی
ہوئی برباد کھیتی تھک گئے بیل/گئی گزری کسانوں کی کمائی
نہیں بیچارے حیوانوں کو چارہ/ہے انسانوں کو فکر بینوائی
بہت مزدور بیٹھے ہیں نکمے/نہیں اب کوئی حیلہ جز گدائی
سمندر کیا ہوئے تیرے بخارات/صبا، تو کیوں اڑا کر لے نہ آئی
بلائے قحط ہے ہندوستاں میں/ہے روم و روس میں برپا لڑائی
خدایا جلد قحط اور جنگ ہوں دور/ملے سب کو مصیبت سے رہائی
خدایا رحم کر، جاں لب پہ آئی/تری مخلوق دیتی ہے دہائی (۵۳)

اس نظم کا پس منظر ہندوستان میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار اور ان سے انسانی و حیوانی زندگیوں پر پڑنے والے اثرات شامل ہیں نیز پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے کیا کیا نقصان ہوئے کن کن چیزوں پر اس کا اثر ہوا ان کی مثالیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ روم و روس کی جنگ کا بھی ذکر شامل ہے۔ ہوا، پانی، روشنی قدرت کے وہ مظاہر ہیں کہ جن پر اس دنیا کا مکمل انحصار ہے اور ان تین چیزوں میں سے کسی بھی ایک عنصر کا بگاڑ پورے ماحولیاتی نظام کے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان اور اس سے جڑا اس کے ارد گرد کا پورا ماحول کس طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ انسان اس کرہ ارض پر کس طرح رہتا ہے اور زندگی گزارتا ہے وہ اس کے ماحول کی اور زمین کی بہتر فراہمی پر منحصر ہے۔ اس حوالے سے آیتہ اللہ جوادی کا کہنا ہے کہ زمین سے مراد انسان کی زیست کا ماحول ہے جو سمندر کی گہرائیوں سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ زمین کی آبادکاری سے مراد انسانی زندگی کے لیے سالم ماحولیات فراہم کرنا ہے نہ کہ نباتاتی زندگی جو بعض لوگوں کا خیال ہے اور نہ ہی مخصوص حیوانی زندگی کہ جس پر بعض دوسروں کا تکیہ ہے:

> بل کہ اس سے مراد انسانی زندگی ہے جو کہ تمام نباتاتی اور حیوانی مراحل کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی ایسا ماحول فراہم کرنا جس سے زمین کو تباہی کے خطرے سے نجات ملے اور معاشرہ اخلاقی ضرر سے محفوظ رہ جائے۔ (۵۴)

اسماعیل میرٹھی کی بچوں کے لیے لکھی جانے والی یہ نظم جس میں انھیں خدا کی بنائی اس کائنات کے تمام مظاہر اور ان کے کردار سے واقفیت دلوائی جا رہی ہے۔ انسانی زندگی میں فطری مظاہر کا کیا کیا کام ہے وہ اس نظم کے ذریعے بخوبی عیاں ہوتا ہے۔ زمیں و آسماں کا بچھونا، پیڑ، پودے، جانور، چرند پرند، سورج، چاند ستارے، ہوا، پانی، روشنی، پہاڑ، کھیت غرض ہر وہ چیز جس کی انسانی زندگی میں ضرورت ہے وہ سب موجود ہے اور قدرت کے اس کارخانے میں اپنی خدمات سرانجام دینے کے لیے ہمہ وقت دستیاب ہے۔ اس کی یہ دستیابی مختلف اوقات سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ موسموں کی تبدیلیوں سے لے کر کسی بھی آفت کے آجانے سے ہونے والی تبدیلیوں تک قدرت کا یہ ان دیکھا ایک ہی ڈور سے جڑا نظام ایک مکمل طریقے سے چل رہا ہے۔ جس کی تشکیل کچھ اس طریقے سے کی گئی ہے کہ وہ ہر ذی روح کو ان کی ضرورت کے مطابق سہولیات فراہم کرتا ہے چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

حمد

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا/کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا
پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی/اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوش نما اگائے/پہنا کے سبز خلعت ان کو جواں بنایا
خوش رنگ اور خوشبو گل پھول ہیں کھلائے/اس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا
میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے/چکھنے سے جن کے مجھ کو شیریں دہاں بنایا
سورج بنا کے تو نے رونق جہاں کو بخشی/رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکاں بنایا
پیاسی زمیں کے منہ میں مینہ کا چوایا پانی/اور بادلوں کو تو نے مینہ کا نشاں بنایا(۵۵)

ان مثالوں کے پس منظر میں ماحولیاتی ادبی تنقید سے جڑے اس نظریے کو لیا جائے جس میں ادب میں فطرت کے اظہار کی مختلف صورتوں کو دیکھا جاتا ہے تو اسماعیل میرٹھی کے ہاں پائی جانے والی شعری مثالیں ہمیں فطرت کے اظہار کی دوسری صورت کی بہترین مثال کے طور پر ملتی ہیں۔ جس میں فطرت کو کسی علامت یا استعارے کے لیے نہیں بل کہ فطرت کے اظہار کی براہ راست صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اورنگزیب نیازی لکھتے ہیں کہ فطرت کا براہ راست اظہار اس کی اصل ہے جس میں :

> فطری مظاہر اپنی جداگانہ اور قائم بالذات حیثیت میں سماج کے ایک حصے / باشندے کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کسی انسانی صفت کی نمائندگی کی بجائے اپنے احساسات و جذبات، افعال و اعمال، سماج میں اپنے کردار اور انسان سمیت دیگر مخلوقات کے ساتھ تعلق و رشتے کو بیان کرتے ہیں اور اپنی موجودگی (بہ طور ایک فطری مظہر) باور کراتے ہیں۔(۵۶)

بظاہر نظر آنے والا یہ نظام اور اس کی اشیا چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہیں انسانی دنیا اس سے بخوبی واقف ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے انھیں ویسا ہی پیش کیا ہے جیسے وہ اس نظام میں اپنی اصل کے ساتھ موجود ہیں اور انسانوں کس طرح فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ تنکے کے ایک ٹکڑے سے لے کر اس آسمان جیسی بڑی چیزیں ہمارے اس پورے نظام کی عکاسی کرتی ہیں جسے قدرت نے ہمارے لیے بنا چھوڑا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے انکار گویا اس پورے نظام سے انکار ہے۔ قدرت کے مظاہر سے لطف اندوز ہونے سے لے کر انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے تک سب ہمارے ہاتھ میں تو ہے لیکن جب یہ قدرتی /ماحولیاتی نظام بے جا مداخلت سے تباہ ہو رہا ہو تو اس کا بگاڑ درست کرنا ہمارے ہاتھ نہیں۔ مزید شعری مثالیں ملاحظہ کیجیے جو اس نظام کی آپسی تعلق داری پر بھی روشنی ڈالتی ہیں :

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی/قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا
تنکے اٹھا اٹھا کر لائیں کہاں کہاں سے/کس خوبصورتی سے پھر آشیاں بنایا
اونچی اڑیں ہوا میں بچوں کو پر نہ بھولیں/ان بے پروں کا ان کو روزی رساں بنایا
کیا دودھ دینے والی گائیں بنائیں تو نے/چڑھنے کو میرے گھوڑا کیا خوش عناں بنایا
رحمت سے تیری کیا کیا ہیں نعمتیں میسر/ان نعمتوں کا مجھ کو ہے قدرداں بنایا
آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے/مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا
ہر چیز سے ہے تیری کاری گری ٹپکتی/یہ کارخانہ تو نے کب رائیگاں بنایا(۵۷)

اگرچہ یہ نظم قدرت کی کاریگری بیان کر رہی ہے لیکن ماحولیاتی حوالوں سے اس پر نظر دوڑائی جائے تو اس کے اندر ایک چیز کا دوسرے سے تعلق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ سورج جو جہاں کو روشن کرتا ہے۔ پانی جو زمیں کو سیراب کرتا ہے۔ تنکے جو گھونسلے بنانے کے کام آتے ہیں۔ گائے جیسے جانور جو گوشت اور دودھ کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مچھلیاں جو پانی کے بنا تیر نہیں سکتیں۔ زمیں جو جب تک سیراب نہ ہو کوئی فصل نہیں اُگا سکتی۔ ہوا نہ ہو تو بادلوں کا آنا جانا ممکن نہ ہو۔ غرض یہ کہ پورا کائناتی نظام اور اس کی بنائی ایک ایک چیز بے کار اور بے ضرر نہیں ہے بل کہ ہر ایک کا کوئی نہ

کوئی مقصد کوئی نہ کوئی کام ہے جس کی انجام دہی میں یہ پورا ماحولیاتی نظام ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال قدرت کے ایک اور شاہکار کی صورت میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس نظم " کوہ ہمالہ " سے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب اسماعیل میرٹھی دوران ملازمت ایک پہاڑی علاقے پر کچھ عرصے کے لیے منتقل ہوئے اور انھوں نے فطرت کی اس عظیم شے کا انتہائی قریب سے مطالعہ کیا تو اس کے بعد یہ نظم لکھی۔ اشعار ملاحظہ ہوں کہ جن سے وہ مثالیں ملتی ہیں کہ ایک پہاڑ ہمالہ کتنی زندگیوں کی آمجگاہ ہے اور کئی پیڑ پودوں، جڑی بوٹیوں اور پانی کے راستوں کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے:

کوہ ہمالہ

ہے ہمالہ پہاڑ سر جیون/جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن
بیل بوٹوں سے بن رہا ہے چمن/سبز چوٹی ہرے بھرے دامن
ہے ہر اک ڈھانگ اس کی پھلواری/سرد چشمے ادھر ادھر جاری
لالہ خودرو ہے اور اس کے پاس/لہلہاتی ہے خوبصورت گھاس
سیکڑوں قسم کے ہیں پھول کھلے/پیڑ باہم کھڑے ہوئے ہیں ملے
کہیں بن مالنا کہیں بیلا/کہیں اخروٹ اور کہیں کیلا
سال کا کیا ہی خوب جنگل ہے/سورماؤں کا بن کے دنگل ہے (۵۸)

کوہ ہمالہ اگرچہ ایک پہاڑ کی صورت میں کھڑا اپنی داستان سنا رہا ہے۔ لیکن اس کا بغور مطالعہ کیا جائے یا جس طرح شاعر نے اس کے اندر بسنے والی زندگیوں کی ایک پوری تصویر کھینچی ہے اس پر غور کیا جائے تو یہاں کی دنیا ہی الگ معلوم ہوتی ہے۔ ماحولیاتی نظام کی اس جڑت کو ادب میں تلاش کرنے والے پھر بجا کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو ادب میں ان کی اصل کے ساتھ بیان کرنا ہی دراصل ان کی اصل شعریات کو بیان کرنا ہے۔ جن میں جانور، پودے، پرندے، درخت یعنی حیوانات و نباتات کو کسی ایک الگ دنیا کا سمجھنے کی بجائے انھیں اپنی ذاتی حیثیت میں بیان کرنا چاہیے اور یہی اس کی اصل خوبصورتی ہے۔ اس چیز کا جابجا بیان اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں تخلیقی تجربہ اس شے کو مصنوعی نہیں بل کہ قدرتی طور پیش کرتا ہے۔ مزید شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

وہ جو ہے ہند کا بڑا ساگر/واں سے چلتا ہے ابر کا لشکر
کوچ در کوچ روز بڑھتا ہے/پھر ہمالہ پہ آ کے چڑھتا ہے
کبھی دیتا ہے باندھ مینہ کا تار/کبھی کرتا ہے برف کی بھرمار

جا چڑھا یوں پہاڑ پر پانی/کی ہے قدرت نے کیا ہی آسانی
واں سے چشمے بہت ابل نکلے/ندی نالے ہزار چل نکلے
سندھ و ستلج ہیں مغربی دریا/اور پورب میں میگھنا گنگا
ہیں یہ دریا بہت بڑے چاروں/جن میں بہتا ہے پانی الغاروں
پس سمندر سے جو رسد آئی/یوں ہمالہ نے بانٹ کر کھائی
ہوا سر سبز ہند کا میداں/ تیری حکمت کے اے خدا قرباں(۵۹)

موسمیاتی تبدیلیاں کس طرح مختلف عناصر پر اثر انداز ہوتی ہیں اس کی ایک مثال پانی ہی لے لیں۔ جو مختلف شکلیں تبدیل کرتا کہیں بارش بن کر برس رہا ہے، کہیں برف بن کر جم رہا ہے۔ چشموں، ندی نالوں کی شکل میں تو کبھی دریا اور سمندر کی صورت بہتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پانی کو تقسیم کرنے اور مختلف جگہوں تک اس کی رسائی ممکن بنانے میں کس طرح پہاڑ اور پیڑ پودے اپنا کردار ادا کرتے ہیں اس نظام کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور غزل میں بھی ایسی ہی فطری اشیا کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے امور پر روشنی دالی گئی ہے کہ جب قدرت کا نظام کبھی بگاڑ کا شکار ہوتا ہے یا ایک چیز میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خشک سالی/ قحط کی مثال ہی لے لی جائے تو بد تر حالات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مسعود اشعر روبرٹ ایلن کے خیالات ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آسٹریا اور امریکہ مخصوص علاقے ہوں یا چلی اور شمالی افریقہ کی چراگاہیں رقبے کے حساب سے مویشیوں کی تعداد کم کرنے پر کوئی رضامند نہیں۔ جانوروں کے زیادہ چرنے اور خشک سالی کی وجہ سے زمین نا قابل اصلاح ہو جاتی ہے اور پھر ان دنوں مویشیوں کو زندہ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔(۶۰) ایسی صورت حال میں قدرت کے مظاہر آپسی تعلق سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قدرت کس طرح دوسرے مظہر کے ذریعے اس کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ کسانوں کی محنت کس طرح رنگ لاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ابر بادل ہے اور سحاب گھٹا/جس کی ہم دیکھتے ہیں آج بہار
کس کو باراں نے تازگی بخشی/زرع کھیتی ہے اور درخت اشجار
اب غریبوں کو ہو گئی تسکیں/جو کہ لیتے تھے قرض و وام ادھار
قحط ہے کال اور گدائی بھیک/ جس کے مینہ نے مٹا دیئے آثار(۶۱)

یہاں پر ماحول دوست بیری کامنز کے ماحولیات سے متعلق چار قوانین میں سے تیسرا قانون انتہائی موزوں دکھائی دیتا ہے۔ جس میں وہ انسان کے اس زعم کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں کہ انسان فطرت کو بہتر استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس

ان کا کہنا ہے کہ "فطرت اشیا کو بہتر جانتی ہے۔" یعنی اس کا مفہوم یوں نکالا جا سکتا ہے کہ فطرت اس نظام کو اس حوالے سے بخوبی جانتی ہے اور اس شے کا علم رکھتی ہے کہ کون سی شے کو کس مقصد کے لیے کب اور کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (۶۲) اس کے برعکس انسان جب اس کا ذمہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے تو نتائج نقصان کی صورت میں برآمد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے کچھ زمینیں صرف گھاس اگانے کے قابل ہوتی ہیں ان پر دیگر کاشت کر کے ان کو خراب کر دیا جاتا ہے۔ بعض زمینیں فصلوں کی کاشت کے لیے موزوں ہوتی ہیں لیکن ان پر یا تو جڑی بوٹیاں اگا دی جاتی ہیں یا اس زمین کو عمارات کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ جو جنگل بارش برسانے، پانی کو محفوظ کرنے اور زرعی علاقوں تک پہنچانے میں معاون ہوتے ہیں انھیں کاٹ دیا جاتا ہے۔ (۶۳) یعنی قدرت کے نظام سے کھلواڑ کر کے اپنی ہی زندگی کے وسائل کو محدود تر کر دیا جاتا ہے۔ جس سے واقف ہونے کے باوجود ہم اس پر توجہ نہیں دیتے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ماحولیاتی نظام کا ایک دوسرے کے لیے وسائل میسر کرنا اور ایک کے ہونے سے دوسری کی بقا کا ہونا کس طرح باہمی تعلق سے جڑا ہے۔ یہی آپسی تعلق کس کس نظام کو چلائے رکھتا ہے اس کی مثالیں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں :

جو ندی آب گیر ہے تالاب/مینہ جو برسا تو بھر گئے یک بار
نرخ ہے بھاؤ اور غلہ اناج/سستا ارزاں ہے سوق ہے بازار
مردم و آدمی بشر انسان/فضل باری کے سب ہیں شکر گزار
ہیں کشاورز کاشت کار کسان/خشک سالی سے تھے بہت ناچار
مینہ برستا رہا کئی دن رات/روز و شب صبح و شام لیل و نہار
قطرہ ہے بوند اور مینہ باراں/آب پانی ہے اور بہت بسیار (۶۴)

بادلوں، بارش کے ہونے کی وجہ سے کس طرح ایک پورے ماحولیاتی نظام کا منظر بدل جاتا ہے۔ انسانی زندگیوں میں کئی مقامات پر بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کسانوں کا طبقہ ہو یا پھر قحط کی وجہ سے متاثر ہونے والے علاقے ہوں صرف ایک پانی کی کمی پوری ہو جانے کی وجہ سے کس طرح دوبارہ اپنے اصلی رنگ و روپ میں لوٹ آتے ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی صورت لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہم کسی ایک چیز کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں یا کسی حوالے سے اس شے کی عدم موجودگی کا سامنا کرتے ہیں۔ تب ہم اس کی اہمیت اور اس کے انسانی و حیوانی زندگی میں کردار کو بخوبی طور پر جان سکتے ہیں۔ یہ نظم اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ ایک اور جگہ اسماعیل میرٹھی نے اس ماحولیاتی نظام کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے چند اشعار لکھے ہیں کہ جن کو اگر سمجھ لیا جائے تو انسان اور فطرت کے کھوئے آپسی ربط کو بحال کیا جا سکتا ہے۔

نیچر انسان کی محکوم ہے

فطرت کے مطابق اگر انساں لے کام
حیوان تو حیوان، جمادات ہوں رام
مٹی، پانی، ہوا، حرارت، بجلی
دانشمندوں کے ہیں مطیع احکام (٦٥)

اگر اس انسان کو تلاش کر لیا جائے جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکتا ہو تو فطرت اور ماحول سے ٹوٹا ہوا ربط بحال ہو سکتا ہے۔ اپنی برتری کو اس طرح ثابت کرے کہ تمام تر چیزیں اس کے ساتھ ساتھ چلیں اور ان کا آپسی تعلق بھی فطری حوالوں سے برقرار رہے۔ گلین۔ اے۔ لو اپنے مضمون میں وارِک فوکس کا قول لکھتے ہیں کہ اگر ہم صرف ماحول اور انسان کے باہمی تعلق کو اہمیت و اولیت دینے لگیں تو دنیا کا ماحول بہتر ہو جائے گا۔ (٦٦) ماحولیاتی ادبی تنقید کا پرچار کرنے والے اور اس کی ادب میں اہمیت کو اجاگر کرنے والے اسی تعلق کو تلاش کرتے ہیں اور انسانی زندگی میں اس کے مثبت کردار کے فائدے اور منفی رویوں کے نقصان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کی شاعری جس عہد میں لکھی گئی اس وقت برصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ برطانوی اصلاحات کا نفاذ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہر شعبہ زندگی پر اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ تعلیمی حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں اور اصلاحات کو تو مختلف اداروں کے قیام اور نصابی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کی شکل میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ انجمنِ پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں نے جس طرح موضوعاتی حوالے سے اردو نظم کو فروغ دینے کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی اس پر بھی بہت کام ہوا۔ جو شعری مثالیں ان مشاعروں کے تحت لکھی جانے والی نظموں کی صورت میں ملتی ہیں اس متعلق شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ "حالی و آزاد کی بیشتر نظمیں نہ تو مغربی ادب کے معیار کی تشفی کرتی ہیں نہ مشرقی شاعری کی شرائط پوری کرتی ہیں۔۔۔" (٦٧)

انجمن پنجاب کے تحت فطرت نگاری کی جس تحریک کو پروان چڑھایا گیا تھا اس کے پیچھے انگریز کی ایک مخصوص سوچ کارفرما تھی۔ ڈاکٹر رشید امجد نے بڑے واضح الفاظ میں اس حوالے سے اپنی رائے دی ہے لکھتے ہیں کہ انگریزوں کا سب سے بڑا مسلہ یہ تھا کہ انھیں مقامی آبادی قبول نہیں کر رہی تھی۔ انھوں نے ادب کو زندگی کے مسائل و معاملات سے دور کرنا تھا کیوں کہ انھوں نے جس نیچرل شاعری یا فطری موضوعات کو متعارف کروانے کی طرف متوجہ مبذول کروائی تھی وہ یک سطحی اور یک رخی تھی، اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس دور کے پورے نظام تعلیم میں فطرت نگاری کا اظہار مناظر

فطرت تک محدود رہا۔ اہم بات یہ بھی ہے جو شاعری نصاب میں شامل کی گئی وہ سولھویں صدی کی تھی جب کہ ہم انیسویں صدی میں زندہ تھے۔ چوں کہ ان کے مقاصد میں تعلیم دینا تو شامل نہیں اس کے پس پشت سیاسی عوامل کارفرما تھے لہذا انھوں نے ان معاملات میں اتنی ہی تبدیلی کی جو ان کے مقاصد کے لیے ضروری تھی۔ (۶۸)

اگرچہ اسماعیل میرٹھی نے آزاد کے کہنے پر اس انجمن کے مشاعروں کے لیے کچھ نظمیں بطور خاص لکھ کر دیں لیکن ان کی شاعری کا مجموعی مطالعہ کیا جائے تو کہیں یہ چیز اس طرح محسوس نہیں ہوتی ہے کہ انھیں دانستہ طور پر سوچ سمجھ کر ہی لکھا گیا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا کا اثر کچھ جگھوں پر دکھائی دیتا ہے جو فطری چیز ہے کہ زمانے کے ساتھ چلنے والی رسم کو لے کر چلا جائے اور اسی مطابق لکھا جائے۔ زیرِ نظر باب میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے ان مثالوں کو پیش کیا گیا ہے جو انسان کا عالم فطرت کے ساتھ ایک گہرا تعلق بیان کرتی ہیں۔ جن میں ماحولیاتی اور سائنسی حوالوں کو بھی بطور خاص دیکھا جا سکتا ہے اور اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کس طرح ایک پورے نظام کے تحت اس قدرتی / فطری ماحول سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا کسی ایک بھی عنصر کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار یا انکار اسے ادھورا بنا دیتا ہے جس کی مثالیں اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ آنے والے صفحات میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا ایک مجموعی جائزہ لیا جائے گا نیز ان سوالوں کے جواب بھی تلاش کیے جائیں گے جن پر اس مقالے کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

حوالہ جات

۱: اورنگزیب نیازی، ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء) ، ص۲۳۹۔

۲: ولیم روئیکرٹ، " ادب اور ماحولیات" ، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص۱۱۱۔

۳: مسعود اشعر (مترجم)، دنیا کو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے، روبرٹ ایلن(لاہور: پروگریسیو پبلی شرز، ۱۹۹۲)، ص۸۸۔

۴: اسماعیل میرٹھی، کلیات اسماعیل، مرتب: اسلم سیفی (دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء)، ص۵۔

۵: ایضاً۔

۶: ایضاً، ص۷۔

۷: راب نکسن، " ماحولیات اور مابعد نوآبادیات" ، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص۲۰۶۔

۸: کلیات اسماعیل، ص۳۳-۳۴۔

۹: ایضاً، ص۳۴۔

۱۰: ایضاً، ص۳۴-۳۵-

۱۱: ایضاً، ص۳۵۔

۱۲: سیفی پریمی، اسماعیل میرٹھی حیات اور خدمات (دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء) ، ص۱۲۱۔

۱۳: کلیات اسماعیل، ص۳۵-۳۶۔

۱۴: ایضاً، ص۳۶۔

۱۵: محمد اسحاق، " بچوں کی تعلیم اور ماحولیات" ، http//mzameen.com، تاریخ ملاحظہ: ۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء۔

۱۶: آیتہ اللہ جوادی، اسلام اور ماحولیات، مترجم: شیخ محمد حسنین(اسلام آباد: ثقافتی قونسلٹ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۱۷ء)، ص۴۸۔

۱۷: کلیات اسماعیل، ص۴۹۔

۱۸: ایضاً، ص۴۹-۵۰۔

۱۹: ایضاً، ص۶۷-۶۸۔

۲۰: ایضاً، ص۱۰۷-۱۰۸۔

۲۱: ایضاً، ص۵۰-۵۱۔

۲۲: نوتک بلوچ، " ماحولیاتی نظام کیا ہے" ، http/scienceurdu.wordpress.com، تاریخ ملاحظہ: ۱۹جولائی۲۰۱۴ء۔

۲۳: کلیات اسماعیل، ص۶۸۔

۲۴: ایضاً، ص۵۵۔

۲۵: ایضاً ص۵۵-۵۶۔

۲۶: عبدالرؤف نوشہری، " سائنس اور ماحول" ، مشمولہ: سائنس اور مسائل امروز (کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۲ء)، ص۱۲۷۔

۲۷: کلیات اسماعیل، ص۶۵۔

۲۸: ایضاً، ص۶۶۔

۲۹: ایضاً۔

۳۰: علی احمد فاطمی، " بچوں کی شاعری اور اسماعیل میرٹھی کی شعری جہات" ، مشمولہ: قومی زبان (اپریل۲۰۱۸ء)، ص۲۹۔

۳۱: کلیات اسماعیل، ص۳۴۳۔

۳۲: ایضاً، ص۳۴۳-۳۴۴۔

۳۳: محمد عابد ندوی، "زمین و آسمان کی پیدائش: قدرت کا عظیم شاہکار" ، http//urdunews.com، تاریخ ملاحظہ: ۱۳دسمبر۲۰۱۸ء۔

۳۴: کلیات اسماعیل، ص۳۴۴۔

۳۵: ایضاً، ص۱۱۷۔

۳۶: ایضاً، ص۱۱۷-۱۱۸۔

۳۷: ایضاً، ص۱۱۸-۱۱۹۔

۳۸: غلام حسین، " مجید امجد اور ورڈز ورتھ کی شاعری میں فطرت اور ماحول" (تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی اردو) (لاہور: منہاج یونی ورسٹی، ۲۰۱۷ء) ، ص۹۱۔

۳۹: کلیات اسماعیل، ص۱۰۹۔

۴۰: ایضاً، ص۱۰۹-۱۱۰۔

۴۱: ایضاً، ص۶۷۔

۴۲: اعزاز باقر (مترجم)، "یوم حشر کی گھڑی، ایٹمی ہتھیار، موسمیاتی تبدیلی اور بقا کے امکانات" ، مشمولہ: نوم چومسکی کے خطبات (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۲۱ء) ، ص۱۲۳-۱۳۵۔

۴۳: ایضاً، ص۶۷۔

۴۴: ایضاً، ص۱۹۵۔

۴۵: ایضاً۔

۴۶: ایضاً، ص۱۹۶۔

۴۷: ایضاً، ص۱۹۷۔

۴۸: ایضاً، ص۱۹۷-۱۹۸۔

۴۹: ایضاً، ص۱۹۸۔

۵۰: آیۃ اللہ جوادی، اسلام اور ماحولیات، مترجم: شیخ محمد حسنین (اسلام آباد: ثقافتی قونسلٹ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۱۷ء)، ص۸۳۔

۵۱: کلیات اسماعیل، ص۱۹۹۔

۵۲: ایضاً۔

۵۳: ایضاً، ص۲۰۰۔

۵۴: آیۃ اللہ جوادی، اسلام اور ماحولیات، مترجم: شیخ محمد حسنین (اسلام آباد: ثقافتی قونسلٹ اسلامی جمہوریہ ایران، ۲۰۱۷ء)، ص۵۱-۵۲۔

۵۵: کلیات اسماعیل، ص۲۷۱۔

۵۶: اورنگزیب نیازی، " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ" ، مشمولہ: تاریخ ادب اردو، ج۳، ش۱ (جنوری، مارچ ۲۰۲۱ء) ، ص۱۲۔

۵۷: کلیات اسماعیل، ص۲۷۱-۲۷۲۔

۵۸: ایضاً، ص۶۹۔

۵۹: ایضاً، ص۶۹-۷۰۔

۶۰: مسعود اشعر (مترجم)، دنیا کو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے، روبرٹ ایلن (لاہور: پروگریسیو پبلی شرز، ۱۹۹۲)، ص۴۱-۴۲۔

۶۱: کلیات اسماعیل، ص ۲۸۷۔

۶۲: اورنگزیب نیازی، " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ" ، مشمولہ: تاریخ ادب اردو، ج۳، ش۱
(جنوری، مارچ ۲۰۲۱ء) ، ص۱۰۔

۶۳: کلیات اسماعیل، ص۴۲-۴۳۔

۶۴: ایضاً، ص۲۸۷-۲۸۸۔

۶۵: ایضاً، ص۳۳۷۔

۶۶: گلین۔اے۔لو، " فطرت سے متعلق تصورات پر نظر ثانی" ، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید نظریہ و عمل (لاہور:
اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء)، ص۷۶۔

۶۷: شمیم حنفی، جدیدت اور نئی شاعری (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء) ، ص۳۸۔

۶۸: نصیر احمد ناصر، " اداریہ: نیچریت، نصاب اور تقابلی ادب"، مشمولہ: تنقید کے نئے تناظر، نصیر احمد ناصر
(راولپنڈی: صریر پبلی شرز، ۲۰۲۰ء)، ص۳۵۳-۳۵۴۔

(ماحصل)

ماحصل

اسماعیل میرٹھی کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک ہمہ جہت شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ زیادہ تر تحقیقی مقالات مضامین و کتب وغیرہ میں انھیں بحیثیت بچوں کے شاعر کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔ اس حوالے سے اردو کے بیشتر ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ہماری تاریخی و ادبی غلطی ہے کہ اسماعیل صرف بچوں کے شاعر تھے یا ان کے مخاطب صرف بچے ہیں۔ جب کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے مقاصد کم اہم دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ اس جیسے دیگر بھی کئی بیانات ملتے ہیں جن میں اس چیز کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اسماعیل میرٹھی صرف بچوں کے شاعر نہیں ہیں بل کہ ان کی شاعری اور بھی کئی جہتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ راقمہ نے اس مقالے کے ذریعے ان کی شاعری کی ایک اور تصویر کو پیش کرنے کی ابتدائی سطح پر کوشش کی ہے جو انھیں ماحول دوست اور فطرت کو اس کے اصلی روپ کے ساتھ بیان کرنے والا شاعر بناتی ہے۔ ان کی شاعری میں اگرچہ ایسی مثالیں موجود ہیں جن کا مقصد بچوں کو سکھانا، سمجھانا اور انھیں اخلاقی سبق دینا ہے لیکن جب ان کی پڑھت کا طریقہ کار بدلا گیا ہے تو وہ ایک نیا ہی مفہوم سامنے لاتی ہیں۔ راقمہ کے نزدیک اسماعیل میرٹھی کی شاعری کی ابھی بھی ایسی بہت سی پرتیں اور کئی رخ باقی ہیں جن پر کام ہونا ضروری ہے۔ ذیل میں ان کی شاعری کا مجموعی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تحقیق میں اسماعیل میرٹھی کے کلام سے اردو شاعری کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے فارسی حصے کو شامل تحقیق نہیں کیا گیا۔ شاعری کے مطالعے کی بنیاد جن سوالات پر رکھی گئی تھی ان کو لیتے ہوئے ان کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان سوالوں کے جوابات تو بخوبی مل جاتے ہیں جو تحقیقی سوالات کی صورت میں اٹھائے گئے تھے لیکن ماحولیاتی ادبی تنقید کے حوالے سے جو تنقیدی فریم ورک کی صورت میں سوال اٹھائے گئے ہیں ان میں ایک خلا موجود ہے اور تسلی بخش جوابات نہیں ملتے۔ جس کی وجہ شاید اس نئے ادبی نظریے کو سمجھنے اور اس کا کسی تحریر پر اطلاق نہ ہونا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ مزید برآں ان شعری مثالوں کی کمی بھی شامل ہے جیسا کہ انسان کا حیوانی مخلوقات سے اور ثقافت سے تعلق کے ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حیوانی مخلوقات کے ساتھ تعلق کے باب میں بیان کی گئی مثالیں اس نظریے کا بھرپور دفاع کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جس طرح اس نظریے میں انسان کے حیوانی مخلوقات سے تعلق اور اس کی اہمیت پر بات کی گئی ہے اس کی جھلک باقاعدہ طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انسان اور ثقافت کے تعلق کے باب میں اگرچہ شعری مثالیں موجود ہیں

لیکن ساتھ ہی ایک تشنگی کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس مقالے کی بنیاد جن سوالات پر رکھی گئی تھی ذیل میں ان تحقیقی سوالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے جواب پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سوالات میں:

۱:۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کس طرح کی گئی ہے؟

۲:۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں انسان کے عالمِ فطرت، حیوانی مخلوقات اور ثقافت کے درمیان تعلق کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟

۳:۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی موجودگی کے محرکات کیا ہیں؟

۴:۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات کیسے ظاہر ہوتے ہیں؟

شامل تھے۔

پہلا سوال کہ جس میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کے حوالے سے پوچھا گیا ہے۔ اس حوالے سے راقمہ کی رائے و تحقیق کے مطابق اسماعیل میرٹھی کے ہاں نظمیہ اور غزلیہ دونوں اظہار پائے جاتے ہیں۔ شاعری میں چند غزلیں ایسی ہیں جن میں مناظر فطرت کو حمدیہ اشعار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کی ایک مثال " تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا" ہے۔ چند ایک غزلوں میں کسی ایک ماحولیاتی مظہر کو لیتے ہوئے اس کے انسانی و غیر انسانی زندگیوں پر اثرات اور ان سے ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کچھ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جن میں مختلف قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ دیگر حیوانی مخلوقات کا ذکر اور ان کا انسانی زندگیوں اور اس پورے قدرتی نظام کے ساتھ ایک تعلق کس طرح سے اثرانداز ہوتا ہے کو بیان کیا گیا ہے۔ ماحولیاتی عناصر کی پیش کش میں زیادہ مضبوط حصہ نظمیہ ہے۔ جس میں عنوانات کے تحت نظموں کی مختلف اقسام کو پیش کیا گیا ہے۔ (راقمہ نے الگ الگ قسم کا نام ہر بار لکھنے کی بجائے نظم کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔) ان نظموں کا شعری بیانیہ ایک پورے ماحول اور اس میں موجود اشیا کو ان کے کردار کے ساتھ مکمل طور پر بیان کرتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی ایسی نظموں سے متعلق جو پہلے تحقیقات یا تجزیے ہو چکے ہیں ان کو مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں انھیں محض مناظر فطرت کے پیش کرتے ہوئے اس کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔ ان نظموں کا ماحولیاتی حوالہ کیا ہے یا ان کی انسانی زندگی میں کیا حیثیت ہے اس چیز کو سرسری انداز سے ایک دو جملوں کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان کا ایک دوسرا رخ پیش کیا گیا ہے جس میں نہ صرف ماحولیاتی مطالعہ کیا گیا ہے بل کہ ساتھ ہی ان کی انسانی و حیوانی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی اس پورے ماحولیاتی نظام سے جڑت کو بھی شعری حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے نیز اس ماحولیاتی نظام کے ساتھ کھلواڑ کرنے والی ان سامراجی قوتوں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جو نوآبادیاتی عہد کی دین

ہے۔ جنھوں نے ہندوستان میں جہاں ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا وہیں صنعتی و زرعی میدان میں بھی تبدیلیاں کر کے اس ماحول کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ صنعتوں کے قیام سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ، زراعت کے میدان میں فصلوں کے ساتھ کی جانے والی من مانیاں، کپاس کی فصل، افیم کی کاشت کو اپنے معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔ کارخانوں، صنعتوں، کوٹھیوں، اداروں وغیرہ کی تعمیر کے لیے گاؤں، کھیتوں، ندی نالوں کو اجاڑ کر ان پر تعمیراتی کام کرنا۔ ان سے مویشیوں کا چارہ، انسانی ضروریات اور پانی کے بہت سے ذرائع ناکارہ ہو گئے۔ ایسے ہی مسائل کو موضوع بناتی اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا مطالعہ اس نئے نظریے کے تحت کیا گیا ہے جس سے ایک نئی شعری تفہیم سامنے آتی ہے جس کو پہلے اس نظر سے تفصیلی طور پر نہیں دیکھا گیا تھا۔

اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے حوالے سے جہاں دوسرا سوال اٹھایا گیا ہے اس میں انسان کے عالمِ فطرت، حیوانی مخلوقات اور ثقافت کے درمیان تعلق کو کس طرح پیش کیا گیا ہے شامل ہے۔ زیرِ نظر تحقیق میں اس تعلق پر ہی ماحولیاتی تنقید کے بنیادی نظریات شامل ہیں کہ جن میں انسان کو جہاں اس کائنات کا مرکز مانا جاتا تھا اور بشر مرکزیت کے نظریے کو فروغ دینے والا ایک طبقہ موجود تھا وہیں ماحولیاتی تنقید سے تعلق رکھنے والوں نے اس کے مقابلے میں ارض مرکز کی اصطلاح کو متعارف کروایا ہے۔ اس متعلق ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان نے اپنی برتری کے زعم میں اس ماحولیاتی دنیا کو ہر بدلتے وقت کے ساتھ بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اس چیز کو بھول بیٹھا ہے کہ اس نظام کے بغیر اس کی زندگی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اس نظریے کا پرچار کرنے والوں نے اس زمین اور اس پر بسنے والی دیگر مخلوقات اور ماحولیاتی عناصر کی انسانی زندگی میں اہمیت و تعلق کو بیان کیا ہے اور انھیں سمجھنے اور اپنے ماحولیاتی نظام کو محفوظ بنانے کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں اس حوالے سے انسان کا عالم فطرت اور حیوانی مخلوقات کے ساتھ تعلق بڑے بھرپور انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے جنھیں الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے شعری مثالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کا ثقافت کے ساتھ تعلق کا بھی ایک باب موجود ہے لیکن اس میں ماحولیاتی حوالے سے کم شعری مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس حوالے سے راقمہ کی نظر سے پہلی بار ثقافتی ماحولیات کی اصطلاح گزری ہے جسے چند مضامین کی پڑھت کے بعد سمجھ کر مختصر طور پر واضح کیا گیا ہے اور پھر اس کا انسانی زندگی سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے میں رسم و رواج اور ثقافتی اقدار کی ذیل میں ٹھوس مثالیں موجود ہیں لیکن تحقیق کے حوالے سے بہر حال راقمہ کو ایک خلا محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں اس کے ارد گرد کے ماحول کے ساتھ اس کی تمام تر روایات و اقدار بھی شامل ہوتی ہیں جو کسی بھی

معاشرے کا ایک لازمی جزو مانی جاتی ہیں۔ ان کی بھی انسانی زندگی میں ایک الگ پہچان اور اہمیت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کو بیان کرنے کی ایک سعی اس باب کی شکل میں کی گئی ہے۔

راقمہ کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ جس میں اگر صرف ایک پانی کی مثال یا "گائے" جیسی نظم کو لیا جائے تو ان کا ماحولیاتی مطالعہ کس طرح انسانی زندگی میں اس کے تعلق کو بیان کرتا ہے اور کن کن صورتوں میں موجود ہے تو اس قدرتی نظام کی ایک الگ تصویر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انسان اس پر غور کرے تو اس کائنات کا ہر ذرہ اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس حوالے سے ابتدائی انسان اور اس کی اس قدرت کے حیوانی نظام کے ساتھ تعلق کی مختلف صورتوں کو تیسرے باب میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ جہاں پہلے وہ اس نظام سے اس قدر واقفیت نہیں رکھتا تھا اور اس کے مظاہر سے کس طرح فوائد حاصل کرتا تھا اور دوسری جانب جوں جوں ترقی ہوتی چلی گئی، انسان نے اپنی زندگیوں کو سہل بنانے کے لیے کیوں اور کس طرح اس ماحولیاتی نظام کو نقصان پہنچانا شروع کیا اس کی ایک مختصر تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں جہاں مثنویاں بھی شامل ہیں ان میں سے چند ایک کو جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ایک پورا منظر سامنے لایا جا سکے جو انسان کے ساتھ اس مظہر کے تعلق کو بیان کرتا ہے تو کچھ نظموں میں سے ان کا وہ حصہ شامل مطالعہ کیا گیا ہے کہ جس سے صرف ایک قدرتی منظر ہی نہیں بل کہ اس پورے ماحولیاتی/ قدرتی نظام کی آپسی جڑت دکھائی دیتی ہے۔ ایک کا ہونا ہی دوسرے کے ہونے کی وجہ ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر ذرہ کائنات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے نقادوں نے جہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اس پورے کائناتی نظام کا انسان کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے کہ کسی بھی ایک چیز کی کمی یا اس کا نقصان نہ صرف انسانی زندگی کے لیے بل کہ اس پورے ماحول میں بسنے والی دیگر حیات کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ایسی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس میں سے ایک " قحط سالی " کی ہی مثال کو دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا منظر سامنے لاتی ہے کہ جس سے نہ صرف انسان بل کہ چرند، پرند، پیڑ، پودے، آبی حیات غرض ہر چیز متاثر ہوتی ہے اور ایک کی کمی یا ایک کا خاتمہ کس طرح دیگر زندگیوں اور ماحولیاتی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے اس کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ثقافتی تعلق کے حوالے سے جہاں بات کی گئی ہے اس زمرے میں پیش کی جانے والی اسلامی دنوں یا تہواروں کی مثالیں دیکھی جائیں تو ایک الگ ہی معاشرتی و ثقافتی تعلق کی تصویر سامنے آتی ہے۔ جو ہماری ایک الگ پہچان اور شناخت کے طور پر موجود ہیں اور ہمیں دیگر معاشروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ ان میں ہماری اسلامی روایات اور اقدار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے سوال میں ان محرکات کا پوچھا گیا ہے جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی موجودگی کا سبب بنتے ہیں۔ اس حوالے سے دوسرے باب میں اسماعیل میرٹھی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے جن میں ان کی حیات زندگی سے ایسے واقعات کو شامل کیا گیا ہے جو ان کی ایسی شاعری لکھنے کا موجب بنے تھے۔ راقمہ سیفی پریمی کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتی ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے ہاں فطری موضوعات کی وجہ محض انجمن پنجاب کے وہ مشاعرے نہیں ہیں بل کہ ان کے آغاز سے بھی بہت پہلے وہ قلق میرٹھی کے تراجم دیکھ چکے تھے اور خود بھی انھوں نے انگریزی نظموں کے تراجم میں طبع آزمائی کی۔ اس بات کو ان کی سوانح حیات میں بیان کیا گیا ہے جس میں سیفی پریمی لکھتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی جب دوسری بار انسپکٹر مدراس لگے تو اس وقت آپ کو قلق میرٹھی کے مسٹر ٹی جے کین کے اصرار پر کیے جانے والے انگریزی نظموں کے تراجم دیکھنے کا موقع ملا۔ ان تراجم کے ذریعے سے جن موضوعات کو پڑھنے اور برتنے کا طریقہ کار دیکھا تو ان کی سوچ میں تبدیلی آئی کہ مشکل تشبیہات اور استعارات سے ہٹ کر بھی مناظر قدرت اور جذبات انسانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے خود بھی انگریزی نظموں کے تراجم کیے۔ اس کے علاوہ اس واقعے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے جب ایک دفعہ اسماعیل میرٹھی کو موسم گرما میں دوران ملازمت منصوری پہاڑ پر قیام کرنا پڑا۔ اس قیام کے دوران انھوں نے قدرت کے مظاہر کو بہت قریب سے دیکھا جن میں پہاڑ، گھاٹیاں، آبشاریں، چشمے، پھول، برسات کے مناظر وغیرہ شامل تھے۔ اس کا بیان انھوں نے اپنی نظم " کوہ ہمالہ " کی صورت میں کیا ہے۔ جس میں قدرت اس کی اپنی اصل کے ساتھ موجود دکھائی دیتی ہے۔ ۱۸۸۰ء کا یہ واقعہ بھی ایک لحاظ سے اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے ہاں یہ جو ماحولیاتی نظام سے ایک مضبوط تعلق اور اس کے مظاہر کا ایک مکمل قدرتی نقشہ ملتا ہے وہ اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے اس نظام کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔

یہ وہ محرکات تھے جو مختلف واقعات کی وجہ سے ان کی سوچ میں تبدیلی لانے کا موجب بنے۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں جدید شاعری کا جو رواج عام ہو رہا تھا اور اسماعیل میرٹھی کے ہم عصر شعرا جن میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور اکبر آلہ آبادی ان میں طبع آزمائی کر رہے تھے اس کا بھی اثر غیر دانستہ طور پر ان کی شاعری پر ہوا ہو گا۔ میرٹھ کی سرزمین کے اسماعیل میرٹھی کے ہم عصر شعرا میں قلق میرٹھی، رنج میرٹھی، شوکت میرٹھی، بیاں میرٹھی، مصطفی خاں شیفتہ مرزا رحیم بیگ وغیرہ شامل تھے۔ اسماعیل میرٹھی نے قلق میرٹھی کے ہی انگریزی نظموں کا ترجمہ پڑھ کر ان سے سیکھا۔ ان کا ذکر نور احمد میرٹھی کی کتاب تذکرہ شعرائے میرٹھ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ جس عرصے میں انجمن پنجاب کے تحت نیچرل شاعری کو فروغ دینے کی بابت

مشاعرے کیے جا رہے تھے اس عرصے میں اسماعیل میرٹھی تالیف کے کام میں مصروف تھے۔ ان مثنویوں کو بلاشبہ نہیں بھلایا جاسکتا ہے جو آپ نے محمد حسین آزاد کے کہنے پر لکھی تھیں۔ جن میں " مکھیاں، چاند، آبِ زُلال" شامل ہیں۔

چوتھا اور آخری سوال اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نو آبادیاتی اثرات کیسے ظاہر ہوتے ہیں؟ پر مشتمل ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں باب دوم میں سیاسی و سماجی پس منظر پیش کرتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری سے ان مثالوں کو بیان کیا گیا ہے جو اپنے اندر نو آبادیاتی اثرات سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے محرکات پر غور کیا جائے تو جس زمانے میں اسماعیل میرٹھی یہ شاعری لکھ رہے تھے وہ نو آبادیاتی عہد تھا۔ برطانوی حکومت ہر لحاظ سے ہر شعبہ زندگی پر ہندوستان میں اپنے پنجے گاڑھ چکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اسماعیل میرٹھی بچپن سے ہی انگریزوں کی سرپرستی میں تعلیمی سرگرمیاں سرانجام دیتے رہے تھے بل کہ ان کی نوکری بھی انگریز حکومت کے ہی زیرِ نگرانی رہی۔ ساتھ ہی انھوں نے اس دور کے مسلم راہنماؤں کی چلنے والی اصلاحی تحریکوں سے یہ سبق بھی حاصل کر ہی لیا تھا کہ اگر آگے بڑھنا ہے تو ہمیں اپنے مفاد کے لیے تعلیم کے میدان میں انگریزوں کی ہی زیرِ نگرانی اور ان کی مرضی کے بنائے اس نظام کی پیروی کرنا ہو گی۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں نو آبادکار کی طرف قبولیت کا اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ اب ہم ایک مغربی قوم کے زیرِ نگرانی ہیں اور ہمیں انھی کے ہی بنائے ہوئے نظام کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنی ہیں جسے نو آبادیاتی زبان میں انجذاب کا نام دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر نے " دوجذبی" رویے کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ جس میں وہ سرسید، حالی، نذیر احمد وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ مغربی نظام کو قبول کرنا اور اس میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنا۔ اس میدان میں ادبی اور تعلیمی حوالوں سے یہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

اسماعیل میرٹھی کے ہاں بھی یہ رویہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر ان کی شاعری میں ملکہ وکٹوریا کی شان میں تہنیتی نظمیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ساتھ ہی انگریزی حکومت پر کہیں چوٹ کا جذبہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے تو کہیں لوگوں کو یہ پیغام بھی دیا جاتا دکھائی دیتا ہے کہ اس نظام کو قبول کرنے میں ہی ان کی عافیت چھپی ہے۔ سو جہاں تک ہو سکے اپنے مفاد کے لیے اور اپنی ترقی کے لیے ان کے بنائے نظام سے فائدہ حاصل کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ جن میں سب سے پہلے نمبر پر تعلیم حاصل کرنا شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیل میرٹھی نے بچیوں کی تعلیم کے لیے ایک سکول میرٹھ میں کھولا۔ دوسرا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے ہاں جو انگریزوں کی حمایت میں نظمیں یا قصیدے دیکھنے کو ملتے ہیں وہ ارد گرد کے ماحول کا اثر بھی کہے جا سکتے ہیں کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نقصانات اگرچہ ذہنی سطح پر ہر جگہ ہوئے لیکن معاشی

سطح پر میرٹھ وہ علاقہ تھا کہ جسے اتنے بھاری نقصان کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور دوسرا انگریز حکومت نے یہاں بہت سی مثبت اصلاحات نافذ کی تھیں جس کی وجہ سے بھی اس حکومت کو اسماعیل میرٹھی ایسی دعاؤں سے نوازرہے تھے:

عیش وطرب کے ہیں یہاں چرچے
کون بھلا جبر کسی کا سہے
کیوں نہ تہ دل سے رعایا کہے
جب تک اس اقلیم میں گنگا بہے
قیصرہ الہند سلامت رہے

اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی کی شاعری پر نوآبادیاتی اثرات اور ان کی وجوہات کو باب دوم میں تفصیلی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تحقیقی سوالات کی روشنی میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے مطالعے سے ان کی وضاحت پیش کی گئی ہے وہیں طریقہ تحقیق کے فریم ورک میں اٹھائے گئے سوالات کی بھی وضاحت ضروری ہے۔

مجوزہ تحقیق کے مطالعے کے لیے جو طریقہ کار/فریم ورک استعمال کیا گیا ہے اس میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کا تجزیہ کرنے کے لیے ناصر عباس نیر کے ماحولیاتی ادبی تنقید سے متعلق اٹھائے گئے بنیادی سوالات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ان کے یہ سوالات راقمہ نے ان کے مقالے ''ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں'' سے لیے ہیں۔ یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں پہلا حصہ ماحولیاتی تنقید پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں انتظار حسین کے افسانوں کو اس نظریے کی ذیل میں دیکھا گیا ہے۔ پہلا حصہ اس نظریے کے بنیادی نکتے سے شروع ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ نظریہ بشر مرکزیت کے نظریے کو رد کرتا ہے اور ارض مرکز کو اہمیت دیتا ہے۔ جس کے مطابق صرف انسان اس کائنات کا مرکز نہیں ہے بل کہ زمین کو بھی اتنی ہی اہمیت حاصل ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بنیاد کو مثالوں کے ساتھ واضح کرتے ہوئے ناصر عباس نیر نے ماحولیاتی تنقید کے بنیادی سوال بیان کیے ہیں جس پر اس نظریے کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ راقمہ نے ان سوالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ ماحولیاتی ادبی تنقید کے بڑے اور بنیادی سوالوں میں:

ا: ادب میں ماحول کی ترجمانی کیسے کی گئی ہے؟ کس طرح فطرت کے مناظر پہاڑ، ندی، بادل، بارش، پرندوں اور جانوروں کو شاعری یا فکشن میں پیش کیا گیا ہے؟

۲: فطرت کو لاحق خطرات کا بیان ادب میں کس طور کیا گیا ہے؟ آلودگی کی جملہ اقسام کے اسباب اور انسانی صحت پر اس کے اثرات کو ادب میں کیوں کر موضوع بنایا گیا ہے؟

۳: فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمہ داریوں کو تخلیق کاروں نے بیان کیا ہے یا ان سے پہلو تہی کی ہے؟

ماحولیاتی ادبی تنقید کے ان بنیادی سوالات کی روشنی میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کو دیکھا جائے تو انھوں نے ان بیان کردہ فطری مظاہر کو زیادہ تر ان کی اصل کے ساتھ ہی پیش کیا ہے۔ بہت کم ایسی نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ان مظاہر فطرت کو بطور علامت پیش کیا گیا ہے یا جن سے کوئی اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر ان نظموں کو دیکھا جائے تو بھی وہ اپنے اصلی کردار سے ہٹتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ جہاں فطرت کو لاحق خطرات کے بیان کی بات کی گئی تو بھی ایسی نظمیہ مثالیں موجود ہیں جن میں کسی ایک قدرتی مظہر کے نقصان کا بیان اور اس سے ہونے والے اثرات کو دیگر مظاہر فطرت اور انسانی زندگیوں کے نقصانات کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے اخلاقی سبق بھی دیے گئے ہیں جن میں ان مظاہر فطرت کی قدر کرنے، ان کا خیال کرنے اور انھیں اپنے سے کمتر خیال نہ کرنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ فطرت کے تحفظ کے ضمن میں انسانی ذمہ داریوں سے آگاہی دلوانے کی بھی کچھ مثالیں موجود ہیں جن میں نہ صرف انسان کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ صرف تم ہی اس کائنات کے لیے بنیادی مرکز نہیں ہو بل کہ تمھارے ساتھ ایک پورا نظام جڑا ہے۔ جس کی ایک مثال" انسان کی خام خیالی" کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ذمہ داریوں کے ضمن میں ایک اور مثال" فطرت انسان کی محکوم ہے" کی شکل میں بھی ملتی ہے۔ جس میں انسان کو اس کرہ ارض، اس پورے ماحولیاتی نظام کو سمجھنے اور اس سے اس حد تک فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جا رہی ہے جتنی اس کی ضرورت بنتی ہے اور اس کے بے دریغ استعمال سے منع بھی کیا گیا ہے۔

ان ماحولیاتی ادبی تنقید کے بڑے سوالات کے ساتھ ساتھ ناصر عباس نیر کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان سوالات کے عقب میں بھی چند بنیادی سوالات موجود ہیں۔ ان سوالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی اہمیت صرف سرسری معلومات کی فراہمی تک رہ جاتی ہے۔ جب کہ ماحولیاتی ادبی تنقید ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے ادب میں فطرت کے اظہار کی مختلف صورتیں دیکھتی ہے جن میں:

۱: فطرت کی طرف پلٹنے کی آرزو

۲: فطرت سے ہمدردی و ہم دلی

۳: فطرت کے بقا کی سعی و خواہش

ان فطری اظہار کی صورتوں کو اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں فطرت کے ساتھ ایک تعلق بحال کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں فطرت سے دلی ہمدردی کا جذبہ جابجا شعری مثالوں کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ فطرت کی بقا میں ان کے ہاں ہر قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ جن میں چرند، پرند، پیڑ، پودے، دریا، پہاڑ، سبزہ، حشرات، حیوانی و غیر حیوانی مخلوق غرض ہر ماحولیاتی عنصر سے لگاؤ دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ان کی حفاظت، ان کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ اچھا سلوک رکھنے کا پیغام بھی دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ جہاں انسان اس دنیا کے ساتھ باہمی محبت کا سلوک روا رکھتا ہے تو یہ فطری دنیا بھی انسانی زندگی کی آسانیوں کے لیے ایک استاد کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے اس حوالے سے کہکشاں لطیف لکھتی ہیں کہ اسماعیل میرٹھی نے اپنے سادہ اور رواں انداز میں جو بھی لکھا ہے وہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ ورڈزورتھ کے نظریے کے ہمنوا ہیں اور اسی کے تحت انھوں نے nature کو teacher سے تعبیر کیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے ہاں اس کی شعری مثالیں بھی موجود ہیں۔

ان تمام بنیادی سوالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور ان کی ادب میں مختلف صورتوں کو دیکھتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں ماحولیاتی عناصر کی پیش کش کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناصر عباس نیر کے ان سوالات کے ساتھ ساتھ اس مطالعے میں ماحولیاتی ادبی نقاد اور ناروے کے فلاسفر آرنی نائیس (Arne,Naess ۱۹۱۲ء۔ ۲۰۰۹ء) کے تنقیدی نظریات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ جو اس نئے تنقیدی نظریے کی بنیاد رکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ماحولیات سے متعلق گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریات میں انسان اور ماحول کے گہرے رشتے کو واضح کیا ہے۔ ان کے بنیادی تنقیدی نظریات آٹھ نکات پر مشتمل ہیں لیکن مجوزہ تحقیق کے لیے ان کے چھ سوالات کو مد نظر رکھا گیا ہے، جس میں ایک پوری ماحولیاتی نظام سے جڑی فکر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان نظریات میں:

۱: کرہ ارض پر موجود انسانی اور غیر انسانی ہر قسم کی حیات کی بقا و فروغ فی ذاتہ قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ غیر انسانی حیات انسانی حیات کے لیے فائدہ بخش ہے یا نہیں۔

۲: زندگی کی مختلف انواع (forms) کی کثرت تہہ بہ تہہ تنوع نہ صرف مذکورہ بالا قدر و قیمت کے اثبات کا ذریعہ ہے بل کہ بذات خود بھی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

۳: انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اشد ضرورت کے علاوہ، اس کثرت اور تنوع کو کم کریں یا اسے نقصان پہنچائیں۔

۴: انسانی حیات اور کلچر کی بقا و ارتقا انسانی آبادی کی کمی سے مشروط ہے اور غیر انسانی حیات ایسی کمی کی متقاضی ہے۔

۵: غیر انسانی دنیا میں موجود انسانی مداخلت ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور یہ صورت حال روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔

٦: جو لوگ ان مذکورہ بالا نکات سے متفق ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان پر عمل در آمد کرنے کی کوشش کریں تاکہ مطلوبہ تبدیلی پیدا کی جا سکے۔

ان سوالات کی بنیاد میں آرنی نائس (Arne,Naess) کا ماحول سے متعلق ایک گہرا مطالعہ شامل ہے۔ جسے انھوں نے اپنی کتاب *Ecology Community and lifestyle :an outline of an ecosophy* میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس نظریے میں موجودہ ماحولیاتی نقصانات پر نہ صرف اپنا تجزیہ پیش کیا ہے بل کہ انسان اور ماحول کے گہرے رشتے کو بھی واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کی کوئی بھی شکل چاہے وہ جس بھی حالت میں ہو آپس میں جڑی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں بھی کیا جاتا ہے جنھوں نے Love for nature ,Safe the nature کے نعرے کا ساتھ دیا۔ ان تمام نظریات کو لیتے ہوئے اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے تجزیے میں ان سوالات کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے ایک مجموعی جائزہ لیا جائے تو آرنی نائس کے ان سوالات میں جن جن چیزوں کا ذکر شامل ہے اور ماحولیات کے حوالے سے انسانوں کو جن نقصانات کی نشان دہی کروائی جا رہی ہے اور اس کی انسانی زندگیوں میں اہمیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ وہ تمام ترجذبات اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن میں "مثنوی آب زلال" پانی کی ایک پوری داستاں بیاں کرتی ہے۔ جس میں انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کو مختلف درجوں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیسے اپنی حالتیں بدلتا ہے اور انسانی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے پھر اس کے بگاڑ کی ایک شکل پیش کرتے ہوئے انسان کو ایک پیغام دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کا بے دریغ استعمال کرے گا تو اس نعمت سے محروم ہو جائے گا۔ یہ مختصر جائزہ اس مقالے کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔

راقمہ یہاں کچھ ناقدین کی آرا کی صورت میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب خیال کرتی ہے کہ جن کے نزدیک انھیں صرف بچوں کا شاعر سمجھا گیا ہے یا پھر فطرت کی منظر کشی کرنے والے شاعر کے طور پر جانا گیا ہے۔ ماحولیاتی و نوآبادیاتی مطالعے کے بعد اسماعیل میرٹھی کی شاعری ایک نیا ہی رخ سامنے لے کر آتی ہے جو اسماعیل میرٹھی کو ایک ماحولیاتی شاعر کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ انھوں نے جو بھی لکھا ہے اس میں تخیل کی کارفرمائی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ انھیں خود بھی جھوٹ اور مبالغہ شعری سخن کے لیے ناپسند تھا۔ سوائے چند ایک نظموں کے جن میں شعری علامات کا سہارا لیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی نے آزاد و حالی

کے بعد اپنی قدیم شاعری کی جھوٹی اور مبالغے کی روایت کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے موضوعات کو شامل کیا ہے جو ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مشتمل تھے۔

وہی شاعری دیرپا اثرات رکھتی ہے اور فطری شاعری سمجھی جاتی ہے جس میں فطرت/قدرت سے جڑ کر اسے اسی طرح پیش کیا جائے جس طرح وہ اپنا اصلی وجود رکھتی ہے۔ اس لیے بھی اسماعیل میرٹھی کی نظمیں سمجھ بوجھ اور تفہیم کے اعتبار سے ایک مثبت اور قدرتی تاثر رکھتی ہیں۔ ان نظموں کی پڑھت ہی اس میں موجود شاعر کے حقیقی تجربات کو بیان کرنے کے لیے کافی ٹھہرتی ہے کیوں کہ ان کا بیان تخیلاتی دنیا سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ بچوں کو اخلاقی سبق دیتی نظمیں ہوں یا پھر ان میں بڑوں کے لیے ایک پیغام پنہاں ہو۔ جس کی طرف امیر اللہ خاں شاہیں اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسماعیل بچوں کے ساتھ ان بڑوں کے بھی شاعر تھے جو ایک بچپن سے گزر کر آتے ہیں اور اسماعیل میرٹھی کی نظمیں اس حوالے سے کسی کو مایوس نہیں کرتی ہیں۔ انھوں نے مغربی ادب سے بھی استفادہ حاصل کیا اور اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اسماعیل میرٹھی جس عہد میں پیدا ہوئے اور پھر جن حالات کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے شعری پیرائیہ اختیار کیا وہ نوآبادیاتی دور تھا۔ لکھاری کے لیے اس عہد کے تقاضوں کو سمجھنا اور پھر اسے بیان کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کچھ کے نزدیک اس حوالے سے مزاحمتی رویہ اور اظہار دیکھنے کو ملتا ہے اور چند ایسے نام بھی تاریخ میں موجود ہیں جو اس وقت کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک انھی کے ساتھ ہی چلنے میں ان کے مستقبل کی بہتری پنہاں تھی۔ اسماعیل میرٹھی نے دوسری راہ اختیار کی۔ نہ صرف مغربی ادب سے اثر قبول کیا، اس وقت کی ضرورتوں کو سمجھا بل کہ انھیں اپنی تحریروں کا حصہ بھی بنایا۔ جن کا مقصد عوام کو ایک مثبت پیغام دیتے ہوئے انھیں مضبوط بنانا تھا۔ اس حوالے سے ان کی نثری اور شعری دونوں خدمات قابلِ تعریف ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے موضوعات کے حوالے سے بات کی جائے تو اس حوالے سے وسیم حسن راجا اپنے خیالات بیان کرتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کے موضوعات ماحول کا براہ راست انداز پیش کرنے کی بجائے بین السطور اصلاح معاشرہ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ (جس کا ذکر ہم ناصر عباس نیر اور آرنی نائس کے سوالات میں بھی دیکھتے ہیں کہ فطرت کے ضمن میں انسانی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انھیں کیسے سمجھنا اور بیان کرنا ہے۔) انھوں نے ہندوستانی جانوروں، پرندوں، مظاہر فطرت، گھریلو اشیا، مقامی و ارضی ماحول اور آب و ہوا غرض یہ کہ انسانی زندگیوں کے ساتھ جڑی ہر شے کا نہ صرف ذکر کیا ہے بل کہ ان کے تحت سوچ کے نئے راستے واضح کیے ہیں اور ادراکی صلاحیت کو بیدار کیا ہے، جو ارد گرد کی اشیا و مناظر سے اخلاقی سبق و نصیحت لینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ان کی شاعری کا ماحولیاتی مطالعہ جس طرح انسان کے اس پورے نظام سے تعلق کو واضح کرتا ہے وہ کسی بھی حوالے سے من گھڑت یا تخیل کی کارفرمائی معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک فطری روانی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انھوں جو بھی اپنے ارد گرد مشاہدہ کیا ہے وہ عام زندگی کا اصلی روپ ہے اور اسے اسی مناسبت سے بیان کیا ہے۔ تبھی ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی متعلق کوثر مظہری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا اگر آزاد اور حالی کی نظموں سے موازنہ کیا جائے تو ان کی نسبت مجھے اسماعیل میرٹھی کے ہاں روانی، جاذبیت اور اصلیت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں اس اصلیت کو جہاں دیگر ناقدین نے قبول کیا ہے وہیں اسے ان کی شاعری کا ایک وصف خیال کیا ہے۔ جو ایک سچے شاعر کی نشانی کہلاتا ہے۔ بہت سوں کے ہاں اس حقیقت کو قبول کرنے کا رجحان نہیں ملتا۔ اس حوالے سے خود بھی اسماعیل میرٹھی کی شاعری و سخن سے متعلق تنقیدی آرا کو دیکھا جائے تو انھیں ممتاز احمد نے شعری حوالے دے کر لکھا ہے مثال کے طور پر وہ شاعر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا کے ہاں عشق و محبت کے سوا کوئی دوسرا مضمون ہی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور نہ ہی انھیں قدرت کے شاہکاروں اور ان کے نیرنگ سے کچھ لینا دینا ہے۔

حکمت و قدرت کے نیرنگ سے واسطہ نہ رکھنے والے شاید ان سے پہلے کے دور کے شاعر حضرات تھے جو تشبیہات و استعارات کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ جن کے نزدیک عشق و عاشقی کے مضامین بیان کرنا ہی شاعری تھا۔ پھر چاہے اس کے لیے انھیں کتنا ہی رنگین پیرائیہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ پھر قدرت سے جڑی ایسی کی مثالیں دیکھنے کو ملیں جن میں گلاب کی پنکھڑی کو محبوب کے ہونٹوں سے جوڑا گیا، چاند سا مکھڑا دکھائی دینے لگا، ہرنی جیسی چال چلی گئی، کوئل سی آواز ہو گئی اور ایسے ہی کئی بیانیے سامنے آئے۔ حال ہی میں اورنگزیب نیازی صاحب کا ایک مضمون " مجید امجد کی نظمیں: ایک ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ " کے عنوان سے آیا ہے۔ جس میں ان کا یہ بیان کہ اردو میں اگر کسی شاعر کو فطرت، مقامیت اور ماحولیات کے اعتبار سے مکمل کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف مجید امجد ہیں۔

راقمہ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے ماحولیاتی مطالعے کے بعد اس بیان کو ایک مہابیانیہ ضرور کہہ سکتی ہے۔ کیوں کہ اگر اس حوالے سے اسماعیل میرٹھی اور مجید امجد کے ادوار کو دیکھا جائے اور اس چلی آنے والی شعری روایت کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا فرق موجود ہے۔ شعری حوالے موجود ہیں۔ اس حوالے سے ہونے والی تبدیلیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس زمرے میں اسماعیل میرٹھی کی شاعری کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے اور ان کی فطری، دیہی، مقامی اور ماحولیاتی شاعری کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے راقمہ کوئی مہابیانیہ دینا ضروری خیال نہیں کرتی ہے

لیکن اس نئی شعری تفہیم سے جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں اسماعیل میرٹھی نے ان سب سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ تلاشی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے ہاں ایسے عشقیہ مضامین نہیں ملتے لیکن ایسی چند مثالیں ہی موجود ہیں جنھیں غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں شاعری کا ایک بڑا حصہ ان کی دیہی شاعری پر مشتمل ہے۔ انھیں دیہی شاعری ماننے والے بہت سے ناقدین موجود ہیں جن میں کلیم الدین احمد، سلام سندیلوی، عبدالقادر سروری وغیرہ شامل ہیں۔ عبدالقادر سروری کے نزدیک اسماعیل میرٹھی کے موضوعات اور نظموں کی فضا دیہی ہے اور ان سے مل کر جو شاعری وجود میں آئی ہے وہ اردو کے لیے بالکل نئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس حوالے سے ایک متفرق رائے بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو سید اعجاز حسین کی ہے۔ لکھتے ہیں اسماعیل میرٹھی اردو شاعری میں دیہی موضوعات کو لانا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں برسات، گرمی، صبح کی آمد، وغیرہ جیسی نظمیں موجود ہیں۔ اس حوالے سے نظم طباطبائی نے بھی طبع آزمائی کی تھی مگر اس طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ تحریک عام نہ ہو سکی۔ یہ بیان اس حوالے سے ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انھیں جو وجہ شہرت ملنا شروع ہوئی اور پھر مقبول عام کا درجہ اختیار کر گئی وہ درسی کتب لکھنے والے مصنف یا پھر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے تھی۔ ایک اور تصویر یہ بھی سامنے آئی کہ انھیں بطور ایک فطرت نگار کے بھی متعارف کروایا گیا لیکن اس نکتے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا کہ ان کی شاعری کے جس حصے کو منظر نگاری یا فطرت نگاری کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے وہ دراصل کن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا بیان ہندوستانی معاشرے کے وہ علاقے ہیں جس کا تعلق کسان سے ہے، زراعت سے ہے، جہاں زندگی آلودگی، کارخانوں کے شور سے کچھ پاک ہے اور جہاں قدرت اپنے اصل روپ کے ساتھ موجود ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے اس بیان کو نہیں جھٹلایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے دیہات کے مثالی تصور پر بات کی ہے۔ ان کے مطابق یہ تصور صنعتی انقلاب کے بعد ہمارے ہاں تبدیل ہونا شروع ہوا تھا۔ جس کی ایک بڑی وجہ ٹیکنالوجی کا ہونا اور شہر و گاؤں کے درمیان ہونے والے فاصلے تھے جن کی وجہ سے دیہی معاشرے میں ایک دراڑ ڈل گئی اور اس کے بعد " جدید تہذیب کے استعماری عزائم دیہاتی انسان اور فطرت کے قدیمی رشتے پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو گئے۔"

اسماعیل میرٹھی کے ہاں اس دیہی ماحول کے ساتھ انسان کا ایک قدیمی تعلق کافی حد تک بحال دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ثقافتی مظاہر، حیاتیاتی مقامیت، مقامی فطری نظام کے ساتھ انسان ایک انوکھے تعلق کے ساتھ جڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے یا دیہات کی وہ تصویر ہے جس میں انسان بے جان اشیا سے لے حیوانی اور فطری مظاہر کے ساتھ محبت اور احساس کے تعلق کے ساتھ نہ صرف جڑا دکھائی دیتا ہے بل کہ اس چیز کی بھی آگہی رکھتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا وجود ادھورا

ہے۔ چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی انسان خود کو ان سے جدا نہیں کر سکتا ہے کیوں کہ ان کے بنا اس کا وجود، ارتقا اور اس کی بقا ادھوری رہ جاتی ہے۔ جس کو سامنے لانے کی ایک سعی راقمہ نے اس مقالے کی شکل میں کی ہے کہ جسے ماحولیاتی و نوآبادیاتی حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد بھی ادب میں ایسی تحریروں کو سامنے لانا ہے جہاں قدرت / ماحول کا انسان کے ساتھ ایک تعلق محسوس ہو۔ اس پورے نظام کی اس اہمیت کو سامنے لایا جاسکے کہ جس کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے بہت سے ناقدین کے ہاں یہ رائے ابھی بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے کلام کو پھر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۷۶ء میں سامنے آنے والا سیفی پریمی کا یہ بیان کہ اسماعیل میرٹھی ہمارے مایہ ناز مشاہیر میں سے ہیں جن کی ادبی خدمات نے اپنے دور کے مذاق اور مزاج کو تبدیل کرنے میں ایک تاریخی خدمت انجام دی۔ ان کی شاعرانہ اور نثری خدمات کا اعتراف ہماری ادبی تاریخ کا ایک ناگزیر فریضہ ہے۔ اور پھر اتنے عرصے کے بعد اسی سے ملتا جلتا صبیحہ ناز کا بھی ایک بیان ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والے ان کے مقالے میں ملتا ہے کہ اسماعیل میرٹھی کو صرف بچوں کے شاعر تک محدود کر دینا ایک مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس بات کی ضرورت محسوس کی جانی چاہیے کہ ان کے فکر و فن کے ہمہ جہت پہلوؤں کو دیکھا جائے اور ان کی نئی جہات کو سامنے لایا جائے تاکہ ادبی دنیا ان کے ہر رخ سے آشنا ہو سکے۔

جہاں اسماعیل میرٹھی کے کلام سے متعلق تہنیتی بیانات دیکھنے کو وہیں ایسی آرا بھی موجود ہیں جو ان کی اردو شعری سرمائے میں اضافے کو سرے سے مانتے ہی نہیں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری کے ایک حصے کے حق میں تعریفی کلمات بھی ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ راقمہ کے نزدیک اس کی ایک بہترین مثال کلیم الدین احمد ہیں۔ جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے دیہی حصے کو بصد شوق قبول بھی کرتے ہیں۔ اس چیز کا اعتراف بھی کرتے ہیں ان کے ہاں جو تصویریں موجود ہیں وہ خیالی یا مصنوعی نہیں ہیں بل کہ شاعر نے انھیں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان کے ہاں سادگی جھلکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے تخیل میں نہ تو گہرائی تھی اور نہ ہی بلند پروازی۔ ان کی نظمیں شان و شوکت سے عاری ہیں۔ جو چیز وہ بیان کرتے ہیں اس کا اثر نہیں ہوتا اور اس کی مثال میں وہ ان کی نظم " تاروں بھری رات " کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ یہیں راقمہ اس کی ذیل میں حسن الدین احمد کی اس رائے کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتی ہے کہ جس میں انھوں نے اسماعیل میرٹھی کی اس نظم کے ترجمے کو آزاد، محی الدین، عزیز نجمی، امتیاز علی عرشی وغیرہ کے کیے گئے ترجموں میں سے سب سے افضل گردانا ہے۔ اور اسی ایک حوالے کی ذیل میں کلیم الدین احمد نے نہ صرف اس نظم کے بیانیے کو ادنی قسم کا کہا ہے بل کہ ان کی ذہنیت کو بھی اسی زمرے میں شمار کرتے ہوئے ان کے داخلی جذبات سے انکار اور خارجی جذبات کو

سطحی قرار دیا ہے۔ ساتھ یہ بھی کہہ گئے کہ اسماعیل میں کوئی زبردست شخصیت بھی نہیں۔ اگر کلیم الدین احمد صاحب ان بیانات کے حق میں ٹھوس دلائل بھی دیتے تو ان کو ماننا قدرے مشکل ہی دکھائی دیتا ہے۔ راقمہ کے نزدیک کسی بھی محقق کے لیے اس کے سامنے پہلے سے موجود کیے گئے کام موجود ہوتے ہیں جن سے وہ مدد لے سکتا ہے اور انھیں بطور حوالہ پیش کرتے ہوئے اپنی بات کو ثابت کر سکتا ہے لیکن ان کے ہاں ایسی کوئی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ اسے تحقیق کی کمی ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایسے ہی بیانات کو دیکھتے ہوئے شاید گزشتہ ایک دو سالوں میں اسماعیل میرٹھی کے کام کے حوالے سے نئے مقالات بھی لکھے گئے اور توسیعی خطبات وسیمینارز بھی منعقد کروائے گئے جن میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ان کے کلام کی ادبی حیثیت کو اس کی نئی پڑھت اور تفہیم سے ہی سامنے لایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی کے اس بیان کو جو ایک توسیعی خطبے میں پڑھا گیا تھا اور جسے بعد میں مقالے کی صورت میں شائع کروایا گیا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی کا موسم اور فطرت سے لگاؤ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے ان کی شاعری کو توجہ سے نہیں دیکھا ہے۔ ادبی دنیا ان کی شاعری کو بچگانہ شاعری سمجھ کر آگے بڑھ گئی اور یہ بھول گئی کہ اس قسم کی شاعری کی فکر، خاندانی، انسانی، سماجی افادیت اور مقصدیدیت بالکل الگ ہے۔ ہمیں ان امور کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے جو اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا خاصا ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ابھی بھی ان کی شاعری کی تفہیم میں بہت سی پرتیں کھولنا باقی ہیں۔ جن میں ان کی غزلیں بھی شامل ہیں اور ساتھ ہی ان کی شاعری کا فارسی حصہ بھی یقیناً اہمیت کا حامل ہوگا جس پر شاید کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ راقمہ کی ایک کوشش اس مقالے کی صورت میں پیش خدمت ہے کہ جس میں ان کی نظموں کی وہ تفہیم جو صرف بچوں کی شاعری، اخلاقی شاعری اور مناظر فطرت کے بیان کے ساتھ جڑی تھی اب ایک نئی تفہیم اسے پورے ماحولیاتی نظام کے ساتھ جوڑتی ہے اور نوآبادیاتی عہد کے مسائل میں سے ایک اہم موضوع کے ساتھ جڑ کر انسانی زندگیوں میں ان کے کردار اور اہمیت کو بھی بخوبی بیان کرتی ہے۔ ان کی یہ نظمیں صرف اخلاقی سبق دینے تک محدود نہیں ہیں بل کہ یہ پورے سماج کو جوڑ کر رکھتی ہیں اور مکمل سماجی تناظر کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری بلاشبہ یہ حق رکھتی ہے کہ اسے سنجیدگی سے پڑھا جائے تاکہ کئی دہائیوں سے چلنے والی ایک جیسی رائے کو بدلا جاسکے اور اس میں کسی نئے رخ کا اضافہ کیا جاسکے۔

(ماخذات)

ماخذ

احمد، حسن الدین۔ انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ حیدر آباد: نیشنل پریس چار کمان، ۱۹۸۴ء۔

اسحاق، محمد۔ ’’بچوں کی تعلیم اور ماحولیات‘‘۔ http//mazameen.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء۔

اشعر، مسعود۔ دنیاکو تباہی سے کیسے بچانا چاہیے۔ رابرٹ ایلن۔ لاہور: مشعل بکس، ۱۹۹۲ء۔

احمد، کلیم الدین۔ اردو شاعری پر ایک نظر (جدید دور)۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۲۰۱۷ء۔

انصاری، سعید۔ بچوں کے اسماعیل۔ دہلی: مکتبہ جامع، ۱۹۳۴ء۔

اسماعیل، محمد۔ کلیات اسماعیل میرٹھی۔ میرٹھ: دی اورینٹل پبلشنگ کمیٹی، ۱۹۱۰ء۔

" اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات: اطفال کے حوالے سے"۔ http//m.dailyhunt.in/news/india/urdu۔ تاریخ ملاحظہ: ۹فروری۲۰۱۸ء۔

"انسان نے کیسے اور کیوں بولنا سیکھا'۔ http//bbc.com/urdu/vert-cap۔ تاریخ ملاحظہ: ۲جون۲۰۱۹ء۔

امجد، ساجد۔ اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔ کراچی: آر آئی پرنٹرز، ۱۹۸۹ء۔

اختر، سلیم۔ اردو کی مختصر ترین تاریخ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۱۹۷۱ء۔

اختر عزیز، وہاب۔ ڈکشنری آف سائنس۔ لاہور: اظہر پبلی شرز، س ن۔

اشرفی، وہاب۔ مابعد جدیدت (مضمرات و ممکنات)۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء۔

اے۔ لو، گلین۔ " فطرت سے متعلق تصورات پر نظر ثانی"۔ مشمولہ: ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)۔ (مترجم) اورنگزیب نیازی۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

بھٹی، نثار علی ۔ " ثقافت اور تہذیب کے مفاہیم کا معنوی وصوری جائزہ"۔ http//humsub.com.pk۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۸اپریل۲۰۲۱ء۔

بریلوی، عبادت۔ جدید شاعری۔ لاہور: اردو دنیا، ۱۹۶۱ء۔

ایضاً۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء۔

بابر اعوان، الیاس۔ " تناظر: ایک ماحولیاتی تنقیدی تجزیہ"۔ مشمولہ: سہ ماہی کاروان۔ ج۴۶۔ ش۱(جنوری تا مارچ، ۲۰۱۸ء)۔ ص ۱۴-۲۱۔

ایضاً ۔ (مترجم)۔ بنیادی تنقیدی تصورات (تھیئری، تناظرات)۔ لاہور: عکس پبلیشرز، ۲۰۱۸ء۔

ایضاً۔ " نوآبادیات اور لکھاری"۔ http//naibat.pk۔ تاریخ ملاحظہ: ۳مارچ۲۰۱۸ء۔

بخش، سلطانہ۔ ”بچوں کا ادب کیا ہے“۔ http//www.dunya.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۰ جون ۲۰۱۷ء۔

باقر، اعزاز (مترجم)۔ نوم چومسکی کے خطبات۔ لاہور: مشعل بکس، ۲۰۲۱ء۔

بخش، مولا۔ " ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ"۔ مشمولہ: ہمارا ادب (۲۰۱۳-۱۴ء)۔ ص ۱۳۳-۱۷۲۔

ایضاً۔ " مراثیِ انیس اور ماحولیاتی تنقید" ۔ مشمولہ: انیس اور انیس شناس۔ (مرتبہ) حسن مثنی۔ دہلی: حسامی بک ڈپو، ۲۰۱۳ء۔ ص ۱۹۱-۲۰۸۔

بلوچ، نوتک۔ ”ماحولیاتی نظام کیا ہے“۔ http//scienceurdu.wordpress.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۹ جولائی ۲۰۱۴ء۔

بیگم، رضوانہ۔ ”بچوں کے ادیب اسماعیل میرٹھی“۔ http//www.jahan-e-urdu.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۱ دسمبر ۲۰۱۷ء۔

پریمی، سیفی۔ اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات۔ دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، ۱۹۷۴ء۔

پروین، رئیسہ۔ ”اسماعیل میرٹھی“۔ http//www.sol.du.ac.in/mod/book/viewphp۔ یونی ورسٹی آف دہلی۔

پاریکھ، رؤف۔ اسماعیل میرٹھی (انتخاب کلام)۔ کراچی: آکسفورڈ یونی پریس، ۲۰۱۲ء۔

پوری، نیاز فتح۔ "حیات و کلیات اسماعیل میرٹھی"۔ مشمولہ: نگار۔ ج ۳۶۔ ش ۳ (ستمبر ۱۹۳۹ء)۔

تشنہ، نذیر احمد۔ بچوں کے اسماعیل۔ لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۶ء۔

ٹوئن، مارک۔ (Twain,Mark)۔ " The Damned Human Race"۔
https://moodyap.pbworks.com/f/Twain.damned.pdf

ثاقب، عارف۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعرے۔ لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۱۹۹۵ء۔

" ثقافتی ماحولیات، یہ کیا ہے، کیا اس کا مطالعہ ہوتا ہے اور تحقیق کے طریقے"۔
http//Ur.nsp-ie.org/ecologia-cultural۔ تاریخ ملاحظہ: جون ۲۰۲۱ء۔

" ثقافت اور معاشرتی اقدار و ثقافت اور تہذیب کا باہمی تعلق"۔ http//minhajbooks.com۔
تاریخ ملاحظہ: مئی ۲۰۲۱ء۔

جالبی، جمیل۔ تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

ایضاً۔ قومی انگریزی اردو لغت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء۔

ایضاً۔ "جدید دور کا ارتقا"۔ مشمولہ: تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۰۱۲ء۔

جرج، گریرڈ (Garrard,Greg)۔ *Ecocriticism*۔ لندن: روٹلیج ٹیلر اینڈ فرانسز، ۲۰۱۲ء۔

چیپ مین، جے۔ ایل اور ایم۔ جے ریائس۔ *Ecology,principles and applications* ۔
کیمبرج: یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء۔

حالی، الطاف حسین۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۰۱ء۔

حسین، شگفتہ۔ " طاہرہ اقبال بحیثیت ایکو فیمنسٹ"۔ مشمولہ: جرنل آف ریسرچ۔ ج۳۸۔ ش۱ (جولائی، ۲۰۱۹ء)۔ ص، ۳۴-۴۶۔

حسین، سید اعجاز۔ ادبی رجحانات۔ آلہ اباد: اسرار کریمی پریس، ۱۹۴۳ء۔

حسن، ظفر۔ سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۳ء۔

ایضاً۔ "تصورِ فطرت"۔ مشمولہ: سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت۔ لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۳ء۔

حنفی، شمیم۔ جدیدت اور نئی شاعری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

حسین، غلام۔ " مجید امجد اور ورڈز ورتھ کی شاعری میں فطرت اور ماحول" (تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی اردو)۔ لاہور: منہاج یونی ورسٹی، ۲۰۱۷ء۔

حقانی القاسمی۔ " مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور"۔ مشمولہ: ماہنامہ اردو دنیا (نومبر ۲۰۱۹ء)۔

خان، ممتاز احمد۔ اردو شعرا کا تنقیدی شعور۔ پٹنہ: بہار اردو رائیٹر سرکل، ۱۹۷۲ء۔

خان، مہر۔ ''مولوی اسماعیل میرٹھی صاحب کا تعارف اور کلام''۔ http//onlineurdu.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء۔

دہلوی، عادل اسیر۔ ہندوستانی ادب کے معمار اسماعیل میرٹھی۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۸ء۔

درویش، صلاح الدین۔ تنقید اور بیانیہ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء۔

ڈکشنری۔ http//Cambridge.org/definition/colonialism۔

ذوالفقار، غلام حسین۔ اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر۔ لاہور: مطبع جامع پنجاب، ۱۹۶۶ء۔

ردولوی، شارب۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات۔ لاہور: بھٹی سنز پبلی شرز، ۱۹۹۴ء۔

رضوی، رباب۔ ''انسان اور ماحول ایک جغرافیائی تجزیہ''۔ مشمولہ: قومی زبان۔ ج۵۷، ش۲ (جون ۱۹۸۲ء)۔ ص۶۳-۶۸۔

رشید الاسلام۔ ''بچوں کی شاعری کے امتیازات اور اسماعیل میرٹھی کے عنوان پر توسیعی خطبہ''۔ http//Urdu chauthiduniya.com۔ ۲۰ دسمبر ۲۰۱۷ء۔

راجا، وسیم حسن۔ ''اسماعیل میرٹھی بحیثیت موضوعاتی شاعر''۔ مشمولہ: اردو ریسرچ جرنل ۔ ش۱۲ (۱۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء)۔ http//www.urdulink.com/urj،

رانا، ایس۔ وی۔ ایس۔ *Essentials of Ecology and Environmental Science*۔ نئی دہلی: جے پرنٹ بیک پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۹ء۔

رانی، ذکیہ۔ " مولانا الطاف حسین حالی کے تین نکات کا ماحولیاتی تناظر اور انجمن پنجاب کے مناظمے (تجزیاتی مطالعہ)"۔ مشمولہ: زبان و ادب۔ ش۲۴ (جنوری تا جون، ۲۰۱۹ء)۔ ص۴۹-۵۹۔

روئیکرٹ، ولیم۔ "ادب اور ماحولیات"۔ مشمولہ: ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)۔ (مترجم) اورنگزیب نیازی۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

رابر، کیرن (Raber, Karen)۔ "Recent ecocritical studies of English renaissance literature"۔ http//www.asle.org/essays،

زیدی، ناظر حسن۔ "نظم نگاری"۔ مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد چہارم)۔ لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء۔

زادہ، شیریں۔ رسول اکرم ﷺ اور علم حیوانات۔ لاہور: حرا پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء۔

سورین، آرزو چفت۔ " یشار کمار کے ناول سمندر میں ماحولیات کے مسائل"۔ مشمولہ: الماس۔ ش ۲۰۔ (۲۰۱۸ء)۔ ص ۷۱-۷۶۔

سندیلوی، سلام۔ اردو شاعری میں منظر نگاری۔ لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۸ء۔

سندیلوی، شجاعت علی۔ جواہرات اسماعیل۔ لکھنو: سرفراز پریس، ۱۹۵۸ء۔

سیفی، اسلم۔ حیات اسماعیل۔ دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء۔

سیفی، محمد اسلم۔ کلیات اسماعیل (حصہ سوم)۔ لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۱ء۔

سرفراز، ثقلین۔ " ثقافت و تہذیب کیا ہے"۔ http//aikrozan.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۶ جنوری ۲۰۲۰ء۔

سروری، عبدالقادر۔ جدید اردو شاعری۔ حیدر آباد دکن: مطبع انجمن امداد باہمی، ۱۹۳۲ء۔

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۵ء۔

سبط حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقا۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء۔

سکسینہ، رام بابو۔ تاریخ ادب اردو۔ لاہور: سیونتھ سکائی پبلیشرز، ۲۰۱۴ء۔

سہیل، عامر۔ جدید اردو شعری تناظر میں مجید امجد کی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۰-ء۔

سہیل، احمد۔ "ماحولیاتی ادبی تنقید کا نظریہ اور اردو شاعری"۔ https://www.punjnud.com۔ (۲۰۱۸ء)۔

سٹین فورڈ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی۔ "Colinialism"۔ plato.standford.edu/entries/Colonialism۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۹ اگست ۲۰۱۷ء۔

سبرا ہمنیم، این۔ ایس اور اے۔ وی سمبا مورتی۔ *Ecology*۔ نیو دہلی: نارو سا پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء۔

شمسی، نصرت۔ بچوں کے شاعر اسماعیل میرٹھی۔ یوپی: انجمن سٹریٹ قومی کونسل برائے فروغ قومی زبان اردو، ۲۰۱۶ء۔

شاہیں، امیر اللہ خاں۔ " اپنے وطن نغمہ گر: اسماعیل میرٹھی"۔ مشمولہ: تحقیق و تنقید۔ دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء۔

شائق، شبیر۔ کلیات اسماعیل میرٹھی۔ لاہور: برائٹ بکس، ۲۰۱۱ء۔

صدیقی، نوراحمد۔ تذکرہ شعرائے میرٹھ۔ کراچی: سہیل پریس، ۲۰۰۳ء۔

ضیاءالحسن۔ " اردو ادیبوں کا فطرت سے بدلتا ہوا تعلق: چار صدیوں کے تناظر میں"۔ مشمولہ: بنیاد۔ ج۶(۲۰۱۵ء)۔ ص۳۷۷-۳۹۰۔

عتیق اللہ۔ " پروین شیر کی شاعری ایک ماحولیاتی مطالعہ"۔ مشمولہ: جدید ادب۔ ش۱۸ (۲۰۱۱ء) ۔

عقیل احمد، شیخ۔ "قدیم ہندوستانی فلسفہ اور کالی داس کی تخلیقات میں ماحولیاتی اشارے"۔ مشمولہ: الماس۔ ش۱۹(۲۰۱۷ء)۔ ص۷-۲۱۔

علی، مبارک۔ برطانوی ہندوستان۔ کراچی: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء۔

ایضاً۔ برطانوی راج : ایک تجزیہ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔

ایضاً۔ پتھر کا زمانہ۔ لاہور: تاریخ پبلی شرز، ۲۰۱۹ء۔

ایضاً۔ کانسی کا زمانہ ۔ لاہور: تاریخ پبلی شرز، ۲۰۱۹ء۔

ایضاً۔ لوہے کا زمانہ ۔ لاہور: تاریخ پبلی شرز، ۲۰۱۹ء۔

علی شاہ، سید کاشف اور مراد، رخشندہ۔ " ماحولیاتی انصاف اور مجید امجد کی شاعری(ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ)۔ مشمولہ: الماس۔ ج۲۔ ش ۲۳ (۲۰۲۰ء)۔ ص۶۶-۸۱۔

عارف، نجیبہ۔ اسلام پاکستان اور مغرب۔ اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۱۵ء۔

ایضاً۔ " اکیسویں صدی کے ماحولیاتی مسائل: اسلامی تناظر" ، مشمولہ: اسلام پاکستان اور مغرب۔ اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۱۵ء۔

علیم، شاداب۔ نظم جدید کی تثلیث۔ میرٹھ: پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء۔

ایضاً۔ جدید شاعری کا نقطہ آغاز اسماعیل میرٹھی۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء۔

ایضاً۔ "پیش گفتار"۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم۔ فل اردو۔ مشمولہ: جدید شاعری کا نقطہ آغاز اسماعیل میرٹھی۔ شاداب علیم۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۱۱ء۔

ایضاً۔ ’’جدید ذہن کا قدیم شاعر اسماعیل میرٹھی‘‘۔ http//www.aalamiparwaz.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۲فروری ۲۰۱۳ء۔

علی، محمود۔ کائنات اور اس کے مظاہر۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۲ء۔

علی، سبین۔ ’’اداریہ‘‘۔ مشمولہ: دیدبان۔ ش۳(۲۰۱۶ء)۔

عالم، خورشید اور نذیر، حماد۔ "The Politics of Environmentalism: An Ecological Study of Twilight in Delhi"۔ مشمولہ: بازیافت ۔ ج۳۲ ۔ ش۱ (۲۰۱۸ء)۔

عبدالوحید۔ جدید شعرائے اردو۔ لاہور: فیروز سنز، س ن۔

غزالی، سرور۔ " اردو ادب میں فطری ماحول کے اثرات" ۔ دھنک (لندن) http//www.dhanaklondon.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۰۱۸ء۔

فرمینز، کرسٹوفر۔ "فطرت اور خاموشی"۔ مشمولہ: ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)۔(مترجم) اورنگزیب نیازی۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

فیضی، عنایت اللہ۔ ’’ادب اور ماحولیات‘‘۔ http//urdu.pamirtimes.net۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء۔

فاطمی، علی احمد۔ ’’بچوں کی شاعری اور اسماعیل میرٹھی کی شعری جہات‘‘۔ مشمولہ: قومی زبان۔ ج ۹۰، ش ۴ (۲۰۱۸ء) ۔

قتیجی، نسترن احسن۔ ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۶ء۔

" فطرت، ثقافت، تقسیم"۔ http//ur.kyaaml.org۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۵ جون ۲۰۲۱ء۔

قادری، نعیم الاسلام (مرتب)۔" مولانا اسماعیل میرٹھی اوران کی شعری وادبی خدمات"۔ مشمولہ: نگارشات۔ یوپی: جمیع طلبہ و طالبات جامعہ الشمس گھوسی، ۲۰۱۴ء۔

قاسمی، ناہید۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲ء۔

قریشی، عزیز احمد۔ جدید تنقیدی زاویے۔ کشمیر: شاہین بک سٹال، ۱۹۲۰ء۔

کاشمیری، حامدی۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ دہلی: خواجہ پریس، ۱۹۶۸ء۔

ایضاً۔" روایت کی توسیع"۔ مشمولہ: جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ دہلی: خواجہ پریس، ۱۹۶۸ء۔

گلاٹ فیلٹی، شیرل۔" "Literary studies in age of Environmental crisis"۔ مشمولہ: *The Ecocriticism Reader*، (مرتبہ) شیرل گلاٹ فیلٹی، ہیرولڈ فروم۔ لندن: جارجیا پریس، ۱۹۹۶ء۔

گلیڈوِن، ڈریک (Gladwin, Derek)۔ "ایکوکرٹی سزم"۔ http//www.oxfordbibliographies.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۶ جولائی ۲۰۱۷ء۔

لطیف، کہکشاں۔" شاعر فطرت: اسماعیل میرٹھی"۔ مشمولہ: ہماری آواز (گوشہ اسماعیل)۔ ج ۲۔ ش ۲-۳ (جنوری تاجون، جولائی تادسمبر ۲۰۰۴ء)۔ ص ۲۰-۲۵۔

محمد، نور۔ شجرکاری کے فوائد شریعت اور سائنس کے آئینے میں۔ گوجرانوالہ: ادارہ انیس الکتاب، ۱۹۹۵ء۔

مظہری، کوثر۔ جدید نظم حالی سے میرا جی تک۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء۔

ایضاً۔ ’’اسماعیل میرٹھی کی نظم آثار سلف‘‘۔ مشمولہ: جرات افکار (تنقیدی مضامین)۔ نئی دہلی: شارپ پرنٹنگ ایجنسی، ۲۰۰۲ء۔

میرٹھی، اسماعیل۔ کلیات اسماعیل۔ مرتب: اسلم سیفی۔ دہلی: دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۹ء۔

میو، عطاالرحمن۔ انیسویں صدی میں پنجاب کی انجمنوں کی اردو خدمات۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۶ء۔

محسن، ایس۔ ایم۔ حیوانی زندگی کی دل چسپ باتیں۔ آندھرا پردیش: انتخاب پریس، ۱۹۶۰ء۔

ملک، ایوب۔ " نوآبادیاتی دور اور ہماری پسماندگی" ۔ مشمولہ: جنگ ۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۴جون ۲۰۱۷ء۔

معین، سید وقار۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے: تحقیق و تدوین۔ لاہور: پبلیشرز، ۱۹۹۵ء۔

" ماں اور بچے کے ابتدائی تعلق کے فوائد اگلی نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں"۔ express.pk.story۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۸اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

میریم ویبسٹر۔ Merriam-webster.com/dictionary/colonialism ۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۰اکتوبر ۲۰۲۰ء۔

ناصر، نصیر احمد۔ تنقید کے نئے تناظر۔ راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء۔

نائس، آرنی(Arne,Naess)اینڈ ڈیوڈ(David)۔ *Ecology,community and lifestyel:outline of an Ecosophy*۔ نیو یارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء۔

نائس، آرنی اور سیشن، جارج۔ The basic principles of deep ecology۔ ۱۹۸۴ء۔ uwosh.edu/ecology.pdf۔

نقوی، محسن اختر۔ ’’مولوی اسماعیل میرٹھی‘‘۔ ayazmedia.blogpost.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۵فروری ۲۰۱۲ء۔

ناز، صبیحہ۔ " ہمہ جہت شاعر: اسماعیل میرٹھی"۔ مشمولہ: ماہنامہ پیش رفت۔ peshraft.blogpost.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۳۰اپریل ۲۰۱۵ء۔

ندوی، محمد عابد۔ " زمین و آسمان کی پیدائش: قدرت کا عظیم شاہکار"۔ urdunews.com۔ تاریخ ملاحظہ: ۱۳دسمبر ۲۰۱۸ء۔

نارنگ، گوپی چند۔ " پیش لفظ"۔ مشمولہ: اسماعیل میرٹھی حیات اور خدمات۔ (مرتب) سیفی پریمی۔ دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء۔

ایضاً۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری۔ لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۵ء۔

نقوی، نورالحسن۔ تاریخ ادب اردو۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷ء۔

نیر، ناصر عباس۔ مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں۔ کراچی: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء۔

ایضاً۔ اردو ادب کی تشکیلِ جدید۔ کراچی: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۶ء۔

ایضاً۔ ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

ایضاً۔ لسانیات اور تنقید۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء۔

ایضاً۔ جدیدیت اور نوآبادیات۔ کراچی: آکسفرڈ یونی پریس، ۲۰۲۱ء۔

ایضاً۔ نظم کیسے پڑھیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی شرز، ۲۰۱۸ء۔

ایضاً۔ " ماحولیاتی تنقید: انتظار حسین کے افسانوں کے تناظر میں"۔ مشمولہ: تحقیق نامہ۔ ش۱۶(جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء) ۔ ص۱۶-۳۶۔

ایضاً۔ "نوآبادیاتی صورت حال"۔ مشمولہ: لسانیات اور تنقید۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء۔

ایضاً۔ " حرفِ اول"، مشمولہ: ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)۔(مترجم) اورنگزیب نیازی۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

ایضاً۔ " انجمن اشاعت علوم مفیدہ پنجاب: مابعد نوآبادیاتی تناظر"۔ مشمولہ: مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں۔ کراچی: اوکسفرڈ پریس، ۲۰۱۳ء۔

نیازی، اورنگزیب۔ ماحولیاتی تنقید : نظریہ و عمل (منتخب مضامین)۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۱۹ء۔

ایضاً۔ "ماحولیاتی تنقید پس منظر، آغاز و امتیازات"۔ مشمولہ: بنیاد، ج۱۰(۲۰۱۹ء)۔ ص۱۱-۲۵۔

ایضاً۔ " ادب کی ماحولیاتی شعریات اور اردو افسانہ"۔ مشمولہ: تاریخ ادب اردو۔ ج۳۔ ش۱ (۲۰۲۱ء)۔ ص۸-۷۱۔

ایضاً۔ " مجید امجد کی نظمیں: ایک ماحولیاتی تنقیدی مطالعہ" ۔ (https:/balagh18.com)۔ تاریخ ملاحظہ: ۲۳جون ۲۰۲۱ء۔

نگرامی، سید خاور۔ اسماعیل میرٹھی ایک مطالعہ۔ لاہور: مکتبہ لائبریری، ۱۹۸۳ء۔

نون، یوسف۔ "عبدالباسط دے افسانیاں دا ماحولیاتی، سماجی، ثقافتی تے تہذیبی تناظر"۔ Incubator.wikimedia.org/wp/skr۔ تاریخ ملاحظہ ۱۶جولائی ۲۰۲۰ء۔

نوشہری، عبدالرؤف۔ " سائنس اور ماحول"۔ مشمولہ: سائنس اور مسائل امروز۔ کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۲ء۔

ہماری آواز۔ ''گوشہ اسماعیل میرٹھی'' ج ۲، ش۳، ۲(۲۰۰۴ء)۔

ہاؤورتھ، ولیم۔ "Some principles of Ecocriticism''، مشمولہ: *The Ecocriticism Reader*۔(مرتبہ) شیرل گلاٹ فیلٹی، ہیرولڈ فروم۔ لندن: جارجیا پریس، ۱۹۹۶ء۔

ہائبر، کرس۔ "ثقافتی ماحولیات، ماحولیات اور انسانوں سے منسلک"۔ http//ur.efferrit.com۔ تاریخ ملاحظہ: مئی ۲۰۲۱ء۔

ہاشمی، طارق۔ " عصری نظم اور ماحولیاتی مسائل"۔ مشمولہ خیابان، ش۳۸(جنوری تا جون، ۲۰۱۸ء)۔ ص۴۱-۵۱۔

ہمدانی، سید ریاض۔ " نوآبادیات اور نوآبادیاتی تمدن"۔ مشمولہ: جرنل آف ریسرچ۔ ج۳۱، ش۱(جون ۲۰۱۷ء) ۔ ص۱۰۵-۱۱۲۔

یعقوب، قاسم۔ "ارض و سما کے دو پہیے اور مجید امجد"۔ مشمولہ: بنیاد۔ ج ۱۲ (۲۰۲۱ء)۔ ص ۲۸۱-۳۰۹۔

ایضاً۔ "ادب اور فطرت ماحولیاتی تناظرات"۔ مشمولہ: معیار، ج ۲۲۔ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء)۔ ص ۲۳۵-۲۴۶۔

یوسف، صوفیہ۔ "حجاب کا ناول پاگل خانہ اور ماحولیاتی تنقید"۔ مشمولہ: الماس۔ ش ۱۹ (۲۰۱۷ء)۔ ص ۸۹-۹۵۔

ایضاً۔ "اردو کے فروغ اور اس کے نفاذ کے لیے ہندوستان کی دیگر انجمنوں اور تحریکوں کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی شراکت"۔
مشمولہ: خیابان۔ ش ۱۷۔http//khayaban.uop.edu.pk۔

Inter
C
LI
ISLA